فہرست مضامین حصۂ اول

مکتوبات حضرت شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی قدس اللہ سرہٗ

مطبوعہ: عباسی لیتھو آرٹ پریس۔ فریئر روڈ کراچی ملا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت سایہ فگن ہو تو ہر کام جس کے کرنے میں امت مرحومہ کی بہتری ورہبری منظور ہو، آسانی سے ہو جاتا ہے حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب کا ترجمہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جن امور کے سمجھنے اور ان پر کاربند ہونے کی اس زمانے میں ضرورت ہے وہ ان میں موجود ہیں۔ اپنے اور ماحول کے حالات وکیفیات کو جس خاص انداز کے ساتھ خطوط میں لکھا جاسکتا ہے مختلف مباحث ومضامین پر مختصر وجامع گفتگو جیسی کہ ہو سکتی ہے وہ کسی ایک موضوع کی تصنیف میں نہیں ہو سکتی ان مکاتیب سے صحیح اسلامی زاویہ نگاہ، ... اسلامی کی ہمہ گیری بخوبی واضح ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی مسلمان کس کو کہتے ہیں۔ ضروری سمجھا کہ ان مکاتیب کو سب تک پہنچا دیا جائے۔

مکتوبات شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ارضِ مقدس ... سے واپسی کے بعد ۵۲ سال تک انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ... ہوئی ذہنیت کو کس طرح سنبھالنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے ہر گروہ تک ... دعوت حق کیسے پہنچائی حقیقی اسلام کیا ہے اور سچا مسلمان کیسے بنتا ہے اس کو ... خوبی سے بتلایا ہے وہ ان ہی کا حق ہے جس مقصد کے تحت مکتوبات

لکھے گئے۔ اس کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس رہے تاکہ سب کی سمجھ میں آجائے اور موجودہ زمانہ میں افراط تفریط پھیل جانے سے مذہب سے جو بدگمانی ہوگئی ہے وہ دور ہوجائے۔

مکتوبات کی ترتیب جو پہلے پہل طبع کرتے وقت رکھی گئی تھی اس کو بدل دیا گیا۔ ہر مکتوب کے آخر میں کتاب المکاتیب و نیز اخبار الاخیار مطبوعہ دہلی کے حاشیہ پر جس سلسلہ سے خطوط ہیں وہ نمبر دے دیا گیا ہے ایک فہرست بھی شریک کی گئی ہے جس میں متبادل مکتوب کا حوالہ درج ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کو حوالہ مل سکے۔ مکتوبات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں چالیس ۴۰ دوسرے حصہ میں تیس ۳۰ خطوط ہیں۔ پہلے حصہ کو سمجھ لینے کے بعد دوسرے حصہ کو بآسانی سمجھ لیا جا سکتا ہے۔ اس تسلسل کے ساتھ دیکھنے سے دیکھنے والے کو تفسیر، حدیث، فقہ، تصوّف کی بنیاد واحد سمجھ میں آجاتی ہے یہ مکتوب عوام و خواص کے لئے مشعل ہدایت، رہبر حقیقت ہیں۔ شریعت و طریقت کے تعلق ان کی ہم مزاجی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ ظاہر و باطن کا تعلق روشن ہوجاتا ہے۔ شریعت پر استقامت کیسے عروج دیتی عروج پہ لے جاتی ہے اور عروج کسے کہتے ہیں یہ ظاہر ہوجاتا ہے۔

شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش سنہ ۹۵۸ھ مطابق سنہ ۱۵۵۱ء میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں نئے نئے طریقے مذاہب ڈھل رہے تھے و مسلم جوگ سنجوگ لئے ہوئے تھے مہدوی تحریک عروج پر تھی، ایران سے گروہِ غالی، نصیریہ، مذاہب دہریہ کی لپیٹ پے درپے آرہی تھی، علمائے اسلام ان سب کی تکفیر اس کو باطل ثابت کرنے میں سرگرمی سے لگے ہوئے تھے۔ بہت سے ظاہری عالم، مال و دولت، منصب و مرتبہ کی جال میں پھنس کر من مانے فتوی

دے رہے تھے، حکام و امرا کی چاپلوسی میں لگے تھے، بعضوں نے فقہ و تصوف کو ایک دوسرے سے جدا سمجھکر مختلف طریق اور گروہ بنالئے تھے بعض اپنے آپ کو اوروں کو محض قرآن کا پابند بنانا چاہتے تھے بعض قرآن کی وضاحت و تشریح جن احادیث سے ہوتی تھی انہی پر اکتفا اور اس کی تعلیم و تلقین کرتے تھے بعضوں نے فقہ کو قرآن، حدیث، عمل صحابہ رضی اللہ عنہم سے تواتر کے ساتھ آئی ہوئی چیز سے علیحدہ محض قیاس آرائی سمجھ لیا تھا اور لوگوں میں یہ خیالات عام کر رہے تھے۔ بعض نے تصوف کے طریقہ عمل کو بدل کر اس کو اپنی پسند ناپسند کے اظہار کا ذریعہ بنالیا تھا۔ ایسے زمانہ میں نشو و نما پانے کے باوجود شیخ محدث رحمتہ اللہ علیہ کا اس کے اثر میں نہ آنا اور صحیح اسلامی تعلیم پر جو علمائے باللہ سے پائی تھی قائم رہنا توفیق الٰہی کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد تقریباً بیس سال کی انتہائی کوشش کے باوجود جب ہندوستان کی حالت بد سے بدتر ہوتے دیکھی تو ہجرت کر کے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں حضرت عبدالوہاب علی متقی شاذلی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں جو مفسر، محدث، فقیہ، صوفی تھے تین سال تک رہے۔ ان کی اجازت و اشارہ پاکر مدینہ طیبہ پہنچے وہاں ایک سال تک رہے اشارت و بشارت نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پاکر ایک ہزار ہجری میں ہندوستان واپس آئے، دہلی میں حدیث اور علوم اسلامی کی تعلیم دینی شروع کی۔ حالت یہ تھی کہ مغل بادشاہ اور ان کے امرا منصب و مرتبہ کے جال میں پھنسے ہوئے علماء مذہب کو ایک کھلونا اور رہیولی بنائے ہوئے تھے مسلمانوں کا ذہنی انحطاط، اخلاقی پستی کج بحثی، غلط فہمی، خام خیالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی مسلمانوں کو ایسی پست حالت سے نکالنا اور ان کو راستہ پر لانے کے لئے ایسے شخص کی ضرورت

تھی جسے علم قرآن پر پورا عبور ہو، علم حدیث میں محققانہ نظر رکھتا ہو، علم فقہ میں
کمال حاصل ہو ساتھ ہی تصوف، سلوک، حقائق عرفان کی رسائی ہو۔ سلوک
کے مدارج سے بہرہ ور ہو تاکہ نہایت احتیاط کے ساتھ جیسا کہ دین حق کو بتلانا
ہے بتلا سکے۔ تفسیر حدیث فقہ تصوف کے باہمی تعلق اور رشتہ کو روشن کر سکے
اخلاق و حکمت اسلامیہ سے نہ ہٹے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول فعل حال
پر ہر لحظہ نظر جمائے ہوئے ہو جس کا قلم شریعت اس کے اصول و فروع ہی پر
چلتا رہے ظاہر ہے کہ اس کا اہل وہی ہو سکتا ہے جو مفسر بھی ہو محدث بھی
فقیہ بھی ہو صوفی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ
کو عطا فرمائی۔ اس کو آپ نے بخوبی ادا کیا تفسیر حدیث فقہ تصوف میں کثیر تعداد
میں لوگوں کو تعلیم دی جو اقصائے ہند میں پھیل گئے، تفسیر حدیث فقہ تصوف
کی کتابوں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ احادیث کی کتابوں پر حواشی اور ان
کے شرح نما ترجمے لکھے۔ شاگردوں کے ذریعہ صحیح علم ہندوستان میں پہنچایا۔
شیخ محدث کی سعی کے اثرات شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دور میں
نمایاں ہوئے کسی سے ٹکرائے بغیر انتہائی خوبی کے ساتھ جس مقصد کے لیے
ان کو ہندوستان واپس بھیجا گیا تھا وہ پورا کر کے ۲۱ ربیع الاول سنہ ۱۰۵۲ ہجری
مطابق سنہ ۱۶۴۲ء میں ۹۲ سال کی عمر پا کر جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ
وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ بحمداللہ تعالیٰ بسلسلہ تعلیم و تدریس جو شیخ محدث دہلوی
رحمۃ اللہ علیہ نے رائج کیا تھا وہ اب تک جاری ہے والسلام

قاضی احمد عبدالصمد

دیباچۂ مکتوب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰھُمَّ لا احصی ثنا علیک وصلوٰۃ علی نبیّک الداعی الیک کما اثنیت علی نفسک وھو کما صلیت علیہ فی کتٰبک الذی لا یاتیہ الباطل من خلفہ ولا من بین یدیہ۔

("اے ہمارے اللہ تیری تعریف جیسی کہ کرنی چاہیئے ہم کر نہیں سکتے۔ تیری تعریف کرنی ہمارے بس کی بات نہیں صلوٰۃ وسلام تیرے نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ وہ سب کو تیری طرف بلانے والے ہیں اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف جو تو نے اپنی کتاب میں کی ہے وہ نہایت مناسب و درست ہے۔ اس میں کسی طرح کا ذرا بھی شبہ باطل کا نہیں۔")

سچ تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی تعریف حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی توصیف جس کو حمد و ثنا کہتے ہیں۔ خدا کے سوائے کوئی اور نہیں کر سکتا چھپے ہوئے خزانے۔ راز کے جواہرات جب تک حق تعالیٰ کی قدرت کارفرما نہ ہو۔ کوئی ان کو نہ تو

کھول سکتا ہے نہ بکھیر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے سوائے جیسا کہ وہ ہے کوئی اور پہچان نہیں سکتا۔ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدائے تعالیٰ کے سوائے جو کچھ اور جیسے کچھ آپ ہیں کوئی پہچان نہیں سکتا صاف بات یہ ہے کہ خدا۔ خدا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے بندے ہیں باقی جو بھی ہیں وہ سب آپ کے طفیلی ہیں۔ ا اے ہمارے اللہ، تیری ذات کی تعریف جو تو نے بتلائی ہے۔ وہی ہم کہا اور کیا کرتے ہیں تیرے نبی رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تیرا بتلایا ہوا درود وسلام بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بہترین صلوٰۃ (درود وسلام) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل اور آپ کے اصحاب اور سب ایمان و اسلام والوں پر ہردم ہوتی رہے۔

امابعد (خدائے تعالیٰ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا کرنے کے بعد) فقیر حقیر عبدالحق بن سیف الدین دہلوی کہتا ہے کہ بہت سی تحریریں جو وقت وحال کے لحاظ سے لکھی گئی تھیں۔ ان میں چند ایسی ہیں کہ وہ ان دوستوں کے لئے تھیں جو سلوک اور ارادت میں آگئے ہیں، چند ایسی ہیں کہ وہ ان امیروں کے لئے لکھی گئیں ہیں جو اہل سعادت ہیں اور ان میں بعض وہ ہیں جو میں نے اپنی نصیحت کے لئے اپنے لئے لکھی ہیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ نزدیک اور سب سے زیادہ ضرورت مند اپنی ہی ذات ہے جس سے ایسے امور ٹھوک بجا کر کہدئے جا سکتے یا جتلا دئے جا سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ امور جو دین وملت اور شریعت کے جاری کرنے اور اس کے پھیلانے۔ عقائد کی حفاظت کرنے۔ سنت کے احکام کی بجا آوری سے متعلق ہوں اس کے بیان کرنے سمجھانے کے لئے یہ بندہ مامور کیا گیا ہے۔ ماموریت کی شرط یہ رکھی گئی ہے کہ ہمیشہ اعتدال اور احتیاط ملحوظ رکھوں۔ وجودیہ کے اشاروں اور باطنیہ کے تاویلات کو اپنے بیان میں آنے۔ داخل ہونے نہ دوں۔ اس فقیر کو

مشائخین کی وصیت یہ ہے کہ باریکیوں (گہرائیوں) میں بات چیت نہ کیا کروں۔ خدا اور رسول کا کام، اس میں دل لگانے کا طریقہ، ان سے معاملہ کرنے کا علم سکھلاؤں تاکہ وہ ہوشیار ہو کر اس میں لگ جائیں۔ اپنے ہر قسم کے عیوب اور کوتاہیوں کو سمجھ جائیں۔ بزرگوں نے مجھکو یہ حکم بھی کیا ہے کہ علم باطن کو علم ظاہر پر سبقت (ترجیح) نہ دوں اور یہ نہ سمجھوں کہ ظاہر ہی کافی ہے۔ باطن کی ضرورت نہیں۔ دونوں لازم و ملزوم دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے یہ سمجھایا بتلایا گیا ہے کہ ظاہر کی آراستگی ہو جانے سے باطن کی آراستگی نہایت عمدگی کے ساتھ خود بخود ہو جاتی ہے۔ ظاہر کا ٹھیک ٹھاک کرنا مقدم و ضروری کام ہے۔ مجھ سے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ میں یہی سمجھوں اسی کو سمجھاؤں یہ ضعیف اسی لئے ہمیشہ اپنی تالیف و تصنیف میں عموماً نقل و ترجمہ کے ساتھ ساتھ صوفیہ کی عبارتیں۔ آئمہ دین کی باتیں جو دونوں طریقوں (ظاہر، باطن) کی جامع۔ دونوں فریق اہل ظاہر و باطن کی متفقہ (مانی ہوئی) ہوتی ہیں اسی کو صراحت و نزاکت و مناسب تشریح کے ساتھ بیان کیا کرتا اور سمجھاتا ہے۔ بزرگوں کے فرمائے ہوئے سے نکل آنا ان کے سمجھائے اور بتلائے ہوئے طریقہ و مقام کا اختیار نہ کرنا، میرے نزدیک بُری بات ہی نہیں بلکہ فضول سی حرکت ہے اس لئے میں نے ان ہی کا فرمایا ہوا طریقہ اختیار کر لیا ہے تجربہ کے بعد میں نے اس کو حقیقتاً سلامتی اور مضبوطی کا راستہ پایا۔ کیونکہ کسی بات کے سمجھنے سمجھانے اعتبار دینے اعتبار میں لانے میں قلم کو سرپٹ بے روک چلنے، اور زبان کو رکیک بات کہنے کا کبھی موقع نہ دینا ہی مناسب ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کام کی باتوں کے بیان کرنے میں چند باتیں ایسی بھی کہی جا سکتی ہیں جس سے مطلب کی وضاحت ہو جانے سے شک و شبہ دور ہو جائے۔ اصلی بات کا کہنا لکھنا ایسا ہی ہوا کرتا ہے اس سے کلام میں زور آجاتا اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے

امید ہے کہ یہ میرے خطوط ارباب دین کی نظر میں قبول ان کی اصلاح کے لئے مفید ہوں گے اور ان کی عنایت میرے حال کی شامل و ملحوظ ہو جائے گی۔ صراط مستقیم (سیدھی راہ) کے چلنے والے طالبانِ حق کے لئے یہ مفید و نفع بخش ہو کر۔ چہرہ مقصود سے نقاب اٹھا دیں گے۔ وھوالقریب المجیب (وہی نزدیک ہے اور قبول کرنے والا ہے) سچ ہے کہ ہم کو اس کی طرف لوٹ جانا اور پہنچنا ہے والسلام

فقیر محمد عبد الحق

مکتوب (۱)

آدمیوں کی قسمیں

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

دنیا میں جتنے آدمی ہیں وہ اِنہی چار اقسام میں سے کسی نہ کسی قسم کے ہوتے ہیں اس کے سوا اور کسی قسم کی نہیں ہوتے۔ سب اسی میں آجاتے ہیں: دنیا و آخرت کے بادشاہ، دنیا و آخرت کے نقرا۔ دنیا کے بادشاہ آخرت کے فقرا۔ دنیا کے فقرا اور آخرت کے بادشاہ

(۱) دنیا و آخرت کے بادشاہ وہ ہیں کہ جنھوں نے دنیا میں خوشی و کامرانی کی لذت پائی۔ سلطنت و حکمرانی کی حکومت و سلطنت جیسی کہ عمدگی کے ساتھ کرنی تھی۔ کی۔ آخرت کی زندگی کے لئے بھی نیک اعمال کا ذخیرہ اچھے کاموں کا خزانہ، سعادت کا سرمایہ اپنے ہمراہ لے گئے۔ اپنے عمل کے بدلے جنت کی نعمت دیدار کی دولت سے مشرف و فائز ہو گئے۔

(۲) دنیا کے فقرا آخرت کے بادشاہ وہ ہیں جو اس دنیا کے فانی فوائد و خواہشات سے محظوظ نہ ہوئے۔ وفا کی داد دیتے۔ وفاداری کی ترازو میں تُلتے۔ اسی کے ہو رہے۔ اسی سے حظ و لذت لینے سے ہمیشہ رہنے والے ملک کی برکتوں اور سعادتوں سے مخصوص و مشرف ہو گئے اور دیگر دو قسم کے لوگوں کو مذکورۂ بالا پر قیاس کر کے جان لے سکتے ہیں۔ ہمیں یہ علم نہیں کہ ہم کس قسم میں داخل ہوا گے۔ یہ قسم جس کا ذکر ہوا بہت درجات و مراتب رکھتی ہے۔ جس کسی مرتبہ میں بھی

ان مرتبوں کے ہم داخل ہو جائیں تو غنیمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ گفتگو ایک تقریب سے زبان پر آئی۔ کلام کی روانی، انکی شکر گذاری میں ان کے انعام واحسان کی بنا پر تھی۔ جو فقرا و غربا کی نسبت ان سے ظہور میں آئی۔ اللہ تعالیٰ انھیں بہترین جزا دے۔ چونکہ ظاہر و باطن کی تمام نعمتیں حضرت عزت تعالیٰ شانہ کی طرف راجع (لوٹنے والے، رجوع ہونے والے، واپس ہونے والے) ہوتی ہیں بسلسلہ کی انتہا کی وجہ سے عاجزی وسکوت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بندہ سے اس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ حضرت مسبب الاسباب (اسباب کا مہیا کرنے والا) جل شانہٗ نے اپنی حکمت بالغہ سے، ناتوانوں نارساؤں کی جماعت کو کاروبار سے روک کر تدبیر و طلب کی فکر سے اپاہج کر کے اپنے فضل وکرم کے دروازے پر بٹھلا دیا ہے۔ اس نے ان کی امیدوار آنکھوں کو شاہدِ مقصود کے جمال پر گاڑ دیا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کو خلعت کرامت و سرفرازی، اپنی توفیق سے مخصوص کر کے اوقات کے بنانے اور احوال کے پلنے میں، لگا دیا ہے تاکہ یہ ان کے دل کی یکسانی اور ہر طرح کی فارغبالی کا سبب ہو جائے۔ نیک کام اور نیک عمل سے ثواب پانے میں شریکِ غالب ہو جائیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ جسے چاہتا دیتا ہے اللہ تعالیٰ انتہائی فضل کرنے والا۔ بہت ہی بزرگ و برتر ہے۔ اسی ترتیب سے عالم کا نظام چل رہا ہے۔ دنیا کا ہر گروہ فضل وکرم الٰہی کا محتاج ہونے سے ایک دوسرے کی مدد و اعانت کیا کرتا ہے۔ یہی بات ہے جو کہتے ہیں فقیر کا احتیاج، غنی کے جُود وسخا کا آئینہ ہے۔ دنیا کے محتاج مانگنے والوں کے لئے معشوقوں کی طرح جو صاف وشفاف آئینہ کی طلب وخواہش میں ہوتے یہ بھی بے چین رہتا ہے یہ وہ مقام ومرتبہ ہے کہ اس میں کبھی غنی کو فقیر پر کبھی فقیر کو غنی پر فضیلت دیتے

ہیں یہ سب اعتبارات ہیں۔ بزرگی وفضل خدا تعالیٰ ہی کے لئے ہے غنی اور فقیر سب اس کے دسترخوان سے ٹکڑا پاتے ہیں۔ اسی کے احسان کے مرہون اسی کی نعمت کے ممنون ہیں۔ سب اس کی شان اسی کی بادشاہیت ہے لیکن وہ سب سے اعظم واکرم ہے۔ عاقبت بخیر ہو۔ (مکتوب سوطواں)

مکتوب (۲)

شریعت۔ہدایت

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

اللہ کا کہا ہوا سچ ہے وہی راستہ بتلانے والا اور سیدھی راہ پر چلانے والا ہے یاد رکھو مقصد تک پہنچنے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ راستہ جاننا، راستہ چلنا، راستہ چلنے کا جو طریقہ سمجھایا گیا اسی طریقہ اور اسی طرح سے چلنا، اس کے طے کرنے کا جو قاعدہ مقرر کیا گیا ہے اسی قاعدہ کے تحت اس کو طے کرنا فرض ہے کیونکہ جس نے راستہ دکھلایا، اسی نے راستہ چلنے کا طریقہ بھی سمجھایا بتلایا۔ اس کے طے کرنے کی تعلیم بھی دے دی ہے۔ منزل تک پہنچنے تک راستہ سیدھا جانا بوجھا ہونا چاہیئے تاکہ یقین کے ساتھ نہایت آسانی سے جلد پہنچ جائیں۔ ظاہر ہے کہ جو راستہ بے ڈھب بے تکا تباہی کی طرف لیا جاتا ہو اس میں آفتیں بہت ہوتی ہیں۔ دوزخ میں پہنچا دیتا ہے۔ سچا سیدھا راستہ قرآن مجید کی آیت اور حکم الٰہی کے لحاظ سے عبادت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ سب سے کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے اسی کی عبادت کیا کرو کہ یہی سیدھا سچا راستہ ہے جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں۔

عبادتیں بہت ساری قسم قسم کی ہیں ۔ ہر عبادت حق تعالیٰ تک پہنچنے اس کی نزدیکی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ راستہ ہے۔ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق (اللہ کی طرف جانے کے راستے لوگوں کی تعداد (سانسوں کے شمار کے برابر ہیں) جو کہا گیا ہے وہی بات ہے۔ اگر کسی کے دل میں اللہ کے بتلائے ہوئے راستہ کے سوائے اور کچھ خیال ہو تو اس نے خطا ہی نہیں کی بلکہ گمراہی کی تباہی الحاد کے بھنور میں گر گیا خدا تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ دکھلانے والے راستہ چلنے کا طریقہ بتلانے والے ہمارے پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ لاکھوں درود آپ پر آپ کی جان پاک پر آپ کے اہل بیت اطہار پر آپ کے اصحاب پر کہ یہ سب آپ کی پیروی کرنے والے آپ کے سمجھائے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے والے ہیں جس نے آپ کی پیروی کی آپ کے فرمائے ہوئے پر چلا وہ منزل مقصود کو پہنچ گیا۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ گمراہی خوف وخطرہ کی جگہ ہے ؎

کسانیکہ زیں راہ برگشتہ اند   برفتند و بسیار سرگشتہ اند

(جو لوگ اس راستہ سے پلٹ گئے بہت چلے اور پریشان وحیران ہو گئے)

ہم جس زمانے میں ہیں اس میں خدا کا راستہ چلنے والوں کے لئے راستہ کا نہ جاننا آفت، طریقہ کا نہ پہچاننا مصیبت وگمراہی ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ نہ تو اصلی طریقہ پر چلتے ہیں نہ درست اتباع میں ٹھیک پیروی پر کاربند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں نہ تو سلوکِ حقیقت ہے نہ پیروی سُنتِ مشائخین کے آداب و شرائط۔ بلکہ نئے نکالے ہوئے طریقے ایجادِ بندہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ اکثر و بیشتر تو نادانی اور علم نہ ہونے سے طبیعت کے میلان سے شک وشبہ میں پڑنے سے بھٹک گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ گزرے ہوئے سالکوں میں سے بعض حال کے غلبہ سکر کے چھا جانے اور بعض علاج کے ارادے سے جو خاص مرض خاص وقت

اور ان کے حال کے لئے تھا کچھ کر گزرے یہ نادان اسی کے تابع اور معتقد ہو گئے یہ سمجھے کہ قرب کے طریقے، ملانے والے، نتیجہ لانے والے یہی امور ہیں۔ اسی کے کرنے سے مقرب بارگاہِ الٰہی ہو جاتے ہیں۔ طاعات، عبادات، شریعت کے احکام، ظاہری اشغال عادات اہل ظاہر کے لئے ہیں درویشوں کی مشغولیتیں اور ہی ہیں۔ بعضوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ نماز، روزہ، بیوہ عورتوں کا کام ہے۔ مردوں کے کام اور ہی ہیں۔ ان نادانوں کی خطا وغفلت کا یہ حال ہے کہ وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ اشغال یہ کام کس کے بتلائے ہوئے، کئے ہوئے اور کس کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ ان کے فائدے نتیجے کیا ہیں۔ حضرات انبیا علیہ السلام کو وقت بوقت موقع بموقع نبی بناکر بھیجا گیا۔ خصوصاً سارے رسولوں کے سردار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ آپ کو سب کے بعد آخری نبی بناکر جو رسالت کے لئے بھیجا وہ اچھے اخلاق کے اتمام (پورے ہونے) اور اچھے اعمال وافعال کی تکمیل (انتہا کو پہنچنے) کے لئے تھا۔ بندوں کے اخلاق اعمال وعبادات کی تکمیل، سیدھی راہ کی تعلیم، سیدھے راستہ پر چلانے کے لئے آپ کی تشریف آوری ہوئی۔ آپ نے ہدایت دی راستہ بتلایا۔ راہ نمائی کی۔ کرنے نہ کرنے کا حکم فرمایا۔ خدا تک پہنچنے کے طریقے بتلائے۔ اگر یہ طریقے قاعدے نزدیکی میں پہنچانے والے اور اس کے ملانے والے نہ ہوں تو پھر کونسے قاعدے وطریقے ہو سکتے ہیں۔ یہی سچے پہنچانے والے ملانے والے قاعدے طریقے ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہیں وہ غلط اور بے سود ہیں مگر کون ایسا ہے کہ ان افعال واعمال کو جیسی کہ ان کی شرط ہے اسی طرح ادا کرے۔

صفت شہود (حاضر ہونا، حاضر لانا) مراقبۂ احسان کے یہ معنی ہیں کہ اَلْاِحسان
ان تعبد ربّك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك ۔

(احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کر کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ تجھ سے یہ نہ ہو سکے تو سمجھ جا کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے) اس مراقبہ کو شہود (حضوری) کے ساتھ بجا لا۔ اس راستہ کو جیسا کہ بتایا گیا اسی طرح طے کیا کر اصلی بات یہ ہے کہ بے عملی سست اعتقادی کی وجہ سے شریعت کے احکام کو اس کے آداب و شرائط کو جیسا کہ ادا کرنا لازمی تھا۔ ادا نہ کرنے اور بے کاروں کو نتائج ہاتھ نہ آنے سے وہ تردد و انکار میں پڑ گئے۔ محرومی کی بھنور میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے گھاٹے میں آ گئے۔ یہ کوتاہ نظر اپنی تقصیر و خطا کی وجہ سے اسرار کے انوار نہ پانے غفلت کا نشہ چڑھ جانے سے محروم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ کم از کم ایمان کی حفاظت و نگہبانی ہی کر لیتے اس کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تو بڑا کام ہوتا کیا انھیں اس کی بھی خبر نہیں کہ یہ احکام کس کے لائے ہوئے ہیں دوسری آنیوالی زندگی میں اس کی جزا و سزا کیا ہے اور اس بدعملی اس گمراہی کا نتیجہ کیا ہوگا۔

"فلا تعلم نفس ما اخفیٰ لھم من قرۃ عین" کوئی یہ نہیں جانتا کہ کیا چھپا دیا گیا اور کیا رکھ دیا گیا ہے شب بیداروں میں، کہ وہ اپنے پہلو کو آرام و بستر سے دور رکھنے والے ہیں پروردگار تعالیٰ کی نعمتیں جو اس نے انھیں دے رکھی اور عطا کی ہیں وہی ان کے لئے راحت و آرام، روحانی جسمانی لذت، آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گئی ہیں۔ آخرت کی نعمتیں، جنت کی لذتیں مولیٰ تعالیٰ کے دیدار کا لطف اس سب کچھ کو مولیٰ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے عمل کے اثرات، کاموں کا ثمرہ بتایا چنانچہ فرماتا ہے کہ جزآءً بما کانوا یعملون (جو تم کیا کرتے تھے یہ اس کا بدلہ ہے)

اے میرے عزیز اصلی چیز ایمان اور عمل ہے جو اسی جہان میں دل کی فضا کو اُس جہاں کے انوار سے روشن کر دیتا ہے۔ عبادت کرنے والے کو بہشت

کی لذتوں کے نمونے اللہ تعالیٰ کا شہود اسی جہان میں دل کی آنکھوں سے ذوق وشوق میں رکھکر دکھاتا ہے۔ کفر اور ظلمت کے تاریکی اور گاڑھے پردوں کو اُٹھا دیتاہے یہی نور اُس عالم میں اس سے زیادہ کشادہ۔ انتہائی لطیف ہوکر اُس ملک کو جس کی کوئی انتہا نہیں ہے گھیر لیتا ہے، کھلے طور سے جنت کو ہاتھ میں لے لیتاہے۔ وہاں ہر قسم کا پردہ درمیان سے اُٹھ جاتا ہے۔ کوئی پردہ ہی نہیں رہتا۔

دوسری غلطی ان خطاکاروں بے عملوں سے جو ہوئی وہ یہ کہ انھوں نے ابتدا ہی میں ایمانِ کامل کی شرط لگادی اور اسی پر عمل کو منحصر و موقوف کردیا یہ لوگ ابتدائے کار ہی میں یقین کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک یقین نہ آجائے کام کی حقیقت کھل نہ جائے، معلوم نہ ہو جائے کہ وہ کیا ہے، ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے اس طرح سے، اپنا راستہ آپ مارنے سے، جہالت اور نادانی کا شیطان انھیں بیکار بناکر بٹھا دیتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ضلالت گمراہی کے گڑھے میں اُترتے جاتے ہیں۔ جب یہ صورت پیش آجاتی ہے تو نہ عمل رہتاہے نہ ایمان۔ خسر الدّنیا والاٰخرۃ ذالك هو الخسران المبین (گھاٹا دنیا اور آخرت کا یہ ہے کھلا صاف گھاٹا)

یہ لوگ ان دُو غلطیوں میں ہونے سے یہ بھول گئے کہ ایمان کی نورانیت عمل سے بڑھتی اور قوی ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ملنے سے ایمان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ دو نور آپس میں ایک دوسرے پر سایہ و روشنی ڈال دینے سے لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں حقیقت میں وہ ایک ہی نور ہے جو دل کی تصدیق ہے یہ نور جب تصدیق بن کر زبان پر آجاتاہے تو نور اقرار ہوجاتا ہے جب اعضا، جوارح، ہاتھ پاؤں میں دوڑتا سرایت کرتا ہے تو وہی نور اعمال کی صورت میں

(احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کر کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ تجھ سے یہ نہ ہو سکے تو سمجھ جا کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے) اس مراقبہ کو شہود (حضوری) کے ساتھ بجا لا۔ اس راستہ کو جیسا کہ بتایا گیا اسی طرح طے کیا کر اصلی بات یہ ہے کہ بے عملی سست اعتقادی کی وجہ سے شریعت کے احکام کو اس کے آداب و شرائط کو جیسا کہ ادا کرنا لازمی تھا، ادا نہ کرنے اور بے کاروں کو نتائج ہاتھ نہ آنے سے وہ تردد و انکار میں پڑ گئے۔ بحر دمی کی بھنور میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے گھاٹے میں آ گئے۔ یہ کوتاہ نظر اپنی تقصیر و خطا کی وجہ سے اسرار کے انوار نہ پانے غفلت کا نشہ چڑھ جانے سے محروم بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ لوگ کم از کم ایمان کی حفاظت و نگہبانی ہی کر لیتے اس کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تو بڑا کام ہوتا کیا انھیں اس کی بھی خبر نہیں کہ یہ احکام کس کے لئے ہوئے ہیں دوسری آنیوالی زندگی میں اس کی جزا و سزا کیا ہے اور اس بدعملی اس گمراہی کا نتیجہ کیا ہوگا۔

"فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ عین" کوئی یہ نہیں جانتا کہ کیا چھپا دیا گیا اور کیا رکھ دیا گیا ہے شب بیداروں میں، کہ وہ اپنے پہلو کو آرام وہ بستر سے دور رکھنے والے ہیں پروردگار تعالیٰ کی نعمتیں جو اس نے انھیں دے رکھی اور عطا کی ہیں وہی ان کے لئے راحت و آرام، روحانی جسمانی لذت، آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گئی ہیں۔ آخرت کی نعمتیں، جنت کی لذتیں مولیٰ تعالیٰ کے دیدار کا لطف اس سب کچھ کو مولیٰ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے عمل کے اثرات، کاموں کا ثمرہ بتایا چنانچہ فرماتا ہے کہ جزآء بما کانوا یعملون (جو تم کیا کرتے تھے یہ اس کا بدلہ ہے)

اے میرے عزیز اصلی چیز ایمان اور عمل ہے جو اسی جہان میں دل کی فضا کو اُس جہاں کے انوار سے روشن کر دیتا ہے۔ عبادت کرنے والے کو بہشت

کی لذتوں کے نمونے اللہ تعالیٰ کا شہود اسی جہان میں دل کی آنکھوں سے ذوق وشوق میں رکھکر دکھاتا ہے۔ کفر اور ظلمت کے تاریکی اور گاڑھے پردوں کو اُٹھا دیتاہے یہی نور اُس عالم میں اس سے زیادہ کشادہ۔ انتہائی لطیف ہوکر اُس ملک کو جس کی کوئی انتہا نہیں ہے گھیر لیتا ہے، کھلے طور سے جنت کو ہاتھ میں لے لیتاہے۔ وہاں ہر قسم کا پردہ درمیان سے اُٹھ جاتا ہے۔ کوئی پردہ ہی نہیں رہتا۔

دوسری غلطی ان خطاکاروں بے عملوں سے جو ہوئی وہ یہ کہ انھوں نے ابتداہی میں ایمانِ کامل کی شرط لگادی اور اسی پر عمل کو منحصر وموقوف کردیا یہ لوگ ابتدائے کارہی میں یقین کو ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک یقین نہ آجائے کام کی حقیقت کھل نہ جائے، معلوم نہ ہوجائے کہ وہ کیا ہے، ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے اس طرح سے اپنا راستہ آپ مارنے سے، جہالت اور نادانی کا شیطان انھیں بیکار بناکر بٹھا دیتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ضلالت گمراہی کے گڑھے میں اترتے جاتے ہیں۔ جب یہ صورت پیش آجاتی ہے تو نہ عمل رہتاہے نہ ایمان۔ خسر الدّنیا و الاٰخرۃ ذالک ھو الخسران مّبین (گھاٹا دنیا اور آخرت کا یہ ہے کھلا صاف گھاٹا)

یہ لوگ ان دو غلطیوں میں ہونے سے یہ بھول گئے کہ ایمان کی نورانیت عمل سے بڑھتی اور قوی ہوتی ہے اور عمل کی توفیق ملنے سے ایمان زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ دو نور آپس میں ایک دوسرے پرسایہ و روشنی ڈال دینے سے لازم و ملزوم ہوجاتے ہیں حقیقت میں وہ ایک ہی نور ہے جو دل کی تصدیق ہے یہ نور جب تصدیق بن کر زبان پر آجاتا ہے تو نور اقرار ہوجاتا ہے جب اعضا جوارح، ہاتھ پاؤں میں دوڑتا سرایت کرتا ہے تو وہی نور اعمال کی صورت میں

ظاہر ہوکر اعمال کی صورت لے لیتا ہے۔ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (نور میں نور۔ اللہ تعالیٰ راستہ بتلاتا ہے۔ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے۔)

پہلے پہل ایمان اجمالی تقلیدی سے عمل کا شروع کرنا توفیق کے فرش پر پاؤں جمانا ضروری ہے۔ تاکہ سارا وجود نورانی ہو جاکر تقلید کا اندھیرا تحقیق کے نور سے مبدل ہو جائے اور ایمان کی صورتیں جو اجمال کے پردہ میں تھیں وہ تفصیل کے ساتھ سامنے آجائیں۔

مجذوب ومحبوب وہ ہوتے ہیں جنھیں ابتدا ہی سے نور و شہود سے منور، اور دولت قرب وحضور سے مخصوص کرکے دنیا میں بھیج دیتے ہیں۔ جس کو نور وجدانی بسیط کہتے ہیں وہ جذب اجمالی ہوتا ہے۔ نازل ہونے کے بعد مقام سلوک میں احوال کی تفصیل کے کمال کے جو مقامات ہوتے ہیں ان کو دریافت کر لیتا ہے تو اس کو قرب کی مسند اور وصول کے مستقر پر تمکن کرکے بٹھلا دیتے ہیں۔ بات اختیار سے باہر ہوگئی۔ ہمارے کہنے کا مقصود یہ تھا کہ ہدایت وتعلیم دینے والے شارع علیہ السلام ہی ہیں آپ نے حق تک رسائی کے لئے چند باتیں علم دین کی تلقین فرمائیں جن کو اچھی طرح سے جاننا، سمجھنا ان پر عمل کرنا لازمی ہے ایک علم کا ایک کام کا جو جزء اصلی ہے وہی بیان میں آئے وہی بات کہی جائے۔ یا ایسی چیز کہی جائے کہ وہ راہ دین کی شرح اس کا بیان ہو یا دین کو جس سے تقویت وترویج ہو اور اس کا اجمال زیادہ ہو جائے۔ ایسی ہر چیز ایسا ہر کام مبارک ہے اس کے سوائے جو کچھ ہے وہ بیکار ہے۔ بے وجہ کی محنت ہے۔ جس میں کوئی نتیجہ نہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث یاد آگئی جو نیک اعمال کے بارے میں ہے۔ اس کا یہاں لکھنا مناسب معلوم ہوا تاکہ جان لیں آگاہ ہو جائیں۔

کہ نور و تجلی کا انکشاف کیسا بڑا واقعہ اور مقامِ قرب کا کتنا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ تمام احکام و ضابطے جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت کئے گئے ہیں اکثر بیشتر اسی قسم کے ہیں لوگ اس کو آسان سمجھے۔ اور مہمل جانتے ہوئے ہیں۔ نعوذ باللہ من الجہل والغوایۃ۔ مذکورہ حدیث وہ ہے کہ جس کی روایت احمد ترمذی۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں ایک روز ایسا ہوا کہ آپ صبح کی نماز میں دیر کر کے تشریف لائے۔ ایسے وقت آپ کی تشریف آوری ہوئی کہ آفتاب کے نکلنے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی۔ آپ جلدی جلدی گھر سے برآمد ہوئے۔ تکبیر کہی گئی۔ ہلکی دو رکعتیں۔ ادا فرمائی گئیں نماز کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سے بلند آواز سے فرمایا کہ "ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے کوئی نہ اُٹھے اس سے آگاہ ہو جائے کہ آج میں کیوں دیر سے آیا اور وقت پر آنے سے مجھکو کس چیز نے روک رکھا۔ اس کو تم سے کہتا ہوں سنو۔ میں رات میں اٹھا۔ وضو کیا۔ خدائے تعالیٰ نے جو چاہا وہ نمازیں ادا کی۔ یکایک میں نے اپنے پروردگار کو ایک اچھی صورت میں دیکھا یعنی اگر یہ صفت حق کا بیان ہے تو اس سے مراد صفت و شان کی صورت ہے جو تجلی لطف و کرم میں ہوا کرتی ہے۔ صورت صفت کے معنوں میں اکثر بولتے ہیں جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ صورتِ مسئلہ یہ ہے۔ صورت حال ایسی ہے۔ اگر اپنا حال بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں اس وقت اچھی صورت اور بزرگ حال میں تھا۔ آپؐ کا یہ وقت شہود خاص تجلی تام کے فیض کے پہنچانے کا تھا، اس لئے آپ نے اس طرح کہا۔ اس میں کوئی مشکل نہیں۔ اس سے کسی شکل و صورت کا اثبات نہیں ہوتا پھر ایک آواز آئی "اے محمد" میں نے عرض کیا "اے میرے پروردگار میں حاضر ہوں"۔ پروردگار نے فرمایا۔ "جانتے ہو کہ وہ کون سے اعمال ہیں کہ

ملاءِ اعلیٰ (فرشتوں کا گروہ ' ملکوت کے باغ کے رہنے والے) آپس میں ان
اعمال کے بارے میں لڑ رہے ہیں ۔ آپ کی بزرگی و فضیلت میں بحث کر رہے
ہیں ان کی آپس میں تکرار ہو رہی ہے اس کے کرنے ' اس کی قبولیت کے پانے
اور دیوان اعمال میں اس کو لکھنے کے بارے میں سبقت کر رہے ہیں ۔ اور
آدمیوں سے یہ ادا ہونے پر رشک کر رہے ہیں ۔ میں نے عرض کیا اے میرے
پروردگار میں کچھ نہیں جانتا ۔ تو سب جاننے والوں سے بڑا جاننے والا ہے ۔
تین دفعہ یہ آواز آئی میں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا ۔ پھر میں نے اپنے پروردگار
تقدس و تعالیٰ کو دیکھا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ یعنی قدرت و انعام کے
میرے شانہ پر رکھدئے ۔ میں نے ایک ٹھنڈک اس کے انگلیوں کی اپنے سینہ
میں پائی ۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کو میں نے معلوم کر لیا ۔ وہ مجھ پر
کھل گیا ۔ میں نے ان اعمال کو جان پہچان لیا جو میرے پروردگار نے مجھ سے
پوچھا تھا اس کو سمجھ گیا ۔ اس کے بعد پھر آواز آئی ۔ میں نے عرض کیا ۔ اے میرے
پروردگار میں حاضر ہوں ۔ تو فرمایا کہ کس بارے میں فرشتے بحث کر رہے ہیں ۔
میں نے اس دفعہ عرض کیا کہ کفارہ (چھپانے والا گناہوں کا ' یعنی خطا یا گناہ
کا شرعی طور پر عوض کے بارے میں یعنی جس کے باعث وہ کام یا وہ گناہ جو صادر
ہوئے وہ بخش دئے جائیں ان کی پوچھ گوچھ نہ ہو عذاب نہ دئے جائیں ان سے
درگزر کر دیا جائے) پروردگار نے فرمایا ۔ وہ کفارہ کیا ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ
نماز کے لئے چل کر جانا جماعت سے نماز ادا کرنا ۔ مسجد میں جماعت کے انتظار
میں یا نوافل یا تلاوت کے لئے بیٹھنا ۔ آنے والی نماز کے وقت کے منتظر رہنا
پورا مکمل وضو کرنا ۔ ایسے وقت و حالت میں پانی کا استعمال کرنا جب کہ طبیعت
پر ناگوار ہو جیسے کہ بیماری ' ضعیفی ' جاڑے کی شدت ' اور بھی ایسے ہی اور

حالات ہیں۔ پھر آواز آئی کہ کس چیز میں فرشتہ لڑ رہے ہیں میں نے عرض کیا "مدارج کے لئے" یعنی وہ عمل جس سے بندوں کے مرتبہ درجے درگاہ عزت میں بلند ہوتے ہیں۔ آواز آئی کہ وہ کیا مدارج ہیں میں نے عرض کیا کہ مسکینوں بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ ان کے ساتھ انعام احسان کرنا' دینا دلانا کہ وہ زندگی بسر کر سکیں کچھ کھا پی سکیں۔ اچھی بات کرنا لوگوں کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا۔ اپنے ماتحتوں پر سختی نہ کرنا۔ بعض روایتوں میں سلام کرنا بھی آیا ہے۔ چاہے اس کو جانیں یا نہ جانیں اس وقت جبکہ لوگ سوتے ہوں نماز پڑھنا آدھی رات کے بعد نماز کے لئے کھڑا ہو جانا۔ اسی میں خاکساری بخشش' بیمار پرسی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کیا کریں تاکہ یہ کام مدارج و مراتب کے بڑھنے کا سبب ہو جائیں۔ ؎

شرف مرد بجود است و کرامت بسجود ہر کہ ایں ہر دو ندارد عدمش بہ ز وجود

(مرد کی بزرگی بخشش سے' ہر بڑا پن سجدہ سے ہے جو کوئی یہ دو نہیں رکھتا اس کا عدم (نہ ہونا) اس کے وجود (ہونے) سے بہتر ہے۔)

اس کے بعد فرمان ہوا کہ جو مانگنا ہو وہ مانگ میں نے دعا کی بعض روایتوں میں یہ ہے کہ یہ دعا بتلائی گئی کہ جب نماز پڑھ چکو تو یہ دعا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْکَرَاتِ

(اے میرے اللہ میں مانگتا ہوں تجھ سے توفیق نیک کاموں کے کرنے اور منع کئے ہوئے بُرے کاموں کے نہ کرنے بُرے کاموں کے چھوڑنے کی) حقیقت یہ ہے کہ مساکین سے دوستی' ایمان کو درست رکھنے کی نشانی وجود اور ہستی کا ترک ہے انھیں دوست رکھنے والے ان سے دوستی اس لئے کرتے ہیں۔ تاکہ ان کی دوستی سے آخرت کے نیک نتیجے ہاتھ آئیں۔ دونوں باتیں ایک ہی ہیں۔ یہ انھیں دوست

رکھیں تو وہ بھی انھیں ضرور دوست رکھے گا کیونکہ اپنے دوست کے چاہنے والے کو ہر کوئی چاہتا دوست رکھتا ہے۔ محبت وہ نسبت جو دونوں طرف ہوتی ہے۔ اَن تغفرلی وترحمنی (میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو میرے گناہ بخش دے اور اپنے فضل سے مجھ پر رحمت کر) یعنی اگر پروردگار کی مغفرت و رحمت نہ ہو تو چھٹکارا نجات ممکن نہیں۔ آدمی سر سے پاؤں تک گناہ ہی گناہ ہے۔ گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ قصوروں کا پلندہ ہی نہیں بلکہ ڈھیر ہے۔ اس سے ایسا کونسا کام ہو سکتا ہے جو اس کی درگاہ میں قبول ہونے کے لائق ہو۔ حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام جو آدمیوں کے باپ ان کی اصل یعنی ان کی جڑ بنیاد ہیں، آپ نے اپنے اور اپنی تمام اولاد اور آنیوالی نسلوں کے لئے یہ عرض کیا۔ کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اگر تو ہمیں نہ بخشے ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹے میں رہیں گے۔ جب تو ارادہ کرے کسی قوم کو فتنہ و ابتلا میں ڈالنے تو ان کے اس بلا میں پڑ جانے سے پہلے جس میں ایمان کے چلے جانے کا ڈر ہو۔ مجھکو اٹھا لے تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس فتنہ و بلا میں میں بھی گرفتار ہو جاؤں۔ ایمان ہاتھ سے دیدوں۔ سب سے پہلے سلامتی و عافیت کی دعا کرنی چاہئیے۔ جب معاملہ تنگ ہو جاتا ہے سلامتی اُٹھ جاتی ہے تو عالم فتنہ و فساد سے اُٹھ جانا ہی بہتر ہے۔ اس کے سوائے چارہ ہی نہیں۔ سلامتی، ایمان کے ساتھ ہے ایمان کی سلامتی کی امید میں جینا بہتر ہے جب یہ رستہ بھی بند ہو جائے تو مرنا ہی بہتر ہے۔

اسئلک حبک (چاہتا ہوں تجھ سے تیری چاہت) یعنی تو اپنی محبت مجھکو عطا کر وہ ایسی ہو کہ مجھکو ساری چیزوں مال و دولت بال بچوں سے اور جو کچھ کہ تیرے سوا ہے ان سب سے، بہت پیاری اور بے انتہا عزیز ہو۔

محبت سے حق تعالیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ محبت توفیق طاعات وعبادات مراد ہے۔ یا وہ کام بھی جو اس کی نزدیکی کے اسباب ہیں مراد ہو سکتے ہیں۔

وحب من یحبك (دوستی اور محبت ان کی جن کو تو دوست و محبوب رکھتا ہے۔ یا دوستی و محبت ان کی جو تجھ کو دوست رکھتے ہیں) یعنی یہ دونوں صورتیں یا ان دو صورتوں میں کہ وہ تیری ہی دوستی اور تیری ہی دوستی کے کمال کا نتیجہ ہے۔ وحب عمل یقربنی الیك۔ (اور اس عمل سے محبت جو تجھ سے قریب کردے۔) اس کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جو کچھ کہ میں نے دیکھا وہ حق ہے۔ سچ ہے۔ اس دعا کو یاد کرلو اور دوسروں کو بھی یاد کرادو۔ یاد کرنے کی تعلیم دو۔ الحمد للہ کہ اس شرح کے ضمن میں اس کی تعلیم بھی ہوگئی اور اس حدیث شریف پر عمل بھی ہوگیا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعلیم وتعمیل اور بجا آوری ہوگئی۔ یاد رہے کہ بزرگ ترین اعمال میں سب سے بزرگ تر عمل نماز ہے جو بندہ کو حضرت کریم وہاب کی بارگاہ میں پہنچا دیتی ہے بدلہ اور ثواب کے لحاظ سے بھی سب سے بڑی ہوئی قرب میں پہنچانے والی اس سے نزدیک کردینے والی ہے نماز میں جو حال ہاتھ آتا ہے وہ صحیح تر وصادق ترین احوال میں سے ہے۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز تھی۔ نماز میں آپ کو ایک خاص شہود ایک مخصوص حال میسر ہوتا تھا۔ جو نماز کے علاوہ نہ ہوتا۔ یعنی جب آپ نماز میں ہوتے تو جو شہود و حال آپ پہ ہوتا وہ غیر نماز میں نہ ہوتا تھا آپ نے جو لِی مَعَ اللّٰہِ وقتٌ فرمایا وہ آپ کو نماز ہی میں ہوتا تھا۔ ہرچند کہ آپ ہمیشہ وصل وصال ہی میں رہا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ذوالجلال کا قرب آپ کو میسر تھا لیکن اس مرتبہ نماز میں ایک اذ

ہی خلوت عجیب تنہائی آپ کو حاصل ہوتی تھی یہاں آپ کی نزدیکی محرمیت کچھ اور ہی ہوتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد (یعنی بندہ کو اللہ تعالیٰ کی بزرگ و برتر ذات اعلیٰ صفات سے سجدہ میں وہ نزدیکی ہے کہ جس سے بالاتر اور کوئی اتحاد و یگانگی اور حال بالاتر نہیں) آپ کو سجدہ میں جو حال و قرب یگانگی، اتحاد میسر آتا یا ہوتا تھا وہ اور کسی چیز میں حاصل نہ ہوتا تھا۔ نماز کو معراج کے ساتھ نسبت دی گئی ہے۔ ہر ایک کو بلحاظ معرفت اور بقدر صفاء وقت اور بمناسبت علم روحانی سب اوقات میں اسرار و انوار سے نعیبہ ملتا ہے۔

مشائخین میں سے ہر ایک نے اپنے حال و مقام کی شرح کی ہے ان حروف کے لکھنے والے کو (صاحب تصنیف فارسی) مکتوب کے لکھنے کے ابتدائی مرحلہ میں ایک حال ہاتھ آیا۔ ایک نیت مل گئی۔ وہ کیا انعام ہوا تھا۔ اس کو لکھنا چاہتا تھا لیکن جب مکتوب ختم ہونے آیا تو وہ ذوق نہ رہا۔ نیت ہاتھ سے نکل گئی۔ انشاء اللہ دوسرے مکتوب میں اگر وقت ساتھ دے اور توفیق باری تعالیٰ یاوری کرے تو کچھ نہ کچھ ظہور میں آجائے گا۔ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اسی قدر کافی ہے وصلی اللہ علیٰ سید نا سید السید والنبی الکریم المجید محمد وآلہ واصحابہ اجمعین عافیت بخیر ہو۔ (چونتیسواں مکتوب)

مکتوب (۳)

مواظبت عمل دوری کسل

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ

اے نفس عمل میں کوتاہی کیوں کرتا اور کام کرنے سے کیوں رہ جاتا ہے۔ آگے پیچھے کیوں ہو رہا ہے۔ اُٹھ۔ کچھ کام کرلے۔ عمل کا ترک یا تو سستی یا خیال کی پستی سے ہوتا ہے سستی، کاہلی، خود ایک بیکار چیز ہے۔ تو کیا ہے۔ کیا چیز ہے۔ کچھ بھی نہیں جبکہ تیرا وجود ہی تیرا نہیں، تو اپنے آپ سے نہیں۔ تجھ کو کسی نے پیدا کیا ہے، تجھ میں قوت دے رکھی ہے، تجھ کو جس کام کے لئے پیدا کیا اس کے کرنے کا حکم کرچکا ہے کام کی توفیق تجھ میں دی ہے، اس کے اسباب مہیا کردیا ہے، حرکت میں لانے والا، اٹھانے پلٹانے والا وہی ہے۔ جس طرح چاہتا ہے جنبش و حرکت میں لاتا ہے، ہلاتا چلاتا ہے۔ جو کچھ فرمایا ہے اس کو کیا کر۔ جیسا وہ چلائے چل۔ تو درمیان میں نہ آ۔ اپنے آپ کو نہ دیکھ۔ اپنے پر نظر نہ رکھ۔ مالک اپنی ملک (جائداد) کو جیسا چاہتا ہے جب چاہتا ہے استعمال کرتا ہے وہ مالک متصرف ہے۔ اپنے ملک میں تصرف کرتا ہے جو اس کا ارادہ ہو وہ کیا کرتا ہے مثلاً کسی نے مٹی کی گڑیا بنائی۔ اس کو ہلا رہا ہے۔ گڑیا ہلتی جاتی ہے۔ گڑیا لاکھ چاہے کہ نہ ہلے مگر اس کو ہلنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا اس کو بھی جانے دے۔ تو اپنی عبادت پر اترا رہا ہے۔ اس کو اعتبار دے رہا ہے۔ اسکی ایک قدر و قیمت ٹھہرا رہا ہے کام میں سستی کاہلی کر رہا ہے۔ ہمت لگا رہا ہے۔ اگر تو کچھ کر رہا ہے تو اپنے لئے کر رہا ہے۔ دوسروں پر تیرا کیا احسان۔ اگر عبادت کر رہا ہے تو خدا پر رسول پر یا لوگوں پر کیا احسان رکھ رہا ہے۔ یمنون علیك

ان اسلموا قل لا تمنوا علیّ اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان (آپ پر منت رکھ رہے ہیں کہ ہم مسلمان ہوئے کہہ دیجئے کہ مجھ پر احسان نہ جتلاؤ مسلمان ہونے کا بلکہ اللہ نے احسان کیا تم پر کہ تم کو ایمان کی راہ سوجھائی) لوگوں کو تیرے عمل سے کیا فائدہ۔ جو تو اپنی شان دکھاتا ہے جو کوئی اپنے لئے کام کرے دوسروں پر احسان دھرے یہ بیکار، بیہودہ لغویات ہے۔ دیکھ کہ تو نے اپنی ساری عمر میں کوئی کام خدا کے لئے نہ کیا۔ تب کچھ بدلہ اور اجرت کے لئے کرتا رہا۔ دنیا اور آخرت میں پانے کی اُمیدیں لگایا بیٹھا رہا۔ اپنے لئے کمال حاصل کرتا ہے۔ ہنر پیشہ کسب سیکھتا ہے کیا آخرت کا بھی توشہ تیار کر لیا ہے۔ اتنا تو کہہ کہ تو نے خدا کے لئے کیا کیا۔ ان احسنتم احسنتم لانفسکم فما للہ (اگر تم نے نیکی کی تو اپنے لئے کی اللہ کے لئے کیا کیا) تیرا عمل صرف خواہش، دعا، آرزو طلب ہے سمجھ جا یہ بندگی نہیں۔ بندگی وہ ہے جو صرف خدا کے لئے خدا کی کی جائے اپنے لئے نہ ہو۔ دنیا کے لوگ کام کاج ہنر و کسب اپنے لئے کرتے ہیں ذریعہ گذر بسر کی طلب میں دوڑے پھرتے، جان لڑا دیتے ہیں۔ اچھا بتا کہ تو اپنے لئے کچھ کیا۔ نہیں نہیں بلکہ تیری حرص و طمع ان لوگوں سے کہیں زیادہ ہے تیرا کام تو آخرت کی بہتری کے لئے ہے اور وہ لوگ صرف دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ آخرت سے بے فکر و نچنت بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر یہ سستی و کاہلی کیوں کس لئے اور احسان و منت ناز کس پر فرصت کو کیوں غنیمت نہیں سمجھتا۔ خدا سے کیوں نہیں ڈرتا۔ ایک دفعہ بھی اگر توفیق کی رفاقت کو وہ لوٹا دے، تجھکو بے کار بٹھادے دنیا کی محبت، کالے دل والوں کی طرح تیرے دل میں بھی ڈال دے اور ان کی طرح تجھ کو بھی سرگرداں و پریشان

بنادے، تجھ کو تجھ پہ چھوڑ دے گناہ و گمراہی میں مبتلا کر دے، خوار و ذلیل
بنا دے اور تیرا نام نیک بختوں کے دفتر سے خارج کر دے تو اس وقت تجھکو
معلوم ہوگا کہ تیرا حال کیا ہے۔ اس وقت شرمندہ ہونا، توبہ کرنا، قسمیں کھانا
کوئی فائدہ نہ دے گا۔ کہ وقت نکل گیا خدا کی نعمتوں کو نہیں دیکھتا۔ اُس کا شکر
ادا نہیں کرتا۔ اُٹھ اُٹھ عمل کر شکر ادا کرتا کہ تیرا ایسا کرنا اور زیادہ عمل
کرنے کی توفیق کا سبب وحیلہ بن جائے۔ نعمت زیادہ ہونے کا باعث
ہو جائے۔ اگر اچھی طرح سے دیکھے گا، عقلِ سلیم کو کام میں لائے گا تو یہ تیری
سمجھ میں آجائے گا کہ بہترین کام عمل کی توفیق کا چاہنا ہے سب کچھ اسی میں ہے
"عمل" کا بہترین بدلہ جو عمل کرنے والے مانگتے ہیں وہ یہی کہ عمل اور زیادہ ہو جائے
کل (قیامت میں) دیکھے گا کہ یہاں سے کیا کیا ساتھ لے آیا۔ کیا کیا باطنی نور تیرے
باطن سے سر نکالے۔ کیا کیا چیزیں تجھ سے باہر آئیں۔ تو حیران ہو جائے گا۔ اور
اپنے آپ سے کہے گا کہ اے کاش اس سے زیادہ اس سے بہتر کام کرتا۔ ایک
گھڑی کے لئے بھی دنیا میں بیکار نہ بیٹھتا۔ کل قیامت میں جو حیرت و افسوس
لوگوں کو ہوگا وہ یہی ہوگا، ہائے ہم نے کیوں کام نہ کیا۔ جنھوں نے کیا وہ یہ کہیں گے
کہ اس سے زیادہ کیوں نہ کیا۔ دنیا تیرے کام کرنے کی جگہ ہے اور تیرے لئے یہی
آخرت کی کھیتی ہے۔ جو یہاں بوئے گا اس کو وہاں حاصل کرے گا۔

سنو۔ سمجھو۔ ہر عمل میں ایک نور و نورانیت ہے اگر ایک عمل ترک ہوگیا
تو ایک نور کم ہو جاتا ہے۔ خصوصاً فرائض، واجبات، سنتِ مؤکدہ میں بہت
ہی قوی اور زبردست انوار ہیں۔ پورے اتمام اور پورے کمال کے ساتھ ہے
اللہ تعالیٰ کی مہربانی وعنایت کو تو دیکھو جو وہ اپنے بندوں پر رکھتا ہے، وہ
فرماتا ہے کہ یہ کام کیا کرو۔ اس کو ہاتھ سے جانے نہ دو اپنے قصوروں، اپنی

کوتاہیوں سے اپنے حق میں راضی نہ ہوجاؤ۔ اگر نہ کروگے تو ہماری گرفت ہمارے عذاب میں آجاؤگے اس کی یہ عنایت ہے کہ وہ داب و اثر سے بندہ کو اپنی نزدیکی میں بلاتا ہے۔ تیرا رب عجیب ہے کہ وہ تجھکو زنجیروں میں جکڑ کر جنت کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ توکیوں اپنے آپ کو زبردستی نور سے ظلمت میں حضور سے غیب میں لا رہا ہے۔ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی کیوں مار رہا ہے۔ اللہ جن کا ولی ہوجاتا ہے ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں پہنچا دیتا ہے۔ اُٹھ بزم نور وحضور میں آجا۔ عمل کرنے لگ جا۔ عمل خدا کے لئے کر۔ اپنے آپ کو اپنی نظر سے گرادے اپنے آپ کو اپنے عمل کو نظر میں نہ لا۔ اگرچہ اس حالت کا حاصل کرنا، تیرے اختیار میں نہیں۔ تیری۔ طاقت تیرے بس کی بات نہیں، یہ خدا کا کام ہے۔ اس کا فعل ہے۔ عمل کر۔ دعا کر۔ شکر کر۔ عاجزی کے ساتھ گڑگڑا۔ یہ حال بھی وہ تجھ کو عطا کرے گا۔ جو عمل نقد ہے اس کو ہاتھ سے نہ دے۔ جو کچھ ہے عمل ہی ہے عمل ہی سے ملتا ہے۔ سُنّتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے۔ جس کسی کو وہ نزدیک کرتا، عطا کرتا، نوازتا ہے۔ طاعت ہی کے ذریعہ سے نزدیک کرتا، عطا کرتا، نوازتا ہے۔ جس کسی کو دور پھینک دیتا ہے گرا دیتا ہے اس کو گناہ ہی کے ذریعہ سے دور کرتا، گرا دیتا ہے۔ سب اسی کا فضل ہے۔ لیکن اس نے اپنے فضل کو عمل پر منحصر کر رکھا، اس سے متعلق کردیا ہے۔ عمل بھی اسی کا فضل ہے۔ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے اُسے دے اور وہ اللہ بڑا بے انتہا فضل والا بزرگ و برتر ہے) اگر عمل نہ کرنے، اس کے ترک کرنے کی وجہ سُستی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے خلاف صبر کر۔ ثابت قدم رہ غفلت اور سستی کے بستر پر خود کو نہ ڈال۔ اپنا کام کر سُستی

میں نہ آ۔ پھر دیکھ کہ کتنی نورانیت تیرے باطن میں ڈالی جاتی ہے کیسی حیات تازہ تیرے دل میں آجاتی ہے سستی کا علاج صبر ہے۔ تھوڑی دیر کا صبر شجاعت ہے۔ اگر سستی آنے سے صبر نہ آیا، اگر آرام کے پسند آجانے سے کاہلی ونادانی کے بستر پر لیٹ گیا، تو شیطان تجھ سے گلے مل لیتا ہے۔ تیرے بازو میں لیٹ جاتا ہے صبح تک تجھ کو سلائے رکھتا ہے۔ تجھ میں اندھیرا برپا کر دیتا ہے۔ اگر تو اُٹھ گیا، سستی کو جھٹک دیا، غفلت کو دور کر دیا، ذکر کے لئے وضو کر کے متوجہ ہو گیا۔ حاضر آ گیا، تو دم بدم نور بڑھتا جاتا ہے، حتیٰ کہ سارا وجود نورانی ہو جاتا ہے۔ اگر سستی کی وجہ تیری غذا ہے تو زیادہ نہ کھا زیادہ کھانے میں تیری نیک بختی نہیں۔ تجھے کھانے ہی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ کھانا جینے اور ذکر کرنے کے لئے۔ جینا کھانے کے لئے نہیں اتنا کھانا چاہیئے کہ سستی نہ آئے صحت برقرار رہ جائے ضرورت کے موافق کھانا کھانا واجب ہے۔ کھانے سے سستی آئے تو اس کو کم کرو۔ نیند کا اگر غلبہ کسل سے ہے تو نیند موت کا حکم رکھتی ہے اور تو موت سے بھاگتا ہے۔ پھر نیند سے کیوں نہیں بھاگتا۔ موت سے کیوں راضی ہوتا ہے اپنے آپ کو موت کے منہ میں کیوں ڈالتا ہے۔ اس کسل کو دور کر جس سے نیند آتی ہے۔ اگر سستی دکسل کی وجہ ایمان کی کمزوری، اعتقاد کی کمی ظلمت کا طاری ہونا غفلت کا چھا جانا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے اچھی طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جا اپنے آپ کو اس کی یاد میں لگا دے نور حضور سا تھ کر لے کہ یہ ساری سستی غفلت ظلمت کو دور کر کے ایمان میں قوت اعتقاد میں پختگی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر جب تو ایسے حال میں آجائے تو ایمان میں تازگی، سینہ میں انشراح دل میں نور پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ کوئی چیز اس دنیا میں نور حضور، عمل پر استقامت ومداومت سے بڑھکر نہیں۔ یہی سب سے مقدم اور اہم چیز ہے۔

اس سے سستی جاتی رہتی ہے چستی آجاتی ہے جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو بہترین عمل شروع کرنا چاہیئے۔ سب سے زیادہ اور بہترین عمل نماز ہے خصوصاً رات کی نمازیں۔ ایک رکعت بھی ادا نہیں ہوتی کہ ایک حال کھل جاتا ہے۔ غفلت کا اندھیرا دور ہو جاتا ہے سستی کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ ایک نئی تازگی ایک نیا نور، ایک عجیب ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ جو بھی عمل کریں وہ اچھی طرح سے کریں۔ خوب جم کر کریں۔ کوشش کے ساتھ دل لگا کر آداب و شرائط کے ساتھ اچھی طرح ادا کریں۔ ادب لحاظ کے ساتھ عمل کرتے جائیں۔ یہ سمجھیں کہ شاید یہی آخری عمل ہو۔ پھر کرنے کا دنیا میں رہنے کا موقع ہاتھ آئے یا نہ آئے ممکن ہے کہ یہی تیری عمر کا آخری وقت ہو۔ ہوشیار رہ اور جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو پا۔ اے اللہ میں نے کیا لکھا ہے وہ تو جانتا ہے۔ کام کئے جاؤ، باتیں بنانا چھوڑ دو۔ (چالیسواں مکتوب)

مکتوب (۴۱)

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اَلدِّیْنُ نَصِیْحَۃ (دین نصیحت ہے) فرمایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ نصیحت کس کے لئے فرمایا اللہ کے واسطے اس کے رسول کے لئے۔ اس کی کتاب کے موافق عام اور خاص مسلمین کے لئے اس صحیح حدیث کی روایت بخاری اور مسلم نے کی ہے۔ یہ صحیح حدیث جوامع الکلم (ساری باتوں کا نچوڑ) ہے یہ وہ اجمال ہے جس میں سب

علوم دین مندرج ہیں۔ دریا کو کوزہ میں سمودیا گیا ہے ساری دنیا کے علماء دور دراز ملکوں سے آکر اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں ہر ایک اپنے علم سے اس کو بیان کرنا چاہے تو اس کا شمہ (بہت ہی تھوڑا جز) بھی بیان نہیں کر سکتے۔ یہ بیان میں آ نہیں سکتا علماء جو کچھ بیان کریں گے یا کہیں گے وہ ان کے علم اور اس کی وسعت، ان کی عقل اور اس کے حوصلہ کے مطابق و موافق اور اسی مناسبت سے ہوگا۔ زمین کے سارے درخت قلم ہو جائیں اور سب سمندر سیاہی ہو جائیں تو اس کو لکھ نہ سکیں۔

جوامع الکلم ان احادیث کو کہتے ہیں جن میں اختصارِ لفظی (تھوڑے لفظ) اور معنی و مضمون کافی ہو۔ یعنی لفظ کم ہوں معنی بے انتہا رکھتے ہوں (جامع جس میں بہت سے معنی ہوں اور وہ بہت سارے مطالب پر حاوی ہو)۔ اس طرح کا کلام۔ آنحضرت رسالت مآب ختم نبوت و رسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی خصوصیت خاص ہے۔ آپ پر درود و سلام کہ آپ اللہ تعالیٰ کے کلام کے دلائل و شواہد ہیں چنانچہ آپ کا فرمان ہے مجھکو جوامع الکلم دیا گیا ہے کلام کو مختصر مقید کر دیا گیا۔ کلام کیساتھ ساتھ آپکے چہرۂ مبارک پر وجہ جمیل سے ایسا انتہائی حسن و جمال ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہم وہاں نہیں پہنچ سکتا یہ ہمارے بس کا نہیں یہ وہ ہے جس کو ہم پا نہیں سکتے۔ جس طرح عالم ایجاد میں انوکھی وضع سے آپکو ظاہر کیا اسی طرح آپکے کلام جلیل میں ایسے ایسے راز و رموز و حقائق رکھے گئے کہ وہ تصور میں

در دل ہر امتی کز حق مزہ است — رو و آواز پیغمبر معجزہ است

(ہر امتی کے دل میں حق کی طرف سے ایک مزہ ہے۔ منہ اور آواز پیغمبر کی ایک معجزہ ہے)

لغت میں نصیحت۔ خالص ہو جانے، بے کھوٹ ہو جانے، داغ دھبہ نہ رکھنے سچائی کے قدموں پر کھڑے ہونے کو کہتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے

عرض کیا کہ وہ ایسی کیا اور کس قسم کی نصیحت ہے جس کا آپ نے اشارہ فرمایا دین کو اسی پر منحصر فرما دیا. کس کے لئے ہے اور کس سے اس کو نسبت دی گئی ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔ اللہ اور رسول اور اس کی کتاب اور خاص اور عام مسلموں کے لئے ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ دین کے حقوق کی ادائی اور اس کا ہر ادب اس کی ہر رعایت کو اس طرح محفوظ رکھنا کہ وہ بخوبی ادا ہو جائے جب کسی سے اس طرح حقوق کی ادائی ہو جاتی ہے تو وہ دیندار ہو جاتا ہے جس نے دین کا جیسا کہ حق ہے ادا کیا اس نے اسی مناسبت سے دونوں جہاں میں درجہ پایا۔ ادائی حق کے لحاظ سے درجات میں تفاوت ہے۔ علوم دین میں سے کوئی علم ایسا نہیں کہ وہ اس دائرہ اور اس معانی کے شامل نہ ہو نہیں نہیں ہرگز ایسا نہیں. کوئی علم اس سے سوا اس سے باہر نہیں عام اس سے کہ وہ الوہیت کا علم ہو یا خالقیت کا 'مقام نبوت سے متعلق ہو یا شریعت سے مختصر عبارت میں اس کو دوبارہ کہتا ہوں ظاہر ہے کہ عموماً علم خلق سے یا خالق سے متعلق ہوتا ہے اس کے سوائے جو کچھ بھی ہیں وہ اس سے علیٰحدہ نہیں ہوتا۔ اب ان ہی مقاصد کا اجمالی اشارہ مختصر و جامع نمونہ و مثال کے ساتھ ہم چند عنوانات کے تحت بیان کریں گے یہ مسلمہ ہے کہ اس کی تفصیل کی کوئی حد نہیں اور کوئی ان کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا. کسی کی مجال نہیں کہ وہ ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔ یاد رہے کہ گفتگو علمی زبان۔ فقہ کے دائرے میں ہو رہی ہے اس لئے وقت کو نہایت احتیاط کے ساتھ صرف کرنا اور کام میں لانا لازمی ہے۔

نصیحت اللہ کے واسطے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت کے بارے میں اس کے احکام کی پابندی کرنے کے متعلق کرنے ذکرنے کا حکم کرنے نہ کرنے میں

دین کی مدد، احکام کے ماننے میں بھلائی ہے جو کہا گیا ہے، اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ احکام کہتے ہیں جس کی ادائی کے لئے بندے مکلف کئے گئے ہیں انھیں کرنے نہ کرنے کے دائرہ میں بند کر دیا گیا۔ پانچ چیزوں کو اس کا دائرہ احاطہ اور اس کے حدود بنیاد قرار دے کر اسلامیت کی بلند عمارت اس پر کھڑی کی گئی ہے ان کے بغیر دین کا گھر قائم و برقرار نہیں رہتا فرمایا گیا۔ پکا مسلمان وہ ہے کہ ان کو شرائط و آداب ظاہر کے ساتھ ہمیشہ کرتا ہے۔ اور استقامت کے ساتھ ان کی بجاآوری اس سے ہو جائے ہمیشہ ان کو ادا کرتا رہے۔ دین حق کی مدد جہاد سے بھی ہوتی ہے جو اللہ کا بول بالا ہونے کے لئے کیا جاتا ہے۔ حق کے راستے پر چلنے کے لئے دین کے دشمنوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ امر معروف نہی منکر (کرنے نہ کرنے کے حکم) پر مضبوطی سے قدم جمائے رہنا ضروری ہوتا ہے بندہ کے لئے لازمی و ضروری ہے کہ وہ اس طرح اس میں جما رہے کہ کسی قسم کی خواہش نفس کی کوئی آرزو بھی اس میں مداخلت کرنے نہ پائے۔ نفسانی خواہشات کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ان سے نکل آنا بڑا کام ہے۔ دین حق کی مدد کے لئے ہر ایک کو ایسی باتوں سے نکل آنا ان اسباب کا پیدا اور حاصل کرنا ضروری ہے جن سے دین و ملت کی بقا۔ قرار و قیام اور تقویت ہوتی ہو۔ جس در سے یہ ہاتھ آتے ہیں ان میں مقدم (پہلا اہم کام) اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کا علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ہے۔ اور وہ سب علوم جو اس کے ابتدائی کاموں اور وسائل میں مدد دیتے ہوں۔ جیسے صرف و نحو اور اسی طرح دوسرے دینی علوم قواعد آدب و انشا وغیرہ کا سیکھنا۔ سہ

علم دیں فقہ است و تفسیر و حدیث   ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

(دین کا علم فقہ تفسیر اور حدیث ہے۔ جو کوئی ان علوم کے سوا پڑھے وہ گندہ ہو جاتا ہے)

علم کی بتائی ہوئی بنیادوں پر کام کرنے کا نام عمل ہے۔ علم کو عمل میں لائے بغیر فائدہ نہیں ملتا اور علم بلا عمل بے کار بے فائدہ بے نتیجہ چیز ہے۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ علم کی بزرگی بذاتہٖ ہے علم علم ہے اس کے جوہر کی نفاست ضرور باقی ہے لیکن عمل سے جو خوبی، روشنی اس میں آجاتی ہے جو چار چاند لگ جاتے ہیں وہ اور ہی صورت ہوتی ہے۔ عمل اصول صنائع وحرفت مثلاً زراعت (کاشتکاری) حیاکت (کپڑے بننا) عمارت (تعمیر کرنا) تجارت (کاروبار کرنا) ایسے ہی اور کاروبار صنعتیں قسم قسم کے پیشے اور چیزیں اسی قسم میں داخل ہیں دین وملت کی بقا بلکہ سارے عالم کے معاملات سب آدمیوں کی زندگی رہن سہن بلحاظ حکمت اس کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ میری امتیوں کا اختلاف رحمت ہے اس کو اکثر علمائے نے مذاہب کے مختلف طریقوں کے جدا جدا ہونے۔ اجتہادات کے مختلف ہونے سے متعلق کیا ہے در اصل اس کا مقصد دین کے کاموں میں آسانی خدا کے بندوں کے لئے حکم میں وسعت وآسانی پیدا کرنا ہے۔ اس کو انھوں نے حل کردیا ہے بعض اختلاف وہ ہیں کہ جن پر علما حروت وصنائع کے لحاظ سے اس کی تکمیل میں اتر آئے ہیں۔ اگر اس کو بھی عام اجتہاد تصور کرلیں تو یہ دونوں کے شامل ہی نہیں بلکہ بہتر مفید تر چیز ہوجاتی ہے۔ احکام الٰہی کا مان لینا خصوصاً وہ احکام ارادی قہریہ (توڑ پھوڑ انقلاب) کہ قضا وقدر کے تحت جس کے احکام جاری ہوتے ہیں ان سے راضی ہوجانا۔ اپنے آپ کو اس کے سپرد کردینا ہے چنانچہ جب اس سے اس کے رب نے کہا کہ مان لے۔ تو اس نے کہا کہ میں نے دونوں جہان کے پروردگار کو مان لیا۔

تعالیٰ وتقدس کے احکام واوامر دو قسم کے ہیں (۱) احکام امریہ شرعیہ

جس میں عبادت طاعت۔ حکم کی بجا آوری داخل ہے۔ (۲) احکام ارادیہ قدریہ جس میں رضا و تسلیم درکار ہے۔ مسلمانوں کی طرۂ امتیازیہی دو چیزیں ہیں حقیقتاً حق تعالیٰ شانہٗ کا ارادہٗ اس کی حکمت، مصیبتوں کے نازل حوادث کے وارد کرنے۔ سامنے لانے میں اپنا تعرف (اپنی پہچان) اپنے بندوں سے کرانا۔ بندوں کو اپنا شناسا (جاننے والے) بنانا ہے۔ تاکہ وہ جان جائیں کہ یہاں اس کی قدرت کام میں ہے جو سب سے بلند تر اور غالب تر ہے جس کی قدرت کے سامنے ساری طاقتیں قدرتیں ہیچ ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے دفع (دُور) کرنے میں عاجز ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی پہچان کبھی لطف کے طریقے اور کبھی قہر کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ لطف تقریب و تخریب کے ضمن میں ہاتھ آتی ہے اس کی حقیقت میں نظر دوڑائیں تو یہ لطف ہی کی ایک قسم معلوم ہوتی ہے لطف کی ایک قسم کو لطف جلی (ظاہری) دوسری کو لطف خفی (باطنی) کہتے ہیں۔ اور اگر اس کے باطن میں نظر کریں تو وہ لطف بھی ہے اور قہر بھی ہے۔ ایک مرتبہ وہ ہوتا ہے کہ جس میں ظاہر میں لطف اور باطن میں قہر۔ ایک وہ مرتبہ ہے کہ قہر ظاہر اور لطف باطن میں ہو۔ ؎

عاشق ام بر لطف و بر قہرش بجد ۔۔۔ اے عجب من عاشق ایں ہر دو ضد

(تعجب ہے کہ میں ان دو کا جو آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں عاشق ہوں)

رسالہ تسلیۃ المصاب میں ہم نے اس کو صاف واضح الفاظ میں لکھا ہے وہاں دیکھ لیں۔

نصیحت رسُول کے لئے پہلا کام یہ کہ دل سے تعظیم و ادب اس عالیجناب کا رکھنا آپ کو پاک و برتر سمجھنا۔ ہر قسم کی بدی برائی سب خراب چیزوں اور باتوں سے مبرّا (پاک) جاننا۔ دین دنیا میں آپ کو سب سے بزرگ و برتر سمجھنا،

ماننا اس کے ساتھ ساتھ تمام انبیاء علیہم السلام کو بھی ہر اس عیب و نقصان سے جو نبوت و رسالت کے مرتبہ کے لائق نہ ہو پاک جاننا معصوم ماننا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کی حفاظت اس سے واقفیت و خبرداری اس کا ادب یہ ہے کہ مرتبہ الوہیت صفات قدس حق تعالیٰ کے سوائے جو بھی کمال و تعریف و خوبی ہو سکتی ہے وہ آپ کے لئے ثابت اور آپ میں موجود جاننا اور سمجھنا ہے ؎

مخواں اورا خدا از بہر امر شرع و حفظ دیں دگر ہر وصف کش میخواہی اندر مدحش املا کن

(آپ کو خدا نہ کہہ شرع کے حکم اور دین کی حفظ کیلئے۔ اور جو بھی وصف آپکا چاہتا ہو لکھ۔)

سارے مراتب و کمالات، خوبیاں، ظاہری ہوں یا باطنی وہ سب کے سب اس کے بندے اور رسول میں جمع و مندرج ہیں اس کا یقین رکھنا عبودیت (بندگی) آپ کی خصوصیت خاصہ اور آپ ہی کی ذات عالی کے لئے مخصوص ہے آپ کے سوائے حقیقی بندہ کوئی اور نہیں نہ کوئی ہو سکتا ہے جس قدر بندے ہیں وہ سب آپ ہی کے طفیلی ہیں۔ اس لئے ہم پر یہ واجب و لازم ہے کہ سنّت، نوافل۔ عبادات، عادات، اعتقادات میں آپ کی پیروی کریں۔ کیونکہ جو کچھ سنّت کے خلاف یا آپ کے طریقے کے خلاف ہو وہ باطل ہے ایسی بدعات (نئی باتیں) جو نکالی گئیں ہیں جس کسی نے نکالی ہیں جن سے سُنّت میں عملاً تغیر آیا ہو۔ آتا ہو یا آنے کا امکان ہو۔ سُنّت کے مخالف ہوں۔ ان پر عمل کرنا صریح گمراہی ان کا کرنے والا مردود گمراہ ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ہمارے اس کام میں نئی بات نکالے اگر وہ اِسی میں کی یعنی میری سنت میں سے نہ ہو تو وہ مردود چیز ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے۔ ہر نئی بات کا نکالنا بدعت ہے۔ بدعت کو گمراہی بے دینی فرمایا گیا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو دِل

بدعت میں گرفتار ہوجاتا ہے اس میں نور ولایت نہیں آتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ بدعتی ولی نہیں ہوتا۔ دوسرا کام آپ سے محبت رکھنا آپ سے محبت کرنا ہے۔ اور ان حضرات کے ساتھ محبت رکھنا جو آپ سے نسبت رکھتے ہوں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ آپ کے دین کے علماؑ صلحاؑ سے آپ کے شہروالوں سے آپ کے ملک خصوصاً آپ کے قریب تر اور بزرگ تر قرابتداروں سے اور آپ کے اہل بیت سے محبت کرنا اور رکھنا ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی تعظیم کرنا۔ انھیں کسی قسم کا رنج وکسی طرح کی تکلیف نہ پہنچانا ان کی برائیوں لغزشوں سے تجاوز کرنا۔ انجان ہوجانا۔ ان کے جوہر ذات کے قائل رہنا۔ ان کی غیبت۔ حقارت اہانت سے دل اور زبان کی حفاظت کرنا۔ ان کی محبت سے بھرے ہوئے، غلبہ پائے ہوئے ہونا لازمی ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ فرماتا ہے کہ کہد یجئے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا۔ مگر اسی قدر کہ میرے قربیٰ (نزدیک والے۔ اہل بیت) سے مودت (محبت دوستی) برتو۔ مطلب یہ کہ انھیں دوست رکھو۔ ان سے محبت کرو۔ دوستی و مروت کا برتاؤ کرو۔ انھیں عزیز رکھو۔ مسلہ ہے کہ احکام دین کے اجرا حقوق شرعیہ کی قرار داد میں سب کے ساتھ وہ برابر کے شریک ہیں۔ امر و نہی کے دائرہ سے خارج نہیں۔ سچی بات یہی ہے کہ نیک عمل سے بزرگی اور تقوی سے برتری ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم میں سے اللہ کے پاس وہی بزرگ و برتر ہے جو زیادہ متقی ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ قطعی ہے ہر ایک کے لئے ہے احکام وحدود شریعت جاری کرتے وقت اپنے آپ کو محض نائب اور نمائندہ جاننا ضروری ہے نسبت کی بزرگی کو کسی صورت سے بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے جیسے کہ کوئی بندہ اپنے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے لڑکے کو سزا دیتا

ہے اور اپنے آپ کو درمیان میں نہیں دیکھتا حدود شرعی پر عمل کرتے وقت زبان سے دل سے کسی کو بُرا کہنے، ذلیل کرنے حقارت سے دیکھنے سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا واجب و لازم ہے۔ ان صفات سے موصوف حضرات ہی اہل اللہ۔ اللہ والے ہوتے ہیں۔ ان ہی کو اہل اللہ کہتے ہیں کہ وہ حدود شرع کے قائم و جاری رکھتے اور صاحبان اختصاص ہوتے ہیں اپنے اور سب مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت اس کی حرمت رکھنے کا طریقہ یہی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ افراط تفریط۔ خوف وضرر کی جگہ ہے۔ یہ دل نشین رہے کہ حق تعالیٰ کی سابقہ عنایت اہل بیت نبوت کے حق میں ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی قدر منزلت بارگاہِ الٰہی میں بہت زیادہ ہے ان سے یہ کہدیا گیا ہے کہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شفاعت نہ کریں گے۔ ان کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اُمت میں احکام دین رائج کریں سچائی تحقیق و تقویٰ میں سب سے آگے رہیں۔ خود کریں اور ں کو کرنے کی ہدایت کریں۔ رغبت دلائیں۔ کیونکہ دین کی حمایت و رعایت سب سے زیادہ کرنا انہی حضرات کے ذمہ ہے۔ شریعت کے احکام کی حمیت اور حق تعالیٰ کی بندگی سب سے بڑھکر انہی کے سر ڈال دی گئی ہے۔ علما نے یہی کیا ہے۔ اور یہ نہایت درست نتیجہ اور سارے احکام و احادیث کا نچوڑ ہے۔

دین نصیحت کے لئے نصیحت سے امت پر آپ کی شفقت و محبت مراد ہے رعایت حقوق۔ امداد و اعانت۔ فرائض کا قیام و قرار معاشرت کے اور لوازم جیسے کہ بیمار پرسی، سلام، کلام۔ نماز جنازہ اور ایسی باتیں مثلاً ہنر اور پیشہ صنعتوں کا قیام کہ جس سے دین کا انتظام اس کی سنبھال بخوبی ہو سکے۔

ائمہ کا مقرر کرنا، مفتیوں کا تقرر۔ انصاف کے لئے عدالتوں کا قیام عادل منصفوں کا تقرر یہ سب اس لئے کہ سنت و کتاب کی پوری پابندی ہو۔ کتاب و سنت کے موافق فیصلے و تصفیے ہوا کریں۔ امت احکام کی پابند رہے۔ شریعت کے احکام کی اجرائی اور اس کی حرمت ہوسکے۔

کتاب کے لئے | اللہ کی کتاب کی تعظیم اور اس پر عمل۔ اس کی معنیٰ میں غور وفکر اس کے سمجھنے سمجھانے، سیکھنے، سکھانے اور جو علوم اس سے متعلق ہوں ان کو حاصل کرنے کے لئے "طہارت" "اچھی آواز" "حضورِ دل" سے کتاب اللہ کے حقوق کی رعایت کے ساتھ اس کی تلاوت۔ بعضوں کا کہنا یہ ہے کہ جو کوئی کم از کم چھ مہینے میں قرآن ختم نہ کرے قیامت میں قرآن اس کا دشمن دعویدار ہو جاتا ہے۔ بعضوں نے چالیس روز کہا ہے اگر اس سے زیادہ مدت ہو جائے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ قدیم زمانے کے گزرے ہوئے بزرگوں میں ایسے بزرگ حضرات بھی تھے کہ وہ ہر روز ایک قرآن اور بعض تو اس سے بھی کم مدت میں ختم کیا کرتے تھے۔ اس کی تلاوت ان رعایتوں کے ساتھ جس کا مذکور ہوا۔ کیا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کے متعلق اپنے آپ سے اپنی ذاتی رائے سے کچھ کہنا، جو جی میں آئے۔ اس کی تفسیر کرنا جس کی سند روایت، سلف سے نہ آئی ہو۔ اور وہ شرع شریعت کے موافق نہ ہو۔ انتہائی فضول گفتگو ہی نہیں بلکہ سخت گناہ کی بات ہے، اس زمانے کے جاہل، فضول اس قسم کی گفتگو کیا کرتے ہیں عقلی گدے لگاتے ہیں۔ ایسی فضول بیکار باتیں کہتے ہیں۔ جو اسلامی زاویہ و نظریہ کے نہیں ہوتے لیکن انھوں نے اس کا نام تفسیرِ قرآن

رکھا ہے افسوس یہ ہے کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے کے بنا پر کی منقولی روایات سے تجاوز کیا اس نے کفر کیا۔ کفر کی اس کے لئے وعید (بری اطلاع سزا کی) ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن شریف کی تفسیر، احادیث اور منقولی روایتوں کے معنوں کے ساتھ کرنا لازم و واجب ہے۔

عام مسلمانوں کے لئے ان کے حقوق کی رعایت ان کی جان، مال جائیداد کی حفاظت و نگہداشت۔ حقارت کی نظر سے مسلمانوں کو نہ دیکھنا اپنے ہاتھ، اپنی زبان کو ان کی ایذا (ضرر) سے روکے رکھنا۔ مسلمانوں کے لازمی حقوق نہایت اچھے طریقے سے ادا کرنا۔ ان کے وہ کام جو شرع میں جائز ہوں ان کا نکالنا اس میں ان کی مدد و اعانت کرنا۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ مدد و اعانت کس طرح کی جائے تو آپؐ نے یہ فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑیں اس کو ظلم کرنے نہ دیں جہاد یعنی کافروں سے اسلام کی خاطر جنگ کرنا۔ اپنے نفس اور اس کی خواہشوں کے خلاف ڈٹے رہنا۔ نفس کو برے کاموں سے روکنا۔ اچھے کاموں میں شرع کے احکام پر چلنا۔ سرائیں۔ قیام گاہیں مسجدیں۔ کنوئیں۔ پل تعمیر کرنا۔ راستے بنانا ان کو درست کرنا۔ امر معروف نہی عن المنکر (اچھے کام کرنے کو کہنا برے کام سے روکنا۔ اچھی باتیں ان میں رائج کرنا) عام مسلمانوں کے لئے دینی نصیحت یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کی سمجھ کے موافق بات چیت کرنا۔ مسائل کو اس طرح سمجھانا کہ وہ ان کی سمجھ میں آجائیں آسانی کے ساتھ عمل کرنے لگ جائیں۔ باریک نکات دقیق مسئلوں کو آسان کر کے بیان کرنا۔ اس میں انھیں الجھنے نہ دینا۔ اسرار و حقائق و معارف جو کچھ

ہیں جیسے کچھ ہیں اسی طرح بلا کسی توجیہ و تاویل کے ان کے سامنے بیان کرنا۔
انھیں گمراہ کرنا ہے۔ علماء کے اختلاف کو ان لوگوں سے جو عالم نہیں ہیں بیان
کرنا بھی یہی حکم رکھتا ہے اللہ ہی حفاظت و مدد کرنے والا ہے

خاص مسلمانوں کے لئے خاص مسلم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ قسم میں
بادشاہ، امیر، سلطان، صاحبانِ امر داخل ہیں جن کی اطاعت کرنا.
محکوم رہنا، طریقہ اسلام کے واجبات میں سے ہے۔ بشرطیکہ خدا و رسول
کے احکام کے خلاف حکم نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اطاعت کرو۔
اللہ کی اللہ کے رسول اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہوں۔ حدیث
میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے سوید بن عسقلہ رضی اللہ عنہ سے
کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی ہیں یہ فرمایا کہ اے سوید بن عسقلہ
شائد تو مجھ سے پھر نہ ملے، مجھ کو نہ پائے اس لئے میں تجھ کو تقویٰ اور امیر کی
بات سننے۔ اس کی اطاعت کرنے کی۔ وصیت کرتا ہوں۔ چاہے وہ حبشی
غلام ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا یہ فرمانا اولی الامر کی بات ماننے کے بارے
میں آخری مرتبہ کا حکم ہے۔ ظاہر ہے کہ غلام، امیر و امام نہیں ہوسکتا۔
آزاد ہوسکتا ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ امیر کا نائب اور خلیفہ ہو۔ اس
لحاظ سے اس کی بھی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ بہرحال ان کی اطاعت
کرنا۔ ان کے حکم کا ماننا واجبات سے ہے۔ مگر کسی صورت میں ان کا
حکم احکامِ دین کے خلاف نہ ہو۔ کراہت کی کوئی صورت اس میں نہ ہو۔
ظاہر ہے اپنے گھر میں ہر شخص حاکم و امیر ہے۔ باپ بچوں کا۔ استاد شاگردوں کا۔
اسی طرح ہر حاکم و رئیس اپنے ماتحتوں پر جو اس کے ماتحت اور اس کے
حکم میں ہیں ان کا حاکم ان پر امیر ہے جن پر اس کی اطاعت کرنا لازمی ہے اور

اس کو ان کے ساتھ انصاف وعدل کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ تم سب حاکم ہو۔ تم سے تمہارے ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ ہر آدمی اپنے اعضا جوارح ہاتھ پاؤں دل دماغ پر امیر ہے۔ دل و دماغ، ہاتھ، پاؤں، زبان اس کے قابو و تصرف میں ہے۔ جب قیامت میں ان اعضا سے پوچھا جائے گا تو وہ بارگاہِ خداوندی میں عرض کریں گے۔ داد چاہیں گے اپنا انصاف پائیں گے۔ مہربانی سے سرفراز ہوں گے۔

دوسری درمیانی قسم میں وہ علماء ہیں جن کی تعظیم و تصدیق واجب ہے بشرطیکہ وہ کتاب وسنّت کی دلیل اور سند کے ساتھ کسی بات کو بیان کریں لوگوں تک پہنچائیں۔ اگر وہ دین کے خلاف کچھ کہیں۔ نفس کی خواہش، دنیا کی محبت کی خاطر حیلہ سازی، فتنہ پردازی کریں تو ان کی تصدیق و تعظیم ضروری نہیں۔ حدیث میں ہے کہ اہلِ علم پیغمبروں کے وارث ہیں۔ پیغمبروں سے ان کو علم دین وراثتاً پہنچا ہے۔ لیکن انبیاء علیہم اللہ کے وارث کہلانے کے یہ اس وقت مستحق ہوتے ہیں جبکہ دنیا ان کی خاطر میں نہ آئے اس طرف رغبت نہ کریں۔ بادشاہ، امراء کے پاس رسوخ نہ چاہیں وہ علماء جو دنیا و اہل دنیا کے مصاحب بن جائیں ان سے ڈرو۔ کہ یہ دین کے چور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔ ہم ایسی باتوں سے اللہ کی پناہ میں آتے اور اس سے عافیت چاہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اہلِ دنیا اور دنیا میں پھنسے ہوئے "اہل علم" دین کو دنیا کے بدلے میں بیچیں گے۔ دین کے کام میں سستی کاہلی برتیں گے۔ ناحق فتوے دیں گے بخلاف اس کے جو عالم یہ باتیں نہ کریں دین کو پھیلائیں اسلام کے احکام رائج کریں۔ مسلمانوں کی امداد و اعانت کریں، دینِ حق کو تقویت دیں تو یہ بہترین کارنامہ اور بڑا عمدہ کام، نہایت اچھی چیز،

بڑی شان کی بات ہے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔ وہی سیدھی راہ دکھانے والا ہے۔

تیسرے اعلیٰ ترین قسم میں وہ علمائے صاحبانِ خصوصیت خاص داخل ہیں۔ جن کو مشائخ طریقت رضوان اللہ علیہم اجمعین کہتے ہیں یہ پاک ہستیاں علم کو عمل میں لاکر تحقیق وصدق کے ساتھ سنّت کی اتباع (پیروی) کرتی ہیں۔ اپنی پوری توجہ حق کی طرف لگا دے کر اس کے غیر سے بالکل الگ وجدا ہو جاتے ہیں شریعت میں رسوخ پاکر معرفت کے انوار، حقیقت کے اسرار کو پہنچکر حال سے مزّین ہوکر کمال حال سے سب سے ممتاز ہوجاتے ہیں۔ یہ امت میں سب سے افضل، دین میں سب سے کامل تر، دین وملت کے محققین ہیں حقیقت الحقائق کو پہنچے ہوئے متمکنین ہیں۔ تمکین ان کا مقام ہے ظاہر و باطن۔ شریعت وطریقت کے جامع ہوتے ہیں۔ احوال باطن واسرارِ حقیقت سے یہ جو کچھ خبر دیں اس کو مان لینا چاہئیے۔ ضابطہ اس بارے میں یہ ہے کہ وہ جزو کیفیت جو علم الہٰی، قرآن وحدیث کے لحاظ سے شریعت کے اصول کے مناسب ہو جس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہ ہو اس کو بدل وجان مان لینا چاہئیے اور جو کچھ علم وحکمت وشریعت کے بالکل خلاف ہو۔ اس سے انکار کر دینا چاہیئے۔ صرف شبہ ہی شبہ ہو۔ یقین نہ ہو وہ بات اصولاً درست پائی جائے تو خاموش رہنا ہی بہت بہتر ہے سنو۔ غور سے سنو۔ اگر کسی بات کا کہنے والا، کسی خبر کا دینے والا۔ ایسا ہو جو امامِ علم۔ دین میں کامل علم وعمل من مستقیم۔ تقویٰ اور ورع میں ثابت قدم اس پر عمل پیرا ہو۔ تو اس کے قول وفعل وحال کی تاویل و توجیہ کرنی ضروری ہے اگر مصلحت شرعی اس کی مقتضی ہو کہ انکار کیا جائے تو انکار کر دینا چاہیئے تاکہ عوام گمراہ نہ ہوں۔ ناقصوں کی تباہی کا باعث نہ ہو۔ یہ سمجھنا بھی نہایت

ضروری ہے کوئی ولی لغزش وخطا، بیہودہ گوئی۔ گناہ کرجانے سے معصوم نہیں لیکن محفوظ ضرور ہے جو کہتے ہیں وہ یہی بات ہے کہ وہ گناہ کو اصرار کے ساتھ کرنے یا ہمیشہ اس میں رہنے سے محفوظ ضرور ہوتا ہے یہ سب کا مانا ہوا ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم اور اولیا رحمہم اللہ محفوظ ہوتے ہیں عصمت گناہ میں مبتلا ہونے سے پہلے حفظت گناہ کے بعد ہوتی ہے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اس گروہ میں سے بعض سکر حال کے مسلط ہو جانے سے جو کہہ جایا کرتے ہیں۔ وہ قول وفعل ظاہر شریعت میں ٹھیک نہیں ہوتا۔ اس کو بیان کیا جاتا ہے اس کی روایت کی جاتی ہے۔ روایت و بیان کی صحت کے باوجود بھی احتیاط کا جو طریقہ ہے اس کا دارومدار توجیہ و تطبیق' سکوت وتسلیم' پیروی، نہ کرنے، یا کرنے پر منحصر رہ جاتا ہے۔ کھلے معاملات میں پیروی ہوتی ہے لیکن وہم، غلطی میں ڈالنے والے' چھپے ہوئے معاملات' دریافت نہ ہونے والی باتوں میں نہیں کی جاتی جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کام کیا ہے اور کیسا ہے پیروی نہیں ہوسکتی۔

سچ بات اسی قدر ہے کہ صحیح حال رکھنے والا اگر اپنے حال کو ضبط نہ کرسکے اس پر قابو نہ پاسکے تو وہ معذور ہے اس سے زیادہ لطف یہ کہ علم و شریعت کا انکار کرنے والا ان سے زیادہ معذور ہے اس لئے احتمال و اشتباہ کی صورت میں خاموش ہوجانا۔ درگذر کرنا۔ انجان ہوجانا ہی احتیاط و انصاف سے قریب تر ہے بہرحال علم اہل علم کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ بیان میں آسکتا ہے۔ گفتگو کی جاسکتی ہے سمجھایا جاسکتا ہے جس قدر ضروری امور ہیں ان کو ہم نے رسالۂ مرج البحرین میں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھدیا ہے ہم اللہ سے دنیا میں آخرت میں سلامتی اور عافیت چاہتے ہیں' اور

درود و سلام سیدھی راستہ کے بتلانے والے سردار و آقا محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل و اصحاب پر بھیجتے ہیں۔ (نواں مکتوب)

مکتوب (۵)

امر و نہی کی پابندی

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

آپ کے علم میں یہ ضرور ہوگا کہ "شکر" کو نعمت کے زیادہ ہونے' دولت کے باقی رہنے کا سبب کہا جاتا ہے۔ سمجھ کے لحاظ سے شکر ادا کیا جاتا ہے۔ یہ مشہور بات ہے کہ شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ سلسلہ انتہا کو نہیں پہنچ سکتا۔ کسی حساب کسی شمار میں نہیں آسکتا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ ان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا (اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو نہ گن سکو گے) ساری نعمتوں میں وجود کی نعمت پہلی نعمت اور سب نعمتیں اس کے بعد ہیں۔ نعمتِ وجود ہمیشہ کے لئے ہے۔ ہمیشہ کی نعمت کا شکر ہمیشہ کرنا ضروری ولازی ہے۔ جو کچھ ہے وہ شکر کی ذمہ داری اس کی بجا آوری ہے۔ یہی پورے طور سے جب نہیں ہوسکتی تو اس کی دوسری نعمتوں کے بارے میں کوئی کس طرح 'کیسے زبان کھولے۔

اللہ تقدس و تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ایک شارع علیہ السلام کے ذریعہ ایک دین و ملت پر چلنے۔ بندوں کو دی ہوئی نعمت کے شکر کی ادائی کرنے چند کاموں کے کرنے اور چند باتوں کو نہ کرنے کا پابند کر دیا ہے بعض کے کرنے اور بعض کے نہ کرنے کا حکم فرمایا۔ اپنے بندوں سے اتنے ہی سے راضی ہوگیا۔ اسی پر بس کیا ہے۔ اسی لحاظ سے یہ کہتے ہیں کہ جو دیا اس کا شکرانہ

سجدہ مقرر کیا اور سجدہ چاہتا ہے۔ پاؤں جو دئے ہیں، پاؤں کا شکرانہ قاعدہ چاہتا ہے۔ وجود، مال دولت، قوت، قدرت جو اس نے اپنے بندوں کو دی ہے اور ان کی جان پر احسان رکھا اس کے شکرانہ میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے خصوصاً نماز کہ یہ ظاہری و باطنی نعمتوں کا شکرانہ ہے۔ جس میں آدمی کے تمام اعضا حواس قوائے ظاہری و باطنی اور آدمی کے وجود کے ہر حصے عبادت و خدمت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ نماز میں پڑھنے ادا کرنے کے ہیں جیسے کہ فرمائے گئے ہیں اسی طرح ادا کریں تو شکر کرنے والوں میں سے ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ ادائی جیسی کہ ہونی چاہیئے ہو جائے، تا کہ پروردگار کی جناب میں قبول و پذیرا ہو جانے کے لائق ہو جائے۔ یہ سچ ہے کہ اس کی بارگاہ کے لائق کام کس سے ہو سکتا ہے اور کون کر سکتا۔ بہت کم ایسے ہیں جن سے ایسی ادائی ہو جاتی ہے خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :۔
قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ (تھوڑے شکر گذار بندے ہیں) بعض ایسے ہوتے ہیں کہ نجات کے حاصل کرنے کی حد تک ہی عبادت، احکام کی پابندی کرتے ہیں۔ ———— بعض وہ ہوتے ہیں جو تبارک و تعالیٰ کی درگاہ میں قبولیت پانے۔ اس کی رحمت تک پہنچنے کے لئے مقررہ فرائض کی ادائی کے بعد اللہ کے سوا کسی اور کام میں نہیں رہتے ابتدا سے انتہا تک (ہر وقت) وصول الی اللہ (خدا تک پہنچنے) کی طلب میں رہتے ہیں و تقیہ پوری کوشش پورے اہتمام کے ساتھ نوافل کی کثرت، عبادتوں کے زیادہ کرنے کی اسی سے متوجہ رہنے کی توفیق پاتے ہیں۔ درجہ کی زیادتی نزدیکی کا مرتبہ رضا محبت الہٰی کی اور نعمتیں جس کی انتہا نہیں بے حساب بے شمار ہیں، وہ ہاتھ آجاتی ہیں۔ نفل عبادتوں کے مراتب و اقسام بہت ہیں بسا کوں

کے مدارج کا تفاوت مقربوں کے مقامات کا فرق، عبادتوں کے مدارج و مراتب کے لحاظ سے ہے۔ عبادت ہی ہے جو منزل مقصود کے سیدھے راستہ پر مولیٰ تعالیٰ کی نزدیکی میں پہنچا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (اللہ تعالیٰ میرا رب اور تمہارا رب ہے اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے) اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ پروردگار تعالیٰ کی عبادت ہی سیدھا راستہ ہے اور سیدھی راہ یہی ہے۔ کوئی اس کے سوا اور سیدھی راہ نہیں۔ اس سے الگ جو راستہ ہے وہ دوزخ کی طرف لے جاتا ہے۔ جہنم کے راستہ میں بہت سی آفتیں پیش آتی ہیں۔ منزل مقصود تک پہنچنا خوف و خطر میں آ جاتا ہے یہ راستہ چلنے والا یا تو بہت جلد ہلاک ہو جاتا ہے، یا اتنی دور آ پڑتا ہے کہ اس کے لئے سیدھی راہ کی طرف لوٹنا مشکل و ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی آگ کے راستہ میں چند قدم چل کر پلٹ آیا، سیدھے راستہ پر لگ گیا، منزلِ مقصود کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ بچ گیا اگر کوئی اس آگ کے راستہ میں اپنے آپ کو لگائے رہا، آگے بڑھ گیا، گمراہ اور پریشان ہو گیا تو اس کا انجام ہلاکت کے سوا نہیں۔ جو لوگ اس راستہ سے نہ چلے وہ بہت پریشان اور گمراہ ہو گئے۔ سیدھا سچا راستہ ایک ہی ہے اور وہ سب سے قریب کا راستہ ہے۔ اس کے دونوں جانب گڑھے غار، پیچ دار، بے تکے راستے، پگ ڈنڈیاں بہت سی پیدا ہو جاتی ہیں جس میں انتہائی پھیر دچکر ہے جو کوئی اس پگ ڈنڈیوں پر چلا جاتا ہے وہ منزل مقصود سے دور ہوتا جاتا ہے۔ جو کوئی ہمیشہ سیدھے راستہ پر سیدھی طرح سے چلا کرتا ہے اِدھر اُدھر، داہنے بائیں نہیں مڑتا کسی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتا، چکر اور پھیر میں نہیں پڑتا وہ سعادت مند ہے۔

اس کی عاقبت بخیر، زندگی اچھی ہے۔ وہ پہلے ہی سے بہترین، سعادت و نیک عاقبت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا خاتمہ خیر کے ساتھ ہوگا۔ کسی کے کام میں رہنے کے بعد کوئی خلل یا فتور اس میں آجانے سے استقامت کا راستہ اس کو نہ ملا تو یہ بڑی مصیبت کی بات ہے۔ خدا کی پناہ میں آتا ہوں ایسی حالت و صورت سے کیونکہ ایسا شخص ہرگز سیدھی راہ کی طرف نہ تو رخ کر سکتا ہے نہ اس میں آسکتا ہے بلکہ نقصان و تباہی کی گھاٹی میں راستہ بھٹک جاتا، ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور اگر لوٹ بھی آئے تو اس سیدھی راہ کی طرف لوٹ آنے کا راستہ بہت دور کا راستہ ہو جاتا ہے۔ مشکل سے اس کو راستہ ملتا ہے۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ سیدھے راستہ پر کبھی آئے گا بھی یا نہیں۔

سلامتی کے راستہ پر چلنے اس راستہ کا ارادہ کرنے والے کے لیے سب سے پہلی شرط احتیاط، پرہیزگاری ہے۔ ہر ہر قدم پر ہوشیاری کے ساتھ چلنا، راستہ دیکھتے رہنا، اور قدم پر نظر رکھے ہوئے رہنا لازمی ہے تاکہ ٹھوکر نہ کھا جائے۔ راستے سے بھٹک نہ جائے قدم کہیں اور نہ پڑ جائیں۔ یہی بات ہے کہ اس راستہ کے چلنے والے معذرت، توبہ و استغفار، عذرخواہی میں ہر دم ہر وقت لگے رہتے ہیں۔

توبہ کے معنی گناہ ترک کرنے عبادت و معبود کی طرف رجوع ہونے اور سب سے منہ پھیر لینے کے ہیں۔ یعنی غفلت دور کرکے ہوشیاری میں آجانا امر و حکم کا قبول کر لینا، اس پر چلنا اللہ کی طرف توجہ لگائے رہنا ہے۔ استغفار کے معنی :۔ چھپنے کی طلب، اور چھپنا ہے۔ تاکہ نور و رحمت اس سیاہی کو جو گناہ کے کرنے سے آگئی ہے، اور وہ کالا دھبہ جو دل پر بیٹھ گیا ہے اس کو اپنے

آپ میں چھپالے اس کے اثر کو زائل کر دے۔ استغفار، معذرت کرنا، عذر پیش کرنا جس زمانے میں راستہ سے بھٹک گیا۔ اس سے پھر لوٹ آنا ہے جس کسی سے طریقہ استقامت سلوک میں جو وقفہ آیا ہو اس کے بارے میں عرض و معروض کر کے معاف کرا لینا ہے۔ نئی روشنی کی طلب میں ہو جانا اور رہنا چاہئے اس راستہ کے چلنے والے اور اس طلب میں رہنے والے کے لئے لازم ہے کہ یہ کبھی خیال تو بہ سے بے فکر نہ ہو جائے۔ ہمیشہ تو بہ و استغفار کرتا رہے اپنی اختیار سے باخبر اپنی منزل مقصود کی دوری نزدیکی سے آگاہ رہے۔ تاکہ نفس کو غفلت کی عادت نہ پڑ جائے اور وہ نڈر ہو کر، داب و اثر کے دائرے سے باہر بے فکر بخت امن پایا نہ ہو جائے کہیں اور چلا نہ جائے۔ کہیں گر نہ پڑے اور اس کے لئے وہاں سے واپس ہونا راستہ پر آجانا سیدھی راہ مل جانا مشکل نہ ہو جائے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر کوئی گناہ میں پڑ گیا؛ اس سے اس نے تو بہ کی۔ پھر یکایک گناہ میں گر گیا تو تو بہ و استغفار کرتا رہے ہر روز کم از کم ستر مرتبہ استغفار کرتا رہے۔ کرنے نہ کرنے پر نفس کو ڈانٹتے جھڑکتے رہے تو بہتر ہے بخلاف اس کے جب کسی نے گناہ کیا، اسی پر مصر (اڑا) رہا تو بہ و استغفار نہ کیا تو وہ رفتہ رفتہ دوسرے گناہوں میں بھی پھنس جاتا ہے۔ گناہ کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ جس سے دل کالا ہو جاتا ہے دل میں سختی آتی جاتی ہے۔ دل سخت پتھر ہو جاتا ہے جب وہ دوری علیحدگی سے تسلی پاتا ہے تو محبت عداوت سے بدل جاتی ہے، علاج پذیر نہیں رہتی۔ ایسے شخص کا ٹھیک راستہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ خَتَمَ وَطَبَعَ (مہر ماردی گئی) کی جو آیت بدکاروں، نافرمانوں، کافروں کے بارے میں ہے وہ اسی مرتبہ کا نام ہے۔

نعوذ باللہ من ذالك (پناہ میں آتا ہوں اللہ کی اس سے) ایسے لوگ شیطان ونفس کی مخالفت ان دونوں سے لڑائی میں غالب نہیں آسکتے ان کے شر سے چھٹکارہ نہیں پاسکتے۔ شیطان ونفس سے چھٹکارا پانے کا طریقہ یہ ہے کہ سچائی اور پوری توجہ کے ساتھ پروردگار کی بارگاہ میں التجا ودرخواست۔ روتے دھوتے ہوئے، عاجزی کے ساتھ کرتے رہنا چاہیئے یہ اس کا نفس اس کی رحمت ہی ہے کہ شیطان حق تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے خود بخود بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ذکر و نماز میں رہنے والوں پر اس کا قابو نہیں چلتا۔ خلوص کے ساتھ عبادت کرنے والوں پر اس کا قبضہ نہیں۔ وہ ایسے حضرات سے عاجز آجاتا ہے لیکن نفس ایسی بُری بلا ہے کہ وہ ذکر سے مزہ، لذت، نصیبہ اٹھاتے ہوئے بھی اپنے کام کرتے رہتا ہے کبھی مجبور ولاچار نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو صرف حق کی مدد و استعانت، دعا، طلب مدد سے، پروردگار کی عزت وکبریائی تعالیٰ شانہٗ کے کرم سے اللہ ہی توفیق دینے والا راستہ پر چلانے والا ہے۔ (چھبیسواں مکتوب)

مکتوب (۶۱)

فقر و غنا

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

عاقبت بخیر ہو۔ دعا سے گفتگو شروع کی گئی آداب ورسوم کا پورا کرنا تکلف سے خالی نہیں۔ ہر قسم کی باتوں کے اردگرد گھوما۔ طریقہ تحریر تلاش کیا۔ کوئی چیز سب سے زیادہ بلند، کام آنے والی۔ دعا کے سوانہ پائی اس لئے دعا دی۔

یہ دعا وہ ہے جو ساری دعاؤں کا نچوڑ ہے سب سے زیادہ پسندیدہ بہترین چیز یہی ہے کہ عاقبت بخیر ہو۔ آمین۔ آمین۔

کسی کی تعریف و توصیف کسی مکتوب میں ہو تو تعریف و توصیف کرنے والوں پر زمانے کی خاک دُھول اُڑتی ہے۔ شوق و اشتیاق کا بیان ہو تو اس سے بڑھکر کوئی اور جھوٹ نہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جن کے حال کے مسکن اور طبیعت کے موطن میں عشق کا جنون اور وہ لوگ جن کے سارے اوقات کا سرمایہ وحشت۔ ایسے ہی لوگ ایک دوسرے سے ملنے کے شوق کا اظہار مل بیٹھنے کی مسرت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے تک نہیں کہ اس کے سوا بھی ایک چیز اور ہے اُس سے اس میل جول کا خیال تک نہیں رکھتے یہ درست ہے کہ دوستوں کی محبت باقی تو ہے۔ لیکن ملاقات کی فرصت اور وقت میں اس قدر گنجائش کہاں کہ ایک سے دوسرے کا دل ٹھنڈا ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر کے لئے دل کی آرزو نکل جائے۔ مدعا برآجائے یہ بات اس مختصر دنیا میں میسر نہیں ہوتی۔ قیامت میں۔ اگر یہ میسر یا نصیب ہو۔ ایک ہی جگہ ٹھہرنے۔ اترنے کا اتفاق ہو جائے تو وہی فراغت و فرصت کی ایک جگہ ہے جہاں پہنچ کر اذھب عن الحزن (اٹھا لیا گیا۔ ہم سے رنج و خوف) وہ ایسی باغ و بہار کی جگہ ہے کہ جہاں بھائی بھائی مقابل تختوں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ وہاں بڑے مزے کی صحبت انتہائی لطف کی ملاقات رہے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (وہ ہر چیز پر قادر ہے) ہر چیز اس کی قدرت کے دائرہ میں ہے۔ آج جو کوئی محبت کا تخم دل کی سرزمین میں بوئے گا وہ کل دیکھے گا۔ کہ وہ کیسے کیسے گُل کھلاتا۔ کیا کیا پھل لاتا ہے چنانچہ کسی کا کہنا ہے کہ دولت کا بیج زمین میں بونا جس کو وہ فضول و بیکار سمجھ پن

سمجھتا تھا وہ بے کار نہ تھا بلکہ وہ ایسی کھیتی تھی کہ اس نے ایک دانے سے ہزار دانے دیئے ۔ اس دنیا کے باغ و بہار میں اگر کوئی جنت ہے تو وہ دوست یا ان دوستوں کے ساتھ رہنا ہے جس کے تصور ہی سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے ۔ ملنے جلنے، رہنے بسنے میں جو لطف ہیں وہ بیان میں کیسے آسکتے ہیں اس سے بھی بلند تر ایک اور جنت ہے اس کے دروازہ کے کھلنے کا وقت اور ٹھنڈی محبت کی خوشبو دار ہوائیں چلنے کا زمانہ، جو اس کی طرف سے آتی ہیں وہ صبح کا سویرا ہے ۔ اگر آدھی رات کے وقت آجائیں تو وہ خود تنہائی کا وقت بہترین نزدیکی ہے جہاں دوسرے کی شرکت ہی نہیں۔ اس باغ کے پھول اس جنت کے میوے توجہ مناجات مشہود کے انوار ۔ باقی کی وجہ کا شہود۔ انس کے جھونکے ۔ ذوق وحضور کے آثار دل کی بیداری وقیتہ آرام و راحت اور دل کا اطمینان ذکر کی نورانیت ہے۔

مشائخ قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ۔ اس دنیا میں جنت کی لذات کا جو نمونہ ہے وہ صبح کے وقت کا ذوق ۔ خوشامد ۔ عاجزی ہے ۔ بادشاہی کھانے ۔ بہترین شاہی لباس ۔ اچھے اچھے باغ، خوبصورت مکانات، حسین صورتیں، سریلی آوازیں کو بھی جنت کا نمونہ کہا گیا ہے حقیقتاً جنت وہ ہے جہاں آرام ہی آرام راحت ہی راحت ہو ۔ یہاں تو محنت ہی محنت ۔ تکلیف ہی تکلیف ہے ۔ دنیا کی ہر لذت کے ساتھ رنج دکھ ۔ درد ۔ تکالیف بھی ہیں ایک تکلیف ایک رنج سے زیادہ دوسری تکلیف دوسرا رنج پیدا کیا گیا ہے ۔ ایک رنج و تکلیف کے دور کرنے کے لئے اور ہی رنج اور ہی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے ۔ ایک رنج ۔ دور ہو جائے تو دوسرا کھڑا ہو جاتا ہے ۔ مزاج نفس و مذاقِ طبیعت میں یہ بات محسوس و معلوم ہوتی ہے ۔ مثلاً بھوک

ایک تکلیف ہے۔ کھانا کھانا ایک تکلیف جس کے لئے سارے اسباب ساری مشقتیں، غلہ برتن بھانڈہ وغیرہ مہیا کرنا پڑتا ہے آخر یہ سب تکالیف ہی تو ہیں یہ کسی رنج و مشقت کے بغیر فراہم نہیں ہوتے۔ ایک تکلیف کیا صدہا تکالیف ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ رنج میں رنج دکھ میں دکھ ہے۔ جب کچھ کھا لیتے ہیں تو بھوک کی آگ کم ہو جاتی ہے طبیعت آرام پا جاتی ہے تو اس کو لذت کہتے ہیں۔ اور اگر حقیقت پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تکلیف ایک تکلیف سے دور کی جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو جس کا پیٹ بھرا ہو وہ بھوکا پیاسا نہ ہو اس کو کچھ کھلائیں پلائیں تو یہی کھلانا پلانا اس کے لئے عذاب ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ کوئی تکلیف اس کے لئے نہ ہوگی۔ اس طرح کی اور حالتوں کو بھی عام بول چال میں لذت ہی کہتے ہیں دوسری حالتوں کو اسی پر سے قیاس کر لینا چاہیئے کیا اچھی جوانمردی اور کیا اچھا جوانمرد وہ ہے جس نے حقیقت کو سمجھا۔ دنیا اور اس کی متاع کو حقیر اور اس کے فنا ہونے کو ذوق سے پا لیا۔ جسمانی و شہوانی لذات سے نکل کر روحانی لذت کی دریافت پر اپنی نظر و عقل کو اعتبار کے ساتھ لگا دیا۔

دو قسم کے لوگوں کو دو طرح سے یہ نسبت حاصل ہوتی ہے:۔ (۱) فقرا کو صبر کرنے، حرص کے روکنے۔ طمع کے دانت کھٹے کر دینے۔ دنیا کی چیزوں سے جو ظاہری آرائیش ملمع کی ہوئی ہیں جس کا ظاہر اچھا باطن خراب ہے، قطع نظر کرنے۔ اس کی طرف متوجہ نہ ہونے۔ ان سے دل نہ لگانے۔ ان کی طرف توجہ التفات نہ کرنے سے کمال کو پہنچکر اللہ کے مظہر (جائے ظہور) ہو جاتے ہیں۔ (۲) اغنیا (دولتمندوں) کو شکر اور سخاوت کرنے ہمت کے بازو

قوی رکھنے۔ حق تعالیٰ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لیے ثابت قدم رہنے میں ہے تاکہ شکور کے خزانے کے طلسم ہو جائیں (اس کی عجیب غریب صورت ہو جائیں) اس میں شک نہیں کہ فقیر توجہ و التفات نہ کرنے اہل دنیا سے نیازمندی نہ برتنے دنیا کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے سے جو بہت ہی حقیر و بے مقدار چیز ہے غنی رہتا ہے، غنی اپنے بلند ارادے۔ سب کے کام نکالنے مال و دولت ہونے کے باوجود اس سے بے تعلق الگ ہونے۔ فقیری کو دوست رکھنے سے فقیر ہے۔ جامعیت اصلی چیز ہے باقی جو ہے وہ بیکار فضول حقیر بے مقدار ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ صبر و شکر ایک دوسرے کے ضمن میں ہی نہیں بلکہ لازم و ملزوم ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں۔ جو حکایت ہم پڑھ چکے ہیں اس میں فقر و غنا عین یک دگر ہیں۔ یعنی یہ اس کا عین وہ اس کا عین ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ فقیر صابر کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے یا غنی شاکر کا صبر کرنے والا فقیر بہتر ہے یا شکر کرنے والا دولتمند۔

(۱) جو لوگ فقر کو فضیلت دیتے ہیں۔ بزرگ ٹھہراتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ سلامتی بچاؤ اسی میں ہے۔ سچ ہے سلامتی امن بچاؤ ہی بہترین چیز ہے اس کے برابر اور کوئی چیز نہیں۔ ایک بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ خدا کرے ایسا ہو کہ آدمی کے ناخن اتنے بڑھ جائیں کہ وہ اپنے بھائی مسلمان کا پیٹ پھاڑ دے۔ بھوکا کبھی پیٹ بھر کھائے ہوئے۔ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ سرکشی اس سے نہیں ہوتی فرعونیت۔ نمرودیت اس کے سر میں پیدا نہیں ہوتی انڈے بچے نہیں دیتی۔

(۲) جو لوگ غنا (دولتمندی) کو فضیلت دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ غنی (دولتمند) سے بہت سارے کام ہوتے ہیں رکی ہوئی چیزیں باتیں اور کام نکل جاتے ہیں یہاں فقیر کی رسائی نہیں۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتے۔ وہ

ادھ موا اس کی خبر بھی نہیں رکھتا یہ ایسی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا دیتا ہے۔ یہ پچھلے لوگوں کی کہی ہوئی باتیں ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس تصفیہ سے یہ کلیہ ثابت نہیں ہوتا عام نظریہ نہیں بنجاتا۔ اس سے یہ تک نہیں معلوم ہوسکتا کہ کس کی کیا بہتری اور کس کی کیا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کہد بجئے کہ ہر ایک اپنے اپنے ڈھب پر عمل کیا کرتا ہے۔ پس آپ کا رب جانتا ہے کہ کون سیدھا راستہ لیا ہوا اس پر عمل کئے جارہا ہے۔ فقر کا سوز جس کو بنا دیتا ہے دولت کے دائرہ سے باہر لے آتا ہے' اس کے لئے فقر ہی مبارک ہے دولت جنھیں اعتدال کے راستہ پر لے جاتی ہے۔ توفیق کو رفیق کردیتی ہے۔ اس کے لئے دولت ہی مبارک ہے۔

حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے متعلق یہ فرمایا کہ جب تک انھوں نے ہم سے اس امر کا دلی اعتقاد' زبانی اقرار نہ لے لیا کہ فقر کو سب پر فضیلت ہے ہم کو قبول کرنے کے متعلق زبان تک نہ ہلائی۔ ہمیں توبہ نہیں کرائی۔ اپنی مریدی میں داخل نہیں کیا۔ ہم اسی اعتقاد پر ہیں تواضع وانکسار اس میں ہے کہ غنی فقیر کو اپنے سے بہتر جانے۔ اور فقیر غنی کے مرتبہ کو اپنے مرتبہ سے اونچا سمجھے۔ تاکہ کسی میں میں پن (برائی) نہ آئے۔ اگر انصاف کے راستہ پر چلیں تو سچی بات یہی ہے۔ ہر ایک کی عاقبت کا حال مبہم ہے۔ (معلوم نہیں کیا ہوگا) جو کوئی ایک بھید (چھپی ہوئی حقیقت) اپنے پرودگار سے رکھتا ہے۔ وہ اور ہے۔ ہر ایک کو اپنا اپنا سرمایہ پیش کرنا ہے معلوم نہیں اس کی بارگاہ میں کسی کی کرنی قبول ہوتی ہے۔ امید و بیم (خوف و رجا) کے درمیان ہیں۔ ایک راستہ رکھ چھوڑا ہے۔ جہاں حیرت کے سوائے اور کچھ کام نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بندہ کے لئے ماننے۔ گردن جھکانے کے سوا

چارہ نہیں۔ یہ خوب سمجھ رکھو۔ اللہ سخت پکڑنے والا۔ رحم کرنے والا ہے آخری بات رحم کی ہے انجام رحمت ہی پر ہے اور ہو جائے۔ والسلام

(چودھواں مکتوب)

مکتوب (۷)

ضعیفی۔ کمزوری

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اللہ ہی ہے جس نے بنایا تم کو کمزور، پھر کمزوری کے بعد زور و قوت دی پھر دے گا زور و قوت کے بعد کمزوری بوڑھا بناتا ہے جیسا کہ چاہتا، جو چاہتا ہے وہ سب کو جانتا اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ آدمی، پیدا ہونے کے مراحل تخلیق کے مدارج یعنی نطفہ سے جنین (پیٹ میں بچہ) کا بننا۔ اس کا صورت لینا، ظاہر ہونا۔ ظہور میں آنا۔ صورت عناصر سے شکل و صورت میں آنا جسم و جسمانیت لے لینا، سب طے کرنے کے بعد دنیا میں جو جھگڑے فساد کی جگہ ہے جب آتا ہے تو اس کو تین زمانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ جس کے تین مراتب و مدارج ہیں جن کو بچپن، جوانی، بوڑھاپا کہتے ہیں۔

پہلا مرتبہ یا درجہ بچپن کا ہے جس میں وہ بہت ہی کمزور رہتا ہے اس کے لئے جسمانی و روحانی کمالات کا حاصل کرنا اس سے لذتیں لینا ناممکن و محال ہے اس مرتبہ میں جو خوبی رکھی گئی ہے وہ یہ کہ عقل کی کھینچ تان۔ سمجھ کی جکڑ بندیوں سے آزاد احکام شریعت کے موافق کرنے نہ کرنے سے فارغ رہتا ہے۔ زمانہ، ابد سے قریب، اور وجود میں آنے کی مدت کم ہونے۔ عدم سے مناسبت ہونے سے پختگی اور طبیعت کے ظاہری کے لحاظ سے غفلت و بے فکری میں رہتا ہے۔

عقلمند لوگ اس زمانے کی تعریف کرتے ہیں۔ اس گذرے ہوئے زمانے کو یاد کرکے آرزو کیا کرتے ہیں کہ کاش وہی بچپن کا زمانہ وہی ہمارا حال رہتا۔ تو کیا اچھا ہوتا اس محنت و حیرت کی چکر میں نہ آتے' اپنے میں آپ مگن رہتے۔ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ عقلمندی سے پہلے جو مرتبہ تھا وہ غفلت کا تھا اسی غفلت اور بے فکری میں رہنا ہمیں پسند ہے۔ وہی فراغت کی زندگی مطلوب ہے کیونکہ اس عقل سے وہ غفلت و بے فکری بدرجہا بہتر تھی۔

دوسرا مرتبہ یا درجہ جوانی کا ہے یہ عمر کا خلاصہ اور بہترین زمانہ ہے۔ اس میں جسمانی قوتیں اعتدال کے ساتھ رہتی ہیں سمجھنے اور ہر چیز کے پانے کا شعلہ بھڑکا ہوا تیز ہوتا ہے' کمال حاصل کرنے کی استعداد زوروں پر ہوتی ہے اپنے آپ کو بہتر بنانے کی قابلیت اس میں رہتی ہے۔ ہر کام کرنے کی سکت اور اپنے کردار کو بنانے کا خاصا موقع حاصل رہتا ہے۔ عموماً آفتاب اپنے عروج پر آدھے دن کے وقت کو کامرانی و استواری سے لئے ہوئے ہوتا ہے اس زمانے میں اگر نیک بختی کی توفیق رفیق ہو جائے تو ہر کام کرسکتا اور ہر بار اُٹھا سکتا ہے۔ اگر کام کرنے کی توفیق مِل جائے تو مراد و مقصد پالیتا ہے اگر مراد و مقصد ہاتھ بھی نہ آئے تو محض اس ایک کام کے کرنے میں جو امید کی جھلک پوشیدہ ہے وہ دل کو تسلی اور خیال کی قوت کو ذوق دیتی رہتی ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ مجھکو تجھ سے ملنے کی اُمید زندہ رکھے ہوئی ہے۔ ورنہ میرے لئے مرنے کے سَو راستے اور ڈھب ہیں اس جوانی کے زمانے میں اگر غفلت و لاپروائی طاری ہو جائے تو لاپروائی و غفلت کے آجانے سے "جہالت" "غلط خود فہمی" کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ غفلت و جہالت کی چکر میں آجانے دن رات دنیا کے دھوکے فریب میں گھر جانے سے' ایک سخت اندھیرا اس کو

چھا جاکر اس کی عقل و ہوش پر کچھ ایسا پردہ پڑھ جاتا ہے کہ اس میں کچھ سوجھ بوجھ نہیں رہتی۔ سننے دیکھنے، عبرت لینے سے غافل، جاہل، سوچنے سمجھنے سے عاری، تدبیر، تحصیل سے بے بہرہ رہ جاتا ہے۔ دنیاوی کاروبار سے خواب غفلت میں مست ہوکر گھمنڈ وغرور کے بھنور میں آجاتا ہے۔ غور کرکے کسی نتیجہ پہنچنے نہیں پاتا۔ جوانی کی رات جب بڑھاپے کی صبح میں تبدیل ہو جاتی ہے تو اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا زمانہ ایک ہی سانس میں گذر گیا۔ کسی کا کہنا ہے کہ اگر سالہا سال وصل کی رات ہو ایسا موقع مل جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مغرب بھی نہ ہوئی تھی کہ صبح ہوگئی۔ بڑھاپا آگیا۔ ایسی بیماری لگ گئی، جس کی کوئی دوا، کوئی علاج نہیں۔ کمزوری، ناطاقتی کی سینکڑوں صورتیں پیدا ہوگئیں ناتوانی کمزوری جو پیدا ہوگئی وہ ابتدائی زمانہ یعنی بچپن، ضعف لاچاری۔ کے جیسا دکھلائے دینے لگتا ہے لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے) بچپن میں کمزوری کم ہوتی جاتی اور قوت بڑھتی جاتی ہے۔ ہر دم نئی تازگی آتی رہتی ہے بخلاف اس کے ضعیفی میں قوت گھٹتی اور کمزوری بڑھتی جاتی ہے اور امید کی پیٹھ (ریڑھ) ٹوٹ جاتی ہے۔ طلب کا قدم بندھا ہوا ہوتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "جنھیں عشق کی جکڑ میں جکڑ دیتے ہیں، نوجوانی میں بھی ان کی دستگیری کرتے ہیں سینکڑوں لاعلاج ناتوانیاں وکمزوریاں ہیں جن کے مجموعہ (ایک جگہ جمع ہونے) کا نام بڑھاپا رکھدیا گیا۔ پناہ میں آتا ہوں اللہ کی بڑھاپے کی برائیوں سے اور ارذل ترین عمر سے"۔

اس تحریر و تمہید سے اپنے حال کی حسرت کا اظہار ہے۔ کچھ عجیب وقت سامنے آگیا ہے عجیب قدرت ہے۔ نئی حیرانی رونما ہوگئی ہے۔ بچپن نہ رہا جوانی گذر گئی۔ جو مراد تھی وہ ہاتھ نہ آئی۔ دل کی گرہ نہ کھلی مقصد ہاتھ نہ آیا۔

نہ مراد بر آئی۔ ہائے رے ہائے کیا تھا۔ کیا دکھلائی دیا۔ یہ خواب تھا، یا خیال تھا، یا سراب تھا جو پانی دکھلائی دیا۔ کسی نے خوب کہا ہے "جوانی ختم ہوگئی زندگی نہ رہی۔ دنیا رہے تو رہے جوانی تو نہ رہی۔ جوانی آدمی کی خوبی ہوتی ہے۔ جب خوبی جاتی رہی پھر خوشی کس بات کی۔" میں تو یہ جانتا ہوں کہ میرے لئے دو ہی زمانے تھے۔ ایک بچپن دوسرا بڑھاپا۔ جوانی کب آئی، کب گئی۔ وہ ایسی ہے جیسا کہ "حال" کہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ کب آیا۔ کب گیا معلوم نہیں ہوتا۔ نظر تحقیق میں اس کی کوئی بود ہی نہیں۔ (وہ ہے ہی نہیں) جو کچھ ہے ماضی یا مستقبل ہے۔ حال دونوں کو شامل ہے مطلب یہ کہ وہ ہے نہ یہ ہے۔ البتہ اس کے رُخ دو ہیں جو ماضی و مستقبل کہلاتے ہیں۔ تمام عمر ریاضت و مجاہدہ میں گذر گئی محنت و ناکامی میں بسر ہوئی یہ سچ ہے۔ "میں یہ نہیں جانتا کہ زندگانی کیا ہے؟ مطلب کا حصول کیا اور جوانی کس کو کہتے ہیں؟ خوشی کا زمانہ کس کو کہتے ہیں؟ دنیا میں جس کا دل خوش ہوا اس کو کہاں ڈھونڈیں؟ دل کے مطلب کا ملنا کیا ہوتا ہے؟ دنیا میں کامیاب کون ہے؟ جس نے مقصد کا چہرہ دیکھا؟ ایسا کون ہے اس کو اللہ ہی جانتا ہے؟"

جوانی کے دن بہترین دن تھے ان دنوں میں تھوڑے سے کام بھی کرنے کی توفیق نہ پائی جس نے بڑی بڑی اُمیدیں باطل آرزوئیں۔ محال و ناممکن خیالات جھوٹے وعدے۔ اپنے دماغ میں وقتیہ طور پر تر و تازہ رکھے۔ وہ اب کس کے ساتھ دل لگائے۔ اور کس سے اپنے دل کو تسلّی دیا کرے۔ جس راستہ سے بھی گیا اور جس جگہ بھی ٹھہرا رہا۔ مقصود کا چہرہ نہ دیکھا۔ محبوب کا وصل نہ پایا اگر محبوب اگلی منزل میں ہے، سامنے ہے تو چلنے کی سکت والے پاؤں کہاں، سفر کی ہمت کس میں کہ منزل تک پہنچ جائے۔ اسی جگہ اسی راستہ میں ٹھوکر کھاکر

گر پڑا۔ دل کو مرنے، ہلاک ہونے میں لگا دیا۔ دُوری سے سامنا ہوگیا توڑنے لگ گیا کہ اپنے مطلوب کو پہنچ جائے۔ اگر وہ اپنے گرے ہوئے، عاجز آئے ہوئے، ــــــ حال والے سے پوچھے کہ جہاں تو ہے کیا وہیں رہنا چاہتا ہے یا اٹھا کر اور ایسے مقام پر لے چلیں جہاں وہ ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے کسی نے یہ کہا کہ وہ آفتاب ہے۔ اس کی جگہ آسمان قدس پر ہے۔ اے دل صبر کر اگر وہ چاہے تو، تُو اس کو پا سکتا ہے۔ تو اپنے آپ سے دوست تک عروج نہیں پا سکتا۔ دوست تیری منزل میں نہ اُتر سکتا ہے نہ آسکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اُمید نا امیدی سے مِل جاتی ہے۔ وہ دل کی تمنا کے بر آنے میں لگ جاتا ہے۔ ابھی طلب کی کھینچ تان جاری ہے۔ محبت کے خطرے اُسی کی اُدھیڑ بن میں ہیں یہ اس وقت تک ہیں ہوتے رہتے ہیں کہ حیات کا آخری مرحلہ (مرتبہ، موقع) آجائے۔ قیامت برپا ہو جائے۔ نہیں نہیں۔ میں نے کہنے میں کوتاہی کی۔ ہمیشہ سے ہمیشہ تک انتہا کی انتہا آنے تک، طلب کا درد، مطلوب سے ملنے کی اُمید بڑھتی جاتی ہے۔ جمال کے دیکھنے کا شوق، وصال حاصل ہونے کی آرزو زوروں پر رہتی ہے۔ ہمارا درد ازلی اور ابدی ہے۔ چنانچہ حسامی کہتا ہے۔ "مسکین حسامی دوست کے فراق میں اور اس کے دیکھنے کے شوق میں بوڑھا ہوگیا۔ قیامت تک انتظار میں آنکھیں اسی طرف لگائے ہوئے ہے کہ وہ نوجوان آئے گا" ــــ اے خداوندا وہ کب آئے گا۔ کیسے اور کس طرح آئے گا۔ کاش آجائے۔ کسی طرح بھی آجائے بہر حال آجائے۔ آ تو جائے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے فقط

(پندرھواں مکتوب)

مکتوب (۸)

اللہ کے حکم کی تعظیم، اللہ کے بندوں پر شفقت

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

التعظیم لامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ (اللہ کے امر کی تعظیم یعنی بزرگی عزت کرنا اور اللہ کے بندوں اور اس کی مخلوق پر شفقت یعنی مہربانی ان سے نیک سلوک کرنا) دین کے یہ دو شہپر اور بازو ہیں۔ اس قوت کے بغیر بندے کا مولیٰ تعالیٰ کی نزدیکی اور اس کی رضا میں پہنچنا محال ہے اس طریق کے سالکوں میں اسی قوت کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے۔ سیر کی تیزی، سلوک کی تقویت، مکان وزماں کی طے، حق تعالیٰ تک پہنچنا، اسی قوت کے اندازے اور انہی دو کے قوی ہونے پر منحصر ہے۔ جن کے یہ دونوں بازو یعنی دونوں بہت قوی ہوتے ہیں ان کے لئے مقام قرب میں پہنچنا آسان ہونے سے ہو جاتا ہے ہم نے جو انھیں شہپر و بازو کہا ہے وہ اس لئے کہ ان کے ہونے سے سلوک میں تقویت اور تیزی آجاتی اور اس وساطت (ذریعہ) سے بہت جلد پہنچ کر سلوک کے مقامات طے کر لیتے ہیں۔ ان دو صفت کے ہاتھ آنے، عنایت و توفیق الٰہی کی مدد رہنے کے بعد ایسا مرتبہ نصیب ہوتا جس سے سیر و طیر میں بعض پرندوں کی طرح اڑکر، پلک جھپکنے تک دور دور تک چلے جاتے ہیں۔ ایک گھڑی ایک پل میں وہاں پہنچتے ہیں جہاں دوسروں کو پہنچنے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے اور مجاہدہ و قوت کے باوجود بھی وہ وہاں نہیں پہنچ سکتے ہے

مردان حق ببال محبت چو بر پرند ۔۔۔ اول قدم بہ کنگرہ عرش جا کنند

(اللہ والے محبت کے بازو سے جب اڑتے ہیں تو پہلی اڑان میں عرش کے کنگرے پر جگہ بناتے ہیں۔

پہلی صفت التعظیم لامر اللہ (اللہ کے حکم کی تعظیم یعنی بزرگی رکھنا، بزرگی ماننا ۔۔۔۔۔۔ اس کی رعایت مقدم لازمی اور اہم ہے۔ نزدیکی حاصل کرنے کا یہ بہتر ذریعہ اور وسیلہ ایسا ہے جیسا کہ سیدھا ہاتھ جو مضبوط قوی کارآمد ہوتا ہے جس سے ہر کام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اس سے عمل پر قدرت آجاتی ہے اور بازو قوی و استوار ہو جاتا ہے۔

دوسری صفت الشفقة علیٰ خلق اللہ (اللہ کی مخلوق پر شفقت مہربانی) کی نسبت حاصل کرنا، محبت کا رشتہ جوڑنا فیض و رحمت کا پانا ہم جنسی اور جنسیت کے علاقہ و تعلق کی رعایت کرنا، انصاف کا راستہ طے کرنا، انصاف کرنا، مولیٰ تعالیٰ کی شکر گذاری میں رہنا بہت بلند مرتبہ اعلیٰ مقام ہونے کے علاوہ سلامتی فطرت۔ بلندی ہمت ذکاوطبیعت کی دلیل ہے۔ دنیا و آخرت میں اچھے بدلے اچھے ذکر، خوشنودی و رضا مندی حق تعالیٰ کا سبب و ذریعہ ہے

التعظیم لامر اللہ کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ اسلام کے کلمہ کا بلند کرنا۔ دین و ملت کی تائید و مدد کرنا اس کو مضبوط و مستحکم کرنا ایسی شان ایسا مرتبہ ہے جو سب مرتبوں سے بالاتر ہے حقیقت یہ ہے کہ بارگاہِ عزت، درگاہِ نبوت میں قبولیت کا کوئی کام ہو سکتا ہے۔ تو وہ یہی صفت ہے اس سے بلند تر کوئی اور صفت نہیں۔ دین کی تقویت ملت کی ترویج اس کی تائید میں کوشش کرنا، انتہائی کوشش اس کام میں کرنا، خود کو اس میں کھپا دینا، اس میدان میں جہاں لشکر کا پڑاؤ ہے اس میں خود کو شریک کرنا گنتی میں اضافہ کر دینا ہے اللہ کے حکم کی تعمیل عزت و بزرگی کے ساتھ

کرنا، شریعت ہے۔ اس نے جو کچھ کرنے کا حکم فرمایا ہے اس کو کرتے رہنا اور جس کو نہ کرنے کا حکم فرمایا ہے اس کو نہ کرنا، اس کے احکام کا احترام کرنا، خود اس پر چلنا اوروں کو چلانا یہی راہِ رضا ہے۔ شریعت اسلام کے بنیادی رکن دو ہیں (۱) حکم کا ماننا کرنے کا کام کرنا۔ (۲) منع کئے ہوئے کام نہ کرنا۔ ان ہی کو اوامر و نواہی کہتے ہیں۔ یہ دونوں بھی سلوک میں داخل اور بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ حق کے راستہ کا سلوک اور مقام قرب میں پہنچنا انہی دو پر منحصر ہے۔ امر کی بجا آوری، اس کی ادائی کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بیمار کے لئے دوا کھانا، پرہیز کرنا اگر دوا نہ کھائیں پرہیز نہ کریں تو ہلاکت کا اندیشہ قوی ہے اگر صرف دوا کھائیں پرہیز نہ کریں تو کیسی ہی اچھی دوائیں شفا دینے والے ہوں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ شفا نصیب نہیں ہوتی۔ تندرستی ہاتھ نہیں آتی اگر دوا کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی کریں اور پرہیز کی رعایت میں مبالغہ کریں تو صحت کی قوی اُمید رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ دیر میں صحت و تندرستی ملے مگر ملنا اور ہونا ضروری ہے۔ پرہیز کے بغیر دوائیں اثر نہیں کرتیں۔ بیماری دور نہیں ہوتی۔ دوا نہ کھائیں صرف پرہیز ہی کریں تو بیماری نہیں جاتی کمزوری بڑھتی جاتی ہے، دوا بھی پرہیز بھی ہو۔ دونوں ایک ساتھ ہوں تو کام بن جاتا اور بہت جلد شفا ہو جاتی ہے

مشائخ طریقت قدس اللہ تعالیٰ اسرارھم نے فرمایا ہے کہ تقویٰ میں مبالغہ اور انتہائی کوشش کرنی ضروری ہے۔ حرام مکروہ، شبہ کی چیزوں اور شبہ کے کاموں سے بچنا لازمی ہے۔ تقویٰ (پرہیزگاری) خدا کا خوف خدا کے فرمانے کے مطابق کام کرنا، منع کئے ہوئے سے پرہیز کرنا سلوک

کے لوازمات سے ہے۔ سچ ہے کہ تقویٰ و طہارت بڑا کام ہے مقام قرب کے حاصل کرنے میں صرف فرائض، واجبات، سُنن، مستحبات پر ہی اکتفا (بس) کر لیں، نوافل و عبادات کی کثرت میں کوشش نہ کریں تو اس قدر حصول مقصود کے لئے کافی ہے۔ نوافل و مستحبات کی کثرت ہو، حرام او رمنع کی ہوئی باتیں اور کام کرتے رہیں، تو یہ کثرت نوافل، مستحبات کارآمد نہیں ہوتی۔ اس سے کام نہیں بنتا۔ فرائض کا ترک، اس میں کچھ کا کچھ کہنا، نفل کی پابندی کی تاکید اس میں مبالغہ اور انتہائی کوشش کا حکم دینا، یہ نفس کا غرور شیطان کا فریب ہے۔ اسلام کا حاصل شریعت اسلامیہ کی اولین شرط یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی عزت و احترام ملحوظ رکھنا، پابندی کے ساتھ ادائی کرنا، فرائض کو اولیت و تقدم دینا، اس سے اس کے احکام سے محبت رکھنا، اس کے فرمائے ہوئے کو کرتے رہنا ہے۔ منع کئے ہوئے سے بچتے رہنا۔

اللہ کے امر کی تعظیم کرنے رکھنے کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے جو اشارے فرمائے گئے ہیں ان کا سمجھنا نہایت ضروری ہے عمل تقویٰ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی طاقت کے لحاظ کرتے جسقدر عزت و عظمت، بزرگی خدا کے احکام کی کر سکتے ہیں کرنا، عزت و عظمت کا ملحوظ رکھنا، انتہائی تعظیم کے ساتھ ادا کرنا، اصول و قواعد شریعت میں اہل دین، اہل نسبت ہیں ان کی بزرگی اعزاز و احترام کرنا، اور ان حضرات کا بھی جو حضرت نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقبولوں میں سے ہیں پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے ان کو بُرا نہ جاننا، ذلیل نہ سمجھنا، نیچی نظر سے نہ دیکھنا لازمی ہے ان کی طرف جس قدر التفات ہو سکتا ہو کرنا۔ ان کا اعتبار کرنا لوازمات دین سے ہے۔ بخلاف اس کے ان لوگوں کا جو بدعتی، گمراہ، بے دین، برائیوں میں ہوں ان کو ان کے کاموں اور باتوں کو بُرا سمجھنا ضروری اور لازم ہے کیونکہ وہ اس بارگاہ کے مردود (دور بھگائے ہوئے)

ہیں۔ اَلتَّعظِیمُ لِاَمرِ اللہ میں یہ اشارہ پایا جانے سے اسی بنا پر ائمہ دین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا کہ ملحدوں، زندیقوں کا قتل کر دینا پیغمبروں کا زندہ کرنا ہے، شریعت و دین ان کا قائم کیا ہوا بنا ڈالا ہوا ہے جس نے ایسے لوگوں کو ذلیل و خوار سمجھا گویا انھیں مار ڈالا اور دفن کر دیا جس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت کی ان کو بزرگ جانا اس نے گویا پیغمبروں کو بقا دی۔ ان کی شریعت کو زندہ رکھا۔ یہ کھلی بات ہے کہ جو جس کسی نے ایسے راستے اور ایسی چلن کو جو خلافِ شریعت ہو، معزز کیا بزرگی دی تو اس نے شریعت کو ذلیل سمجھا، برا جانا، اسکی تحقیر کی جس نے شریعت کی تعظیم کی، عزت دی، بزرگ جانا، اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی عزت و تعظیم کی یہ کہاوت ہے کہ دوست کا دوست، دوست۔ دوست کا دشمن، دشمن۔ مسلمان ہونا یہی ہے۔ باقی جو کچھ دعوے ہیں وہ سب بلا دلیل ہیں، حرام اور جو شرع میں منع ہے، اس میں نیت کا سوال ہی نہیں، کس کی نیت کیا ہے معلوم نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ نیت نیک ہو گی عمل کا اعتبار نہیں یہ غلط ہے۔ واقعہ ایسا نہیں۔ دراصل جو کچھ ہے وہ نیت ہی ہے۔ اس کو ہم مانتے ہیں لیکن ہم ایسی نیت کو نیک کہتے ہیں جس سے نیک کام ہوں نیت نیک ہو کام برے ہوں تو اس سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اور سمجھ سکتے ہیں، وہ یہی کہ جیسی نیت تھی ویسا کام کیا۔ نیت نیک ہو تو نیک کام، بری ہو تو برا کام ظاہر ہوتا ہے، اس کا بھی جاننا ضروری ہے کہ نیکی و بدی شرع کے حکم سے قرار پائی ہے۔ جو کچھ شرع میں فرمایا گیا وہی درست قابلِ تعمیل ہے جس کو اچھا کہا گیا وہ اچھا جس کو برا کہا گیا وہ برا ہے۔ جو شرع کے موافق ہو وہ نیک کام ہے۔ جو شرع کے خلاف ہو وہ برا کام ہے۔ دین کے عقائد میں لکھتے ہیں کہ احسن ما حسنہ الشرع والقبح ما قبحہ الشرع (نیکی وہ ہے جس کو شرع نیک ٹھہرائے، بدی وہ ہے جس کو شرع بری ٹھہرائے) نیک کام وہ ہیں جن کو شرع میں کرنے کا حکم ہوا۔ برے کام وہ ہیں جن کے کرنے سے شرع میں منع کیا گیا۔

شارع (اصحاب شریعت) علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بحکم الٰہی ایک کام کو اچھا ایک کو بُرا ٹھہرا دیا۔ اس میں عقل کو دخل نہیں۔ اس میں کسی کی رائے کو دخل نہیں کسی کا اس میں حکم نہیں چلتا۔ اگر یہ کہیں کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے معقول نہیں تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا کہنا ہی نفس الامر (اصل مدعا) کے خلاف ہے۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ علم، عدل، جود، تواضع اچھی باتیں اور جہل، ظلم، بخل، تکبر، بری باتیں ہیں جن کو عقل سے جان سکتے ہیں اس میں حکم لگانا صحیح بھی ہے شرع کا لحاظ کئے بغیر بھی اس کو ٹھیک طور سے جان سکتے ہیں۔ اگر شریعت نہ ہوتی پھر بھی عقل کا حکم اپنی جگہ پر رہتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ نیکی و بدی کہتے کس کو ہیں۔ نیکی بدی کا قرار داد شرع کے حکم کے لحاظ سے ہے عقل کے حکم پر نہیں۔ نیکی و بدی کے دو معنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ایسی صفت، ہر ایسا کام جو اپنی ذات کے حد میں کمال کا سبب ہوتا ہے لوگ اس کو حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی تعریف یا ان کو بُرا کہنے کا سبب اس صفت یا فعل کے فائدہ یا نقصان کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس اچھے اور بُرے کی تمیز کا معیار محض عقل ہے لیکن ہمارے پاس نیکی و بدی سے مراد وہ ہے جو آخرت میں ثواب یا عذاب کی وجہ ہو جاتی ہے اس کو شرع کے حکم کے سوا نہیں جان سکتے۔ یہاں عقل کا دخل نہیں۔ مثلاً کوئی کام ایسا ہے جس کو لوگ کرتے ہیں کمال جانتے ہیں اگر شرع میں وہ منع ہو تو عاقبت میں عذاب کا سبب ہو جائیگا۔ اور اگر کسی کام کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اور شرع میں اس کے کرنے کا حکم ہو تو وہ عاقبت میں ثواب کی وجہ ہو جائے گا۔ عقل کو اس کی دربانت میں کوئی دخل نہیں، اللہ سبحانہٗ تعالیٰ۔ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو بُرا سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو سکتی ہے اور تم کسی چیز کو اچھا جانیں

تو وہ تمہارے لئے بری ہو سکتی ہے" ایسا بھی ہو سکتا ہے صفاتِ علم عدل جود پر جو بہتری کا حکم لگایا ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ تقدس نے ان کے کرنے اور حاصل کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس کے خلاف کرنے کو موجب عذاب قرار دیا ہے۔ کسی کام کے کرنے سے منع کا حکم ہوتے سے اس کا بدلہ مقرر کیا گیا۔ اگر یہ عقل کی بنا پر۔ برے بھلے ٹھہرائے گئے ہوتے تو ان کے لئے ثواب و عذاب نہ ہوتا۔ عقل یہ کیسے معلوم کر سکتی ہے کہ رمضان کی انتیسویں تاریخ میں کھانا کھائیں۔ روزہ نہ رکھیں تو گنہگار ہو جاتے' عید کا دن ہو کھانا نہ کھائیں روزہ رکھیں تو گنہگار ہو جاتے ہیں۔ یہ شرع کا حکم ہے اس کے سوا کوئی اور بات نہیں۔ یہاں ایک نکتہ ہے۔ اس سے بھی باخبر کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تمام کمالات کے اصول' تمام کمالات کا دار و مدار ساری نیکیوں پر حاوی سب کے شامل' یہی دو چیزیں ہیں ایک صحیح نیت دوسرا صحیح عمل۔ یہ دونوں اگر جمع ہو جائیں تو یہ بڑی نادر بات ہے ان کے جمع ہو جانے سے پوری طرح سے کام پورا ہو جاتا ہے۔ اسلامیت ترقی کر جاتی ہے۔

صحیح نیت یہ ہے کہ جو کام کریں خدا کے واسطے اس کے تقرب کے ارادہ سے' اس کی خوشنودی کے لئے آخرت کے ثواب کی امید میں کیا کریں۔ عام لوگوں میں' درویشوں کے فرقہ میں بھی دو قسم کے گروہ میں اکثر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ملنگ۔ آگ میں جلنے والے' جو دنیا ہی میں آگ کے عذاب میں گرفتار ہیں ننگے رہتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ لعنت کرتا ہے ننگے رہنے والوں اور اس کے دیکھنے والے پر یہ اللہ تعالیٰ کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنے زعم میں اپنے فاسد اعتقاد میں سچی نیت رکھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے قرب کے لئے سلوک کرتے

ہیں۔ خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن ان میں صحیح عمل کہاں کہ جس سے مقصد کو پہنچ جائیں، مقصود کا چہرہ دیکھیں۔ صحیح عمل وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دین حق کے طریقہ پر ہو، شریعت کے اور شارع کے فرمائے ہوئے کے مطابق ہو۔ وہی عبادات، ریاضت مجاہدے کرنا چاہئے جو شارع علیہ السلام کے فرمائے ہوئے طریق حق کے اور اللہ کی مرضی کے موافق اور اعتبار کے قابل ہوں، تاکہ اثر لائیں ان سے نتیجے اچھے برآمد ہوں۔

مجاہدہ و ریاضت کیا ہے یہی کہ نفس کو تکلف (زور و مشقت) سے حق کے موافق بنانا۔ اس کو شریعت حق کا مطیع کر دینا صحیح راستہ پر لگا دینا شرعی صحیح نیت اور صحیح عمل کے بغیر ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کسی کو عمل صحیح جیسا کہ فرمایا گیا ہا تھ آ جائے ظاہر میں وہ نیک کام کرے مگر نیت نہ رکھتا ہو تو بے نتیجہ کام ہے اگر کوئی شخص ایک کام دکھانے کو اپنے آپ کو نیک ظاہر کرنے کے لئے کرتا ہو تو ایسا شخص آخرت کے ثواب اور خدا کی رضامندی سے محروم ہے کیونکہ ریا (لوگوں کو دکھانے کے لئے دل میں جو بات نہ ہو اس کے خلاف کام کرنا ظاہرداری) اور سمعہ (مکاری سے اپنے نیک کاموں کو لوگوں کو سنوانا، تاکہ لوگ اس کو نیک اور پرہیزگار جانیں) سے جو نیک کام کیا جائے وہ ثواب کے بجائے عذاب کا سبب ہو جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جیسی نیت ہوتی ہے، ویسا ہی عمل ہوتا ہے۔ یعنی عمل کا دارومدار نیت پر ہے اس لئے ہر کام کے لئے صحیح نیت کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ کام بن جائے سچ ہے اللہ کی طرف سے توفیق عطا ہوتی ہے۔ اس سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ریاضت ہو یا مجاہدہ وہ جب تک حق تعالیٰ کی مرضی اس کے حکم کے موافق نہ ہو کوئی اثر نہیں

لاتا یعنی وہ اثر ایسا نہیں ہوتا کہ جس سے نور ایمان زیادہ ہو، عاقبت (آخرت) میں سرخروی اور عذاب سے نجات حاصل ہو، اور اجر و ثواب ملنے کا سبب ہو جائے۔

بعض ریاضتیں و مشغولیتیں جوگیوں، کاہنوں میں بھی ہوتی ہیں۔ بعضوں سے ریاضت کے بغیر استدراج بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک اثر بعض عوالم کے کھلنے، خوارق عادات کے ہاتھ آجانے، بعض ارواح خبیثہ کی تسخیر، جنات اور انسان سے کہ جس میں ایمان اور نیک عمل کی شرط نہیں ہے پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ پانی میں منہ دکھتا ہے۔ ویسا ہی پیشاب میں بھی دکھتا ہے وہ پاک ہے یہ پلید اور ناپاک یہی وجہ ہے کہ ان خطا کرنے والوں کا اصرار و انہماک اپنے کفر اور گمراہی میں ہوا کرتا ہے بعض نادان سادہ لوح جو اپنے مسلمان ہونے میں ثابت قدم نہیں ہوتے وہ ایسے لوگوں پر اعتقاد رکھتے ہیں، ان کو مانتے ہیں۔ اتنا نہیں جانتے کہ تقویٰ و صلاح ایمان پر منحصر اور ایمان ہی سے تقویٰ و صلاحیت آتی ہے ایسا اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے۔ دین کے مخالفین کے گرویدہ ہونا، ان سے میل ملاپ رکھنا ان کی عزت کرنا، دین سے لاپروائی و عظمت برتنا کوئی معقول صورت نہیں معلوم ہوتی۔ جو کوئی مسلمان زبان سے کلمہ پڑھتا ہے وہ زمرۂ اسلام میں ہے مسلمانی کے طریقہ پر چلتا ہے۔ اگر اس سے سو عیب دیکھیں تو اس کو چھپائیں۔ عزت اسلام، حرمت ایمان کو ہاتھ سے نہ دیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے والے اہل عزت ہیں چاہے وہ کتنے ہی شہوت میں پھنسے ہوئے معصیت (گناہگاری) میں مبتلا ہوں، اگر احکام شریعت کے اجرا میں ہوں۔ دین کے حدود پر نگاہ

رکھتے ہوں یا جاری کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ ایمان کی یہ نسبت خود درست ہے وہ انھیں یوں ہی نہ چھوڑ دے گی معصیت میں آلودہ ہونے نہ دیگی اگر ہو بھی جائے تو آخر نور ایمان غالب آجائے گا۔ گناہوں کی سیاہی اللہ تعالیٰ کے معاف کرنے، مغفرت نصیب کرنے سے حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست و سفارش کرنے سے دھل جائیگی۔ وہ جلد پاک ہو جائیں گے۔ آپ سے آشنائی دوستی کرنی چاہیئے۔ کریم ہرگز دوستی و آشنائی کی رعایت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا کرتے ؎

تو مگو مارا بآں شہ بار نیست   بر کریماں کارہا دشوار نیست

(تو نہ کہہ کہ میری اس بادشاہ تک رسائی نہیں۔ کریموں پر کام مکانا دشوار نہیں)

ایمان بہت بڑی چیز ہے اس کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ قطب الوقت شیخ ابوالحسن شاذلی قدس اللہ روحہٗ فرماتے ہیں کہ مجھ پر یہ کھلا (یہ کشف ہوا) کہ گناہگار مومن کا نورِ ایمان آسمان و زمین میں بھر جاتا ہے ان کو ڈھانک لیتا ہے۔ اس سے سمجھ لو کہ مومن مطیع کا نور ایمان کیسا اور کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ مومنوں کی عزت کرو اگرچہ وہ گناہگار ہوں۔ ان کو کرنے کے کاموں کے کرنے، اور نہ کرنے کے کاموں کو نہ کرنے کے لئے کہو۔ فاسقوں کی صحبت ترک کرو لیکن تکبّر اور مغروری سے نہیں کیونکہ انتہا اور خاتمہ کا دارومدار ایمان پر ہے۔ باقی سب اس کے لوازمات ہیں ایمان کی فکر کرنی ضروری ہے اگرچہ ایمان اور اس کی بقا آسان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بہت مشکل کام ہے۔ فضلِ الٰہی کے سوائے اس کا کوئی اور سبب و ذریعہ نہیں۔ اس لئے کہا کہ ؎

ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم   احسنت بریں چستی و چالاکی ما

(قبر تک اگر ایمان ہم سلامت لے جائیں۔ تو ہم پرا ور ہماری چستی و چالاکی پر آفرین)

اگر نور ایمان نور طاعت عبادت کے ساتھ جمع ہو جائے تو وہ نورٌ علیٰ نور ہو جاتا ہے۔ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ۔ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ بات بڑھتی جا رہی ہے اتنا ہی کافی ہے کہ

بس کنم مرزیر کان را ایں بس است ۔ بانگ دو کردم اگر در دہ کس است

اللہ تعالیٰ سب کاموں کا انجام بخیر کر دے۔ دنیا و آخرت کو اچھی کر دے دنیا سے دل کی گرہ کھولے جمال مقصود دکھائے بغیر نہ اٹھائے۔ اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ بالاجابۃ دعاء الراجین جدیر وصلی اللہ علیٰ محمد وآلہٖ وصحبہٖ وسلم۔

(تینتیسواں مکتوب)

مکتوب (۹)

انس رضی اللہ عنہ کی دعا محبت کا جوش

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی نَفْسِیْ وَدِیْنِیْ بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی اَهْلِیْ وَمَالِیْ وَوَلَدِیْ۔ بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی مَا اَعْطَانِیْ اللّٰهُ رَبِّیْ لَا اُشْرِكُ بِهٖ شَیْئًا اللّٰهُ اَکْبَرُ اللّٰهُ اَکْبَرُ وَاَعَزُّ وَاَجَلُّ وَاَعْظَمُ مِمَّا اَخَافُ وَاَحْذَرُ عَزَّ جَارُكَ وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ وَلَآ اِلٰهَ غَیْرُكَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَمِنْ كُلِّ شَیْطَانٍ مَّرِیْدٍ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ۔ اِنَّ وَلِیَّ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ۝

یہ دعا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ آپ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے۔ دس برس آپ کی خدمت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ماں کی درخواست پر اُن کے لئے دین دنیا آخرت کی بہتری کی دعا سے مشرف ومخصوص فرمایا۔ حق سُبحانہٗ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا سے ان کی عمر، مال، دولت، اولاد میں برکت دی اور اتنی برکت دی کہ کہا نہیں جاسکتا۔ ان کی عمر ۱۰۰ برس سے زیادہ ہوئی۔ ان کی خاص اولاد کی تعداد ۱۰۰ تھی ۷۸ لڑکے باقی لڑکیاں تھیں ان کے باغ اور کھیت سال میں دو بار فصل دیتے تھے۔ یہ دنیا کے برکات تھے آخرت کے برکات کس قدر اور کتنے ہوں گے اندازہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ بے حد بے انتہا ضرور ہوں گے۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اکابر علمائے حدیث میں سے تھے اُنھوں نے اپنی کتاب جمع الجوامع میں لکھا ہے کہ ابو الشیخ 'کتاب ثواب' و ابن عساکر" جو تاریخ کی کتاب ہے اس میں لکھتے ہیں کہ ایک روز انس بن مالک رضی اللہ عنہ ایک بار حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حجاج نے حکم دیا کہ چار سو گھوڑے مختلف نسلوں اور رنگوں کے سامنے لائے جائیں۔ اس نے ان گھوڑوں کے دیکھنے کے بعد حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔ تم نے گھوڑے دیکھے۔ ایسے گھوڑے، یہ مال ودولت اور دوسرے اسباب کیا تم نے اپنے صاحب یعنی محمد رسول اللہ کے پاس کبھی دیکھے انھوں نے جواب دیا۔ قسم خدا کی میں نے دیکھے ہیں میرے صاحب، مالک آقا کے پاس اس سے بہت بہتر بلکہ بہترین گھوڑے تھے یہ میں نے آپ ہی سے سُنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوگ جو گھوڑے رکھتے ہیں وہ تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ایسا شخص ہوتا ہے

کہ وہ گھوڑا اس لئے رکھتا ہے کہ جہاد میں کام آئے۔ خدا اور دین کے دشمنوں سے جنگ کرے۔ مردانگی کی داد دے۔ ایسے گھوڑے کی لید، پیشاب، چمڑا ہڈی، گوشت سب اعمال کے ترازو میں تولے جائیں گے۔ دوسرے وہ شخص ہیں جو اپنی ضرورتوں کے لئے اپنی سواری کے لئے پیدل چلنے کی زحمت سے بچنے کے لئے گھوڑا رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنے نام اپنی شہرت کے لئے رکھتے ہیں تاکہ لوگ دیکھیں۔ تعریف کریں یہ کہیں کہ فلاں اتنے اور ایسے گھوڑے رکھتا ہے۔ ایسے شخص کی جگہ دوزخ ہے۔ اے حجاج تیرے گھوڑے اسی قسم کے ہیں۔ حجاج یہ بات سنتے ہی غصہ میں آگیا۔ غضب کی آگ بھڑک گئی اور اس نے کہا کہ اے انس اگر تیری خدمت کا لحاظ نہ ہوتا جو تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی ہے۔ اور اس کے سوائے اگر وہ سفارشی خط نہ ہوتا جو امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان نے تیرے متعلق اور تیری نسبت لکھا ہے اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو تو دیکھتا کہ میں آج کیا کرتا۔ انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ قسم اللہ کی تو ہرگز کچھ نہیں کر سکتا۔ بری نظر سے بھی میری طرف نہیں دیکھ سکتا بُرا ارادہ میرے بارے میں نہیں کر سکتا۔ تحقیق کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چند کلمے سنے ہیں۔ میں ہمیشہ اُن ہی کلمات کی پناہ میں ہوں ان کلمات کی وجہ سے میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ کسی بادشاہ کی بادشاہت، اس کے دبدبہ کا اثر مجھ پر نہیں ہوتا، کسی بادشاہ کا شر مجھ تک آ نہیں سکتا۔ کسی شیطان کا مجھ پر غلبہ نہیں ہو سکتا۔ حجاج ان باتوں کے سننے سے ڈر گیا۔ گم سم ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا اے ابو حمزہ مجھ کو وہ کلمات سکھا دو۔ آپ نے جواب دیا خدا کی قسم میں تجھ کو کبھی نہ سکھلاؤں گا تو اس کا اہل نہیں۔ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ، کا آخری وقت آگیا تو انھوں نے اپنے خادم ابان رضی اللہ عنہ، کو ان کے

پاس آکر سرہانے کھڑے ہوکر آہ وزاری کر رہے تھے دیکھا تو انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے پوچھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا وہ کلمات جو تم نے حجاج کو نہ سکھائے وہ مجھکو سکھا دو۔ تو انھوں نے کہا کہ اے ابان میں تجھکو سکھاتا ہوں تو اس کا اہل ہے۔ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت دس سال تک کی آپ دنیا سے جانے تک مجھ سے راضی وخوش رہے۔ تو نے بھی اے ابان دس سال میری خدمت کی اب میں دنیا سے جارہا ہوں۔ تجھ سے راضی ہوں۔ صبح اور شام ان کلمات کو کہا کر۔ تجھ کو خدائے تعالیٰ تمام آفات و بلیّات سے بچائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی نَفْسِیْ وَدِیْنِیْ کو اپنا حرز (پناہ کی جگہ مجازاً بمعنی تعویذ) بنا کر اللہ کے نام کی پناہ میں آتا ہوں اپنی جان اپنے دین کے لئے ممکن ہے اور ہوسکتا ہے کہ بسم اللہ سے مراد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہو۔ پہلے جزو پر اکتفا کیا گیا ہو۔ جیسا کہ جب پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے ہو تو جواب ملتا ہے کہ الحمد پڑھ رہا ہوں الٓمٓ پڑھ رہا ہوں اس سے پوری سورۃ مراد ہوتی ہے تعویذ بنانے کی تخصیص اپنے لئے اپنے دین کے لئے کی۔ ہر کمال اور ہر حقیقت کے حاصل کرنے کی بنیاد۔ دراصل ابتدا و انتہا نفس (خود) اور دین ہے۔ اور پہلے نفس کو یعنی اپنے آپ کو لایا کیونکہ دین و دنیا کا کمال حاصل کرنے کا دارو مدار اسی پر موقوف ہے۔ نفس یعنی خودی کا باقی رہنا حرام کے دغدغہ میں ڈال دیتا ہے۔ حرام موت مرنا ہے اس کے باوجود حتی الامکان اس کا باقی رکھنا بھی واجب ہے کہ یہ مسائل شرعیہ میں سے ہے۔ مثلاً اگر کسی کی حلق میں تو الہ پھنس جائے۔ پانی کے گھونٹ سے بھی نہ اترے دم پھنس جائے تو حرام چیز جو سب کی مانی ہوئی حرام ہے، اس حالت میں اس کے لئے حلال ہی نہیں اس کا پینا واجب ہوجاتا ہے۔ تاکہ جان

بچ جائے۔ فنا ہونے والی زندگی رہ جائے تاکہ یہ زندگی حیات جاوید (ہمیشہ کی زندگی) حاصل کرنے کا سبب ہو جائے۔ کلمۂ کفر کا زبان سے کہنا جب کہ سختی اور ہلاکت کی صورت پیش آجائے دل میں ایمان سلامت ہو۔ جائز رکھا گیا ہے وہ بھی اس قسم میں سے ہے۔ چنانچہ جان بچانے کے لئے اگر ناجائز باتیں کہیں اور دل میں ایمان اپنی جگہ پر رہے تو اس کی بھی اجازت ہے تاکہ جان کے ساتھ دین بھی باقی رہے۔ اگر صبر کریں بلند ارادہ کی بنا پر اپنی جگہ قائم ہو جائیں جو ہونا ہو اس پر ٹھہر جائیں تو یہ بہت اعلیٰ مرتبہ ہے۔ یہ مسئلہ فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا ہے وہاں دیکھ لینا چاہیئے۔

بِسْمِ اللّٰہِ علیٰ اھلی ومالی وولدی۔ اپنی جان کو اپنے آپ کو اپنے دین کو اس کی حفاظت و پناہ میں دینے کے بعد گھر والوں۔ مال و دولت، بال بچوں کا ذکر آیا کہ یہ اپنے اور اپنے دین کے اسباب کے ساتھ دینے، اعانت و مدد کرنے والے ہیں۔ اس لئے پھر بسم اللہ سے اس کو شروع کیا گیا۔ پہلی دفعہ جو کہا اس پر ہی اکتفا کیوں نہ کیا۔ بسم اللہ کی تکرار علیٰ نفسی و دینی و اہلی ومالی وولدی کے ساتھ پھر کیوں کی گئی۔ بات یہ ہے کہ اہل معانی کے پاس بیان کا طریقہ یہ ہے کہ عبارت میں جو اشارہ کیا جاتا ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ پہلے مذکور ہوا اور جو کچھ آخر میں مذکور ہوا (دو بھی مقصود ہوتے ہیں) دونوں کی طرف توجہ دونوں کا اہتمام برابر کرنا ہوتا ہے۔ اہل اور آل دونوں ایک ہی معنیٰ رکھتے ہیں کبھی پیروی کرنے والوں، کبھی لڑکوں کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتے ہیں، کبھی اولاد کے بھی معنیٰ دیتے ہیں۔ چونکہ یہاں اولاد کا ذکر آخر میں آیا ہے اس لئے پہلے معنی ہی مناسب ہیں چونکہ مال دولت کا ذکر، تعریف کرنے احسان ماننے کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے مراد حلال مال ہے جو آخرت کا وسیلہ ہو جاتا ہے۔ "تحفظ"۔ "تعوذ"

کا تخم (بیج) سعادت کے پھول پھل لاتا ہے۔ باقی جو ہیں وہ بیکار و بال و پریشانی ہی پریشانی ہے۔ ولد کے معنی اولاد کے ہیں چاہے مرد ہو، یا عورت۔ اولاد کا وجود بھی دین و دولت میں قوت، ہمت بازو کے اسباب میں سے ہے۔ اگر فرزند رشید صالح ہو تو وہ دنیا اور دین کی نیک بختی کا باعث ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ آدمی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی وہ دنیا میں باقی رہتی ہیں۔ ایک علم دین۔ جو اہل کو سکھلایا اور اسی سلسلہ کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچایا جاتا ہے۔ دوسرا خیر جاری (ثواب جاریہ) کہ جس میں خدا کے بندوں کا فائدہ ہوتا ہے وہ اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے سچ ہے وہ شخص خوش نصیب ہے جس کے بعد، پل، مسجد، کنواں مرا کیسے یا اور کچھ اسباب خیر رہ جائیں۔ تیسرا فرزند صالح (نیک لڑکا) کہ باپ کے مرنے کے بعد دعا درود سے اس کو یاد کرتا ہے تاکہ باپ کے گناہ بخشے جائیں۔ اس کے درجہ بلند ہوں حدیث شریف میں اسی ترتیب سے واقع اور اس کا ذکر اسی تسلسل سے ہوا ہے علم و مال کا لڑکے سے پہلے جو ذکر آیا اس کو جو فضیلت دی گئی، اس میں یہ اشارہ ہے کہ نیک لڑکے کا وجود خصوصاً آخری زمانہ میں ایک نادر چیز ہے۔ بعض روایتوں میں لڑکے کا مذکور مال سے پہلے ہوا ہے۔ بیشک لڑکا مال سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ عزیز ہوتا ہے اس کا بچاؤ اس کی حفاظت زیادہ مقدم و مطلوب ہوتی ہے

بسم اللہ علیٰ ما اعطانی (پناہ لیتا ہوں خدا تعالیٰ کی۔ تعویذ بناتا ہوں اس کے نام کو جو نعمت اس نے مجھے دی ہے) چند نعمتوں کا ذکر کیا اور وہ بھی مخصوص نعمتوں کا جو دنیا و آخرت کی نعمتیں ہیں اس کے بعد ایک عام لفظ لایا۔ تاکہ ساری نعمتوں پر حاوی اور سب کے شامل ہو جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کی گنتی ایک ایک کر کے بیان کرنا گنتی میں لانا ممکن نہیں کوئی نہیں

گن نہیں سکتا۔ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا۔ ان الانسان لظلوم کفار (اور اگر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو وہ شمار میں نہیں آ سکتے آدمی ظالم اور ناشکرہ ہے) آدمی ہر وقت اپنے نفس پر ظلم اور کفران نعمت (نعمت کی ناقدری) کرنے منہ پھیر لینے کا عادی ہے۔ اسی لئے " ان الانسان لظلوم کفار" کو مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا اسی نعمت کے متعلق ان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان اللہ لغفور الرحیم فرمایا۔ مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کام میں نہ ہوتی تو کفران نعمت (ناشکری) کے بدلے آدمی کی سخت گرفت ہوتی سچ ہے اس کی نعمتوں میں سے رحمت مغفرت بڑی نعمتیں ہیں بلکہ یہی سب کچھ ہیں اس کے سوا سب ہیچ ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا صرف خدا تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے جائے گا۔ اس کی نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، ہرگز بیکار نہ بیٹھے رہنا چاہئے۔ سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم رات میں نماز میں اس قدر اور اتنی دیر تک کھڑے ہوتے کہ آپ کے مبارک پاؤں سوجھ جاتے۔ ان سے خون جاری ہو جاتا۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ تو اللہ کے رسول ہیں آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے بخش دیے گئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ" پھر یہ محنت و مشقت اٹھانا کس لئے ہے۔ آخر یہ بات کیا ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھکو بخش دیا۔ بخشدینا اس کی نعمت اور بہت بڑی نعمت ہے۔ تو کیا میں اس کی نعمت کا شکر ادا نہ کروں، اس کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔ سید اولین و آخرین صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں سارا عالم اور عالم کے سب بسنے والے آپ کے طفیلی ہیں جب آپ ایسی محنتیں، مشقتیں اٹھائیں

بندگی کریں تو غور کرنا پڑتا ہے کہ دوسروں کو کیا کیا کرنا اور ان کے لئے کیا کام ضروری ہیں۔

اللہ ربی لا اشرک بہ شیئاً (اللہ میرا پروردگار ہے۔ میں کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔) اس کلمہ کی فضیلت بہت ہے۔ اس کی خاصیت محنت و شدت کے رفع کرنے میں لاجواب ہے۔ حوادث وغیرہ پیش آئیں تو اس کا ورد کارآمد ہوتا ہے۔ اس بارہ میں بہت سی احادیث وارد ہیں حقیقی معنیٰ میں یہ توحید افعالی کے شہود کا سمجھانا ہے مطلب یہ کہ جو کچھ سامنے آئے وہ سب اسی کے پاس سے اسی کے حکم سے آرہا ہے بلکہ وہی کر رہا ہے۔ جانیں سمجھیں شرک خفی کے جال میں نہ پھنسیں۔ ہمیشہ خدا تعالیٰ کے ساتھ نیک گمان رکھیں کہ وہ مربی (پالنے والا) ہے جس بات میں بندہ کی بہتری ہے وہی کر رہا ہے جو کر رہا ہے وہ ٹھیک کر رہا ہے کہ وہ ہمارا پروردگار کارساز ہے۔ سب کچھ وہی کرتا ہے اس کے لئے ایسا کرنا سزاوار ہے جو کوئی ہمیشہ اسی کی طرف متوجہ اسی سے ملتجی اسی کے لطف و کرم کا متلاشی رہتا ہے وہ اپنے سب کاموں کو اپنے آپ کو اس کے تفویض (حوالہ سپرد) کر دیتا ہے تو ولایت کے نور کا پرتو اس کی پیشانی میں آجانے سے پروردگار تعالیٰ وتقدس کو اپنا متولی پاتا ہے۔ حقیقی مذہب یہی ہے کہ اچھائی بہتری دینا یا کرنا، اللہ تعالیٰ پر لازم اور واجب نہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے کیوں ایسا کیا بلکہ ان سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا) اس کی مراد حقیقی لازم ہو ہی ہے، جو شرع میں بیان ہوئی ہے۔ یہ فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی اس دعا کو پڑھے اس کی جزا اس کا بدلہ یہ ہوگا۔ جب وہ حال اس کو مل جائے اور اس کی معنی سے متصف ہو جائے تو اس کو سب کچھ ہاتھ آجائے گا دعا۔

ہاتھ پاؤں کے ہلنے زبان کے چلنے سے کیا ہوتا ہے۔ زبان و اعضاء کی حرکت کے ساتھ اس کا شہود و حضور رہنا اصلی و حقیقی کام ہے۔ شارع کا منشا رگ کا پکڑ کانا ہے تاکہ سب کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ خاصیت صرف لفظ اور آواز میں ہے بحقیقی بات یہی ہے اس میں کوئی رہے تو خاصیت خود بخود مرتب ہو جاتی ہے جب تک رٹ نہ لگ جائے حرف معنی۔ آواز پر نظر رہتی ہے جب رٹ لگ جاتی تو معنی کے سمجھنے کی حاجت باقی نہیں رہتی اور یہ تصور آجاتا ہے کہ ان کے بتائے ہوئے کلمہ میں وہی اثر دینے والے ہیں۔ جو کچھ بھی صورت ہو ہو۔ لیکن کسی صورت میں بے کار بیٹھے رہنا مناسب نہیں بلکہ حال کے ملنے تک عمل کو جاری رکھنا چاہیے۔ ملنے نہ ملنے پر موقوف۔ رکھنا چاہیئے۔ خدا کے فضل کی کوئی انتہا نہیں اس میں کافی وسعت ہے۔ اللہ تعالیٰ دعاؤں کا قبول کرنے والا، بندوں کی مرادیں برلانے والا ہے۔ اس نے یہ طریقہ بنا رکھا ہے اسی سے سب کی مرادیں پوری کرتا ہے۔ جس حال کیفیت و حالت میں دعا کریں دعا کے آداب کی شرطیں ہیں۔ ان کا بجا لانا، تعداد کی رعایت رکھنا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم حساب و شمار سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ بہرحال کام کرتے جائیں اور اس سے امید رکھنا ضروری ہے۔ اللہ ہی کی توفیق سے ہر کام سرانجام پانا پورا ہو جاتا ہے۔

حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ العزیز سے دریافت کیا گیا کہ اخلاص اور ریا (حقیقت اور دکھاوا) کے بارے میں جو عمل میں پیدا ہوتا ہے اس کا کیا علاج ہے۔ اس کے متعلق ہمیں کیا کرنا چاہیئے یہ بھی عرض کیا کہ ہم جب کبھی کوئی عمل کرنا چاہتے یا کرتے ہیں تو اس میں ریا اپنا راستہ نکالتی ہے۔ اگر نہیں کرتے ہیں تو بیکار بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ اس کے جواب

میں آپ نے یہ فرمایا عمل کرتے چلے جاؤ ریا کے دُور ہونے کے لئے استغفار کرتے رہو کسی حال میں بیکار بیٹھنا ٹھیک نہیں مصلحت وقت بھی نہیں۔ یہی عمل جب مداومت پاتا۔ ہمیشہ کا ہو جاتا ہے تو عمل کی نورانیت سے اخلاص کا راز دل میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اِنشاءاللہ تعالیٰ۔

اَللّٰہُ اکبر اللّٰہ اکبر واعز واجل واعظم مما اخاف واحذر

(اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے بزرگ و برتر ہے۔ سب سے بڑا ہے۔ جس سے میں ڈرتا اور خوف رکھتا ہوں) بعض روایات میں اعظم و اجل کے بعد اللہ اکبر لکھا ہوا ہے۔ کبریا۔ عزت۔ عظمت جلال کے معنی ملتے جلتے ہیں اور نزدیک کے معنی میں بھی آئے ہیں۔ اگر کبریا کو ذات کا۔ عزّت کو افعال کا — عظمت کو اسماء کا جلال کو صفات کا اعتبار دیا جائے تو ہو سکتا ہے چونکہ نفس اپنی پیدائشی عادت و خصلت کے لحاظ سے غیروں سے ڈرتا، خوف کھاتا ہے خصوصاً وہاں جہاں اس کو اپنے سے زیادہ غالب سے معاملہ پڑتا ہے، جیسے کہ بادشاہ سلطان اور حاکم خدا سے نہ ڈرنے والا ظالم وغیرہ سے۔ اس کلمہ کے دہرانے سے عظمت و کبریائی کے حاضر لانے سے نور یقین بڑھتا، جوش میں آجاتا ہے وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ اے نفس نہ ڈر کہ تیرا پروردگار سب سے بڑا، سب پر غالب ہے۔ سب پر اس کا حکم چلتا ہے۔ وہ جو چاہے گا وہی ہوگا۔ وہ تیرے دشمن سے قوی تر و غالب تر ہے۔ اس تصور کا آجانا اس کو قوی تر بنا دیتا ہے تو وہ خدا اور رسول کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا اور زبان حال و قال سے یہ کہتا ہے کہ ع

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است

(دشمن اگر قوی ہے تو نگہبان اس سے زیادہ قوی ہے)

سچ ہے تو اپنے مولیٰ تعالیٰ سے ڈرتا رہ تاکہ سب تجھ سے ڈریں۔ مَنْ

خَافَ عَنِ اللہ خاف عنہ کل شیٔ (جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرتی ہے) اس کلمہ میں یہ اشارہ یہ تنبیہ ہے کہ جب تمہارا معاملہ کسی غالب سے پڑھ جائے تو اپنے باطن کو حق تعالیٰ کی کبریائی سے بھرا ہوا اور معمور رکھو تاکہ اس کے سوائے کسی کا داب و اثر دل میں جگہ نہ پا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے عظمت و جلال کے نور کے دبدبہ میں دوسروں کی جبّاریت و قہاریت مضمحل ہوکر نیست و نابود ہو جائے۔

عزجارك۔ (غالب ہے تیرا ہمسایا اور تیری پناہ میں آنے والا)۔ جب کوئی حق تعالیٰ کی کبریائی اس کے شہود و عظمت کو حاضر لایا تو وہ غائب سے حاضر اور غیب سے حضور میں آگیا۔ مخاطب ہوگیا۔ حق کی ہمسائگی پاگیا۔ ہمیشہ کی توجہ اور ہر وقت کی التجا اس کے حضور میں کئے جانے سے جب اس کے لطف کے دامن میں آجاتے ہیں تو اس کی عزت کا دامن تھام لیتے ہیں ایسی حالت و کیفیت میں جو کوئی اس سے التجا کرتا رہا اس کا ہو جاتا ہے تو وہ ہرگز مقہور و مغلوب نہیں ہوتا۔ ؎ عزیزے تو خواری نہ بیند زکس (جو تیرا پیارا وہ کسی سے خواری نہیں دیکھتا کہیں ذلیل نہیں ہوتا)

جل ثناءك۔ (تیری ثنا بہت بزرگ ہے) تیری صفت کہ جس کی انتہا نہیں، تیری قدرت کہ جس کو زوال نہیں جہاں کسی کی رسائی نہیں تو کمزور کو قوی، قوی کو کمزور، چھوٹے کو بڑا۔ بڑے کو چھوٹا کرتا ہے تیری صفت تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے)

لَا اِلٰہَ غَیْرُكَ۔ (کوئی معبود نہیں بجز تیرے) سچا معبود عبادت کے لائق تو ہی ہے تیرے سوائے کوئی اور نہیں یعنی تُو ہی تُو ہے۔ لائق بندگی تُو ہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ (اے میرے اللہ میں

تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اپنے نفس کے شر یعنی بدی و بُرائی سے) سارے برائیوں کی جڑ بنیاد نکلنے کی جگہ، تمام قباحتوں، ساری بے یقینیوں، بے ثباتیوں کا سبب نفس ہی ہے۔ اس کے شر سے خدا بچائے کہ یہ بدی کا حکم کرنے والا ہے جو کچھ بُرائی آدمی میں پیدا ہوتی ہے یا اس کو پہنچتی ہے۔ وہ سب نفس ہی سے پیدا ہوتی اور پہنچتی ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ربّ لا تکلنی الیٰ نفسی طرفۃ العین ولا اقل من ذالك (اے پروردگار مجھکو نفس کے ساتھ ایک پلک جھپکنے تک نہ رکھ اس کی تاثیر اس کا تصرف و غلبہ مجھ پر نہ ہو۔)

من کلّ شیطان مرید ومن شرّ کلّ جبّار عنید

(تیری پناہ ڈھونڈھتا ہوں۔ تیری پناہ میں آتا ہوں نافرمان، شریر، راندہ متکبّر شیطان کے شر اور اس کے ہر تسلّط سے کہ وہ سیدھے راستہ سے مائل آتا ہے حق کے ساتھ عناد (دشمنی) رکھنے والا ہے) عناد کے معنیٰ ہیں حق کے راستہ سے نکل آنا۔ — حق کے مخالف ہو جانا حق کو حق جانتے ہوئے، حق کا انکار کرنا۔ چونکہ ہر برائی کی تدبیر، شر کی بادشاہت، گمراہی کا مُلک شیطان کے حوالہ کیا گیا اسی قیاس پر ظالموں، ناخدا ترسوں سے جو مغرور متکبر ہوتے ہیں ان کے شر سے بھی پناہ مانگنا، وقت کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔ شیطان دو قسم کے ہوتے ہیں جنات میں کے شیطان، انسانوں میں کے شیطان۔ جنات میں کے شیطان سے ابلیس اور اس کا لشکر اس کی ذریت مراد ہے۔ انسانوں میں کے شیطان سے ظالم اور ان کے مددگار مراد ہیں۔ اس دعا میں پہلا اشارہ نفسِ انسان دوسرا شیطانی دشمنوں کے اغوا کی طرف ہے جس کو بہت سارے بزرگوں نے واہمہ کہا ہے۔ قوتِ واہمہ

ہر آدمی کی جبلت میں رکھی گئی ہے۔ اسی قوت کو عالم انفس کا شیطان بھی کہتے ہیں کہ یہ عالم آفاق کے شیطان کا پورا نمونہ ہے۔ انسان کے قویٰ و اعضا ہی کیا بلکہ اس کی عقل پر بھی اپنا پورا تسلط رکھتا ہے۔ لیکن جس کی عقل صفا قلب نورانی ہوگیا ہو وہ خدا کے بندے ہو گئے ہوں ان پر اس کا قابو نہیں چلتا۔ کہ اس کا فرمان " اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰن (جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا قابو کچھ نہیں چلتا) ہے۔ ہے اس کی قوت اس کا زور ان پر نہیں چلتا۔ خدا کی پناہ میں آتا ہوں وہم سے' یہ دعا اس لئے کرتے ہیں اور یہ طلب اسی لئے ہوتی کہ وہ معدوم کو موجود کی صفت میں باطل کو حق کی صورت میں ظاہر کرتا ہے اس لئے ایسی دعا کرنا ضروری اور اس سے بچنے کے لئے خدا کی پناہ میں آجانا لازمی مقتضائے وقت ہے۔ حق کے سوائے جو کچھ ہے اس سے خوف نہ کھانا' ڈر کا دور ہو جانا صرف وہم ہی کے جاتے رہنے ہی پر منحصر نہیں نفس کی وجہ سے بھی ہے اس لئے نفس (انفسی و آفاقی) کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے جس کا فقرۂ اول میں ذکر آچکا ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ یہ قرآن کی ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ و تبارک نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا۔ کہ اگر کافر منہ پھیر لیں' حق کی طرف رخ نہ کریں' حق کے قبول کرنے سے انکار کریں۔ اے محمد اے میرے محبوب اے میرے محفوظ و معصوم آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے لئے میرا خدا بہت کافی ہے۔ اس کے سوائے کوئی معبود ہے ہی نہیں۔ وہی عبادت کے قابل ہے میں اسی پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اسی پر اپنا سارا کاروبار' معاملہ چھوڑتا ہوں

اسی کو اپنا وکیل (کارساز، نگہبان) بناتا ہوں کہ وہ بہت بڑے عرش کا پروردگا ہے۔ مخلوقات میں عرش سے بڑا کوئی بھی اس کی مخلوق میں پیدا نہیں کیا گیا۔ کلام کا رخ ظالموں، مغروروں ناخدا ترسوں کے بارے میں تھا۔ اوران کے ڈر ہیبت کے رفع کرنے میں گفتگو تھی اللہ والوں کا ایسا ہونا، اس طرح ان کے دیکھنے میں آنا، اللہ تعالیٰ کے قہر و عظمت کا ان کی نظر میں آجانا اسی بناء پر ہے۔ آخری کلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب کیا گیا اور کلام کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت ہی پر ہوا ہے۔ پناہ میں آنے والے عرش الٰہی کے احاطہ کا مراقبہ اس اضافت کے ساتھ اگر کریں ایک چلہ کھینچیں تو حفاظت و نگہبانی و حصار ہاتھ آجاتا ہے۔

قطب وقت حضرت شیخ ابو الحسن شاذلی رضی اللہ عنہٗ "حزب البحر" میں جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تلقین فرمائی ہے، پناہ میں آجانے بچاؤ کے لئے اکسیر اور بہترین تریاق ہے، فرماتے ہیں کہ ستر العرش مسبول علینا وعین اللہ ناظرۃ الینا بحول اللہ لا یقدر احد علینا واللہ من ورائھم محیط ۔ (عرش کا پردہ ہم پر چھوڑ رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت کی نظر، اس کی نگہبانی۔ ہماری نگران ہماری دیکھ بھال کر رہی ہے اور ہم کو دیکھ رہی ہے۔ اللہ کی قدرت کی وجہ سے کسی کا ہم پر قابو نہیں چلتا۔ ہم پر کوئی قابو نہیں پاتا۔ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سب کو گھیرے ہوئے ہے اس کی قدرت سے باہر آنے کی کسی میں مجال و سکت نہیں۔ کوئی اس کی قدرت کے دائرے کے باہر نہیں۔ مشائخ شاذلیہ قدس اللہ اسرارہم اپنے مریدوں کو اس دعا کے پڑھنے ورد رکھنے کی وصیت کرتے ہیں۔ جو حسبی اللہ لا الٰہ اِلّا ھو علیہ توکلت وھو رب العرش العظیم ؕ انھوں نے کہا ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی ورد نہ ہو وہ کچھ پڑھتا نہ ہو تو ایسے شخص کے لئے یہی ورد اور پڑھائی کافی

ہے اس کو سارے اوراد کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر اس دعا کے پڑھنے میں فہم وحضور بھی نہ ہو پھر بھی موثر و مقبول ہے۔ اس کے پڑھنے کا عدد دس ہے۔ اگر صبح کے نماز کے بعد سات سات دفعہ پڑھیں تو بھی کافی ہے۔ یہ روایت صحت سے بہت قریب ہے۔ اس کے ورد سے اللہ تعالیٰ کی عظمت، اس کے سوا جو کچھ ہے اس سے برات، تدبیر و اختیار کا ترک، توحید و اخلاص نصیب ہو جاتا ہے۔ اللہ ہم کو یہ روزی کرے اور ثابت رکھے ہم کو اس طریقہ مستقیم پر برقرار، قائم و مستقیم رکھے استقامت عطا فرمائے۔ انّ ولیّ اللّٰہ الذی نزل الکتٰب وھو یتولی الصّٰلحین ۝ البتہ میرے تمام کاموں کا بنانے والا میرے تمام امور کا تدبیر کرنے والا میرا متولی اللہ ہی ہے جس نے نازل کی ہے کتاب جس میں دنیا و آخرت کا تمام امور کی تدبیر ہے قرآن مجید کو خدا تعالیٰ محبوب رکھتا ہے وہی تولیت امور (ہر کام کی نگرانی) کرتا ہے۔ نیک حضرات کے لئے خصوصاً جو کچھ کیا کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اے اللہ ہم کو صالحین میں سے کر دے۔ دعا قنوت کی شرح بھی کی گئی ہے وہ بھی عنقریب میں لکھکر بھجوا دی جائے گی۔ (چھتیسواں مکتوب)

مکتوب ۱۰
صبر کی استقامت

اللہُ وَرَسُوْلُہٗ

ایک دن یہ فقیر نماز میں تھا کہ یکایک صبر کی کتاب دل پر اتاری گئی اور فوراً ہی دل میں ڈال دی گئی۔ وارد کی یہ خاص خصوصیت اس کا زور و غلبہ یہ ہے۔ کہ وہ اجمال کے ساتھ آتا ہے، آنے، پورے طور سے اتر جانے کے بعد پھیل جاتا ہے،

تفصیل میں آتا' کھل جاتا' پھر بیان میں آتا ہے۔ اس کے بعد اس کی تفصیل بتلائی جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ثُمَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ (پھر ہم پر ہے اس کا بیان کرنا) متذکرہ صدر کی دلیل یہی ہے چنانچہ صبر کی ماہیت' اس کی صورتیں' کیفیتیں اس کے کھلنے کے ذرائع دل میں آئے۔ نماز میں جو حضور تھا وہ اس کے سوچنے اس کو سمجھنے اس پر غور کرنے کا مانع ہوا۔ نماز سے باہر آجانے کے بعد اس کی تفصیلات' مراتب و درجات جو صبر میں پیش آتے ہیں' جن میں صبر کرنا پڑتا ہے آنا شروع ہو گئے۔ حاضرین سے چند باتیں کہی گئیں۔ جب میں نے اس میں اسلام و ایمان کا بڑا دروازہ پایا تو ارادہ کیا کہ اس کو لکھوں۔ فقیر کے لکھے ہوئے بہت سارے مکتوب اسی قسم کے ہیں خدا کرے دین اسلام اور مسلمانوں کے لئے کارآمد ہو جائیں نور ایمان ان کے باطن میں زیادہ ہو جائے۔ یہ حقائق توحید نہیں' وجود کے احکام نہیں' کہ طالب کو اور ہی طرف لے جائیں' عمل و عبادت میں سستی لاپرائی پیدا کریں۔ ہم نے پہلے ہی مکتوب کے شروع میں یہ لکھدیا ہے کہ یہ طریقہ ہدایت کا وہ راستہ ہے کہ جو کوئی اس پر چلتا ہے وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ یاد رہے ہدایت ہی وہ چیز ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ جاننا ضروری ہے کہ صبر کے معنی داعیہ حق (حق کی خواہش و ارادہ) کو اپنے ارادے اور خواہش پر ترجیح دینا ہے۔ جب یہ دو داعیہ آپس میں ٹکرا جائیں تو حق کے داعیہ پر ثابت قدم رہنا' لازمی و ضروری ہو جاتا ہے۔ حق کی خواہش اس کے ارادہ کی پیروی میں اس کی برداشت اور اپنے ارادہ اپنی خواہش کی نفی کرنی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامیت کا دار و مدار دین اسلام کا کارخانہ پورے طور سے صبر ہی پر قائم ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ کوئی عبادت وہ کیسی ہی ہو جب تک صبر و سکون کے ساتھ نہ کی جائے' اچھی طرح اور پورے

طور سے ادا نہیں ہوتی. یعنی جب تک ان سب باتوں اور چیزوں سے جو اس کے خلاف ہیں. صبر نہ کریں، طاعت عبادت وجود میں نہیں آتی. صبر کو آدھا ایمان اسی لئے فرمایا گیا کہ گناہوں سے خود کو بچانا عبادت و طاعت کو شرائط ارکان کے ساتھ ادا کرنا ہے. صبر کا پہلا دروازہ بہترین طریقہ اسلام کے عقائد پر ثابت قدم رہنا ہے. خصوصاً ایسے عقیدوں پر کہ جن میں عقل کا دخل نہیں، جن کے سمجھنے میں عقل اپنی عادت وسوسہ دہی کی بناء پر حیرت میں رہتی ہے تردد میں پڑ جاتی ہے. مثلاً قیامت کے احوال حشر و نشر اور اس عالم کی خبریں، قدرتِ الٰہی کے عجائب و غرائب، ملک و ملکوت کے نوادرات جس کی خبر صاحب شریعت نے دی ہے. اور اس کا متعلقہ علم اس تک پہنچنے کے مقررہ طریقے، عبادتیں، جس کی سچے خبر دینے والے نے خبر دی ہے. (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اس پر ثابت قدم رہنا، اطمینان رکھنا، اپنے آپ میں ایک ثبات و اطمینان کا پیدا کر لینا یہ سب نورِ ایمان اور یقین کے ملنے پر منحصر ہے، بغیر کسی کسب اور اختیار کے بندہ کو عطا ہوتا اور اس کو اس پر رکھا جاتا ہے. یہ نہ ہو تو کوئی صورت ہی پیدا ہی نہیں ہوتی. اسی میں کیا سارے عقائد کا یہی حال ہے چاہے وہ عقائد جس میں عقل کا دخل و رسائی نہ ہو یا وہ مسائل ہوں جن میں عقل کا دخل اس کی رسائی پائی جائے متکلمین اپنے گھمنڈ میں مذہب اسلام اور اس کے عقائد کو دلائل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، عقلی دلیلیں لاتے ہیں وہ یہ تک نہیں جانتے کہ سب سے پہلے ایمان کی ضرورت ہے. ایمان ہی پورا نہ ہو تو سب بحثیں، دلیلیں حیرانی و پریشانی کا سبب بن جایا کرتی ہیں. منظورِ خدا ہوتا ہے تو دلیلیں دلنشین ہو جاتی ہیں. یہ وہ صورت ہے کہ دی ہوئی دلیلیں کسی کے دلی یقین کے موافق و مطابق ہوں یا وہ کسی کے دل میں پہلے سے موجود و ثابت ہوں لیکن یہ ان کی

موجد (ایجاد و پیدا کرنے والے) ومثبت (ثابت وتحقق کرنے والے) نہیں
مثلاً ایک شخص ہے جو اپنے کام اپنے ہنر میں ماہر و کامل ہے۔ وہ اس میں منہمک
ومشغول ہے وہ کام کئے جا رہا ہے۔ اگر اس کام کے آگے بڑھانے اس میں
قوت دینے کے متعلق کوئی کچھ کہے تو کہنے والے کا یہ کہنا' کام کرنے والے
شخص کی کوشش میں ایک نئی جان ڈال دیتا ہے اور اس کے کام کو اور زور دار
پر لاتا ہے اسی طرح ان دلائل سے ایمان ایقان اعتقاد ازسرنو تازہ ہو جاتا ہے
اگر کوئی یہ کہے کہ ایسا ایمان تو تقلیدی ایمان ہے ایسا نہیں یہ کہنا غلط ہے۔
بلکہ یہ ایک یقین ہے جو دل میں جما ہوا بیٹھا ہوا ہے بخلاف اس کے تقلید
اس کو کہتے ہیں جس میں یقین کی صفت نہ ہو مثلاً اگر کسی کو کچھ کرنا ہوا اور وہ اس
کو دیکھے بھالے یا سے سوچے سمجھے بغیر اس میں کود پڑے کسی کی اندھی پیروی
کرنے لگے مقلد و تابع ہو جائے بخلاف اس کے اگر کسی کے اعتقاد میں دیکھنے
بھالنے سوچنے سمجھنے' سننے سے تازگی آ جائے تو یہ تقلید نہیں' ایمانِ تقلیدی وہ
ہے جس میں شک وشبہ آ جانے سے وہ جاتا رہتا ہے لیکن تحقیق کے بعد تقلید
میں آئے ہوئے کا نور ایمان دل میں ایسا اتر جاتا ہے کہ وہ کسی شک وشبہ
سے زائل نہیں ہوتا بلکہ ہزاروں شبہات وسینکڑوں شک بھی آئیں یا ڈالے
جائیں تو اس کا ایمان جوں کا توں رہتا ہے یہ اور بات ہے کہ کسی کے نورِ ایمان
ہی کو اٹھا لیں جب یہ اٹھ جاتا ہے تو کوئی دلیل فائدہ نہیں دیتی۔ اَعُوذُ بِاللہِ
من ھذا الحال (اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ ایسے حال سے) یہ سمجھ لو کہ دلیلیں
طلب کریں تو وہ دلیل پر منحصر نہیں' متکلمین کے دلائل آیات وعلامات کے
لحاظ سے ایمان کے بارے میں بہت ہیں' اب اسلام دنیا میں ایمان تقلیدی
نہیں رہا۔ اس کی دلیلیں' اس کی حقانیت واضح ہو چکی ہے۔ اگر کبھی غفلت

کی تاریکی، وسوسہ اس کی گرفتاری، عادات کی زبردستی سے یا لوگوں کی باتوں سے
غیروں کے بہکانے سے شک وشبہ پیدا ہوکر ایک بری طرح کی حیرانی دماغ میں
وقتیہ طور سے آجائے تو اس کے لئے بھی صبر کی ضرورت ہے۔ تاکہ قدم ڈگمگا نہ جائیں
اور استقامت کے مرکز سے ہٹ نہ جائیں۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ تکلف سے
زبردستی سے اپنے آپ کو عقائد پر ثابت قدم رکھیں اپنے خیالات کو ادھر اُدھر
بھٹکنے نہ دیں باطل خیال بیہودہ باتوں سے دل وزبان کو روک رکھیں اللہ تعالیٰ
کے نام " نُورٌ ۔ هَادِیٌ" کو سند بنا کر اس کی نگہبانی میں آجائیں ۔ فَالَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَاعْتَصِمُوْا بِہٖ (اے ایمان والو۔ اللہ پر ایمان لائے ہو تو اس
کی عصمت میں رہو) پر اور جمال وکمال محمدی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ
کی خوبی صدق اور حقانیت پر نظر لگائے ہوئے رہیں تاکہ وہ غبار بیٹھ جائے
اندھیرا دھواں جاتا رہے اور اس نور کا پرتو (سایہ) پہلے سے زیادہ دل پر پڑنے
لگ جائے۔ نور معرفت کے ظہور سے دل کی کشادگی وبہتری ہاتھ آجائے، تاریکی
تنگی۔ انکار کے دور ہونے کے بعد وہ اور زیادہ قوی اور روشن ہو جائے کیونکہ
فراق کے بعد وصال اور دوری کے بعد نزدیکی میں کسی کے پردے میں جلنے کے
بعد دکھ جانے سے دیدار کا ذوق نہایت مزیدار اور اس میں پہلے سے زیادہ
لذت ملتی ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ ہر چیز کی حقیقی خوبی اس کے خلاف اور ضد کے
اچھی طرح سے ظاہر اور روشن ہو جانے کے بعد کھل جاتی ہے۔ اگر بے صبری کر کیا
فوراً اپنی جگہ سے ہل جائیں، وہم کے راستے پر چل کھڑے ہو جائیں، وسواس کے
ہاتھوں میں پھنس جائیں، یقین کے سرمایہ کو ڈبو دیں، کفر کے گڑھے میں گر جائیں،
قرآن کی آیتوں کو عقل وسوسہ وہم کے ساتھ ٹکرا دیں، اہل فلسفہ کی تقلید کریں
تو ایسا کرنا حقیقی صبر اور ثابت قدمی کے خلاف ہے بلکہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ

آیتوں کی حقانیت علم الٰہی میں جو کچھ ارادہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ حق ہے۔ اگرچہ ہم کو اس کی اطلاع نہیں اگر کسی کا تصور آتا بھی رہے تو یہ ایمان کے حاصل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح اختیار کے ثابت کرنے کے مسئلہ میں ایمان والوں کے لئے شرع کے راستہ پر چلنے کے سوا چارہ نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ اعتقاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ پہلے ہی سے تقدیر بنا دی گئی ہے ضرورتاً متشابہات (قرآن شریف کی وہ آیتیں جن کے معنی مخفی و پوشیدہ ہیں) سے اس مرتبہ میں آنا پڑتا ہے اور اس روش پر چلنے سے کام زیادہ آسان ہوجاتا ہے ۔

زبان تازہ کردن باقرار تو   نہ انگیختن علت از کار تو

(تیری بات مان کر اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا تیرے کام میں کسی علت کو آنے نہ دینا)

اعتقاد سے متعلق صبر کا جو بیان تھا وہ کر دیا گیا اب سنیئے ایک صبر وہ بھی ہوتا ہے جو عمل کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں کسی عمل یا کسی کام کے کرنے میں جب تک صبر کو کام میں نہ لائیں کوئی عمل یا کام اچھی صورت میں اچھی طرح سے وجود میں نہیں آتا۔ بہترین طریقے یا انتہائی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پورا ہونا چاہیئے نہیں ہوتا۔ صبر سکون کے ساتھ اچھی طرح ادا نہ ہو تو کوئی نتیجہ یا اثر پیدا نہیں ہوتا بلکہ کیا ہوا نہ کئے ہوئے کے برابر اور بعض حالات میں بعض صورتوں میں کرنا نہ کرنے سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ ضرب المثل ہے کہ بیماری کا دوبارہ لوٹ آنا بیماری سے بدتر ہے

مومن کے لئے بزرگ ترین عمل بہترین کام، نزدیکی میں لانے والی عبادت "نماز ہے جس میں بندہ اپنے رب سے بہت قریب ہوجاتا ہے۔ جب سجدہ کرتا یا سجدہ میں ہوتا ہے تو اس کو صبر کی ضرورت ہے۔ وضو اچھی طرح کرنے اس

کے آداب و شرائط پورے ادا ہونے وضو کرتے ہوئے حضور پیدا ہونے کے
لئے بھی صبر لازمی ہے۔ وضو میں جتنا حضور آئے گا۔ اسی لحاظ سے نماز میں حضور
پیدا ہوگا۔ کیونکہ وضو نماز کا پیش خیمہ ہے۔ نماز میں ہوجانے کے بعد قرأت قرآن
تکبیر و تسبیح، ارکان کی ادائی تعدیل (برابری یکسانی) کے ساتھ ادا ہونے کے
لئے بھی صبر ایک لازمی چیز ہے۔ قرآن شریف سے جو کچھ نماز میں پڑھا جاتا ہے
اس میں حضور و خشوع، قرأت کی رعایت، ترتیل معنی کی سوچ بچار سُنت کے
موافق ہر وقت کی نمازوں کی ادائی، ان میں سورتوں کا پڑھنا یہ سب صبر ہی ہو تو
ہوسکتا ہے خصوصاً رات میں سوکر اُٹھنے کے بعد کی نماز یعنی تہجد جس میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے سورے پڑھا کرتے تھے، رکوع سجدہ قومہ، جلسہ
اسی اندازے کیا کرتے تھے، قرآن کے پڑھنے میں زبان، کان، دل کو برابر لگائے
رکھنے کا حکم ہے۔ یعنی جو کچھ زبان سے ادا ہو اس کو کان سُنے، دل سمجھے، رکوع،
قومہ، سجدہ جلسہ میں تعدیل ہو۔ جو تسبیحات ان میں پڑھی جائیں ان سے اس
کی کبریائی اس کے جلال، شہود، عظمت و برتری کا تصور اپنے حال کے
لحاظ سے جو کچھ بھی ہوسکتا ہے وہ کرنا لازمی ہے خدا کے ساتھ جس کا جو حال
ہو عبادت کی ادائی بھی اسی مناسبت سے ہونی ضروری ہے۔ تمکین کے مقام
میں استقرار حالتِ معراج کا تخیل، تشہد یعنی اَلتحیات لِلّٰہِ کے پڑھنے میں کہ یہ
معراج میں اُتری ہے، اس کا لانا قائم رکھنا صبر ہی سے ہوسکتا ہے۔ بسلام
کے بعد وہ دعائیں جو حدیث شریف میں آئی ہیں مانگنا ضروری ہے۔ اگر امام کے
پیچھے ہوں تو سلام کے بعد دعا کے ختم تک بیٹھے رہنا، بے چینی سے نہ اُٹھنا
ان سب باتوں کے لئے بھی صبر کی ضرورت ہے۔ صبر نہ ہو تو ان امور کی
ادائی جیسی کہ ہونی چاہیئے نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

زمانے میں جو لوگ جلد اُٹھ جاتے تھے اذکر و تسبیح و عا کے پابند نہ ہوتے تھے۔ ان کو بھیڑیہ قوم کہتے تھے۔ در اصل یہ لفظ یعنی "سرجان" بھیڑے کے معنی میں آیا ہے یہ اس گروہ کو نام دیا گیا تھا جو جنگ میں شریک ہوتے اور تلوار بھی چلاتے تھے لیکن لڑائی ختم ہونے سے پہلے اپنا راستہ لے لیتے بھاگ جاتے۔ کام پورا نہ کرتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد آفتاب نکلنے تک قبلہ کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھا رہنا، ذکر حق میں مشغول رہنا سنت مؤکدہ ہے۔ فرشتوں کی دعائے مغفرت و رحمت کا سبب ہے۔ یہ وہ عمل ہے کہ جس کا بدلہ اسی دنیا میں نقد مل جاتا ہے۔

بعض مشائخ یہ کہتے ہیں فجر کی نماز کے بعد تنہائی (خلوت) میں چلے جائیں ذکر حق میں مشغول ہو جائیں تو ذکر کے ثواب وقت کی خاصیت کو پالیتے ہیں۔ اس سے صبر کا ثواب جگہ کا معین کر لینا جو حدیث میں فرمایا گیا۔ وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس طرح کرنے میں ان حضرات کی نیت جمعیت سکون و اطمینان حاصل ہونے اور دکھاوے سے بچنے کی ہوتی ہے۔ لیکن مسجد میں ٹھیرنا قولاً، فعلاً سنت کے موافق ہے۔ مغرب و عشا کے درمیان ذکر اشغال میں رہنے کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ مغرب کے بعد سونا عشا کے بعد بات کرنا مکروہ ہے۔ اس عمل کے کرنے کے لئے بھی صبر کی ضرورت ہے۔

بلاؤں، شدتوں، سختیوں، حوادث لوگوں کے ظلم و ستم، اہل و عیال کے حقوق کی ادائی، رعایت حقوق، احباب اعزہ و اقربا اور اسی طرح کے اور معاملات میں بھی صبر کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ سلوک میں جو ریاضتیں کرنی ہوتی ہیں جو مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ کم کھانا، کم سونا،

کم بات کرنا، لوگوں سے میل جول کم رکھنا، مالوفات و مرغوبات کا ترک، ترتیب و استقامت پیدا کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے بھی انتہائی صبر درکار ہے۔ خصوصاً مقصد کے حصول راستہ کے بند ہونے اور کھلنے میں جو دیری ہوتی ہے وہ بڑی کٹھن ہوا کرتی ہے۔ اس پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ اگر تقدیر سے معاملہ بن جائے۔ کشف ہاتھ آجائے۔ مقامات و کمالات حاصل ہو جائیں۔ تو ان کے چھپانے کی ضرورت واقع ہوتی ہے۔ مزے میں آجانے اترانے۔ خوشی و مسرت کی صورت بنانے اور افتخار میں آنے ظاہر کرنے اظہار میں آنے سے بچنے کے لیے بھی صبر استقلال کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے کہ اخلاص و صدق کا طریقہ یہی ہے۔
حسن و جمال، فضل و کمال کے باوجود تواضع و انکساری کرنا، عاجزی درماندگی میں ٹھہرے رہنا، شکستگی نامرادی کی داد دینا، چھوٹوں کو نظر عنایت و شفقت سے دیکھنا بزرگوں کا ادب لحاظ کرنا۔ اپنے حال اور اپنی خوبیوں کو اور زیادہ آراستہ کرنا۔ پہلے سے زیادہ سب کا لحاظ کرنا اپنے آپ کو گرائے ہوئے رکھنا بڑی اعلیٰ حوصلگی ہے صبر کا انتہائی مقام یہی ہے۔

ایک صبر وہ ہے جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ کسی کے دعوائے کمال سے انکار کرنے سے پہلے خاموشی سنجیدگی سے اس کے کمال پر غور کرنا، جب تک اس کے جھوٹے ہونے کی کافی دلیلیں ہاتھ نہ آجائیں۔ ثابت نہ ہو جائیں، خاموش رہنا ہے کیونکہ کوئی ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں دونوں صورتیں صدق و کذب کی نہ ہوں۔ سچ کے قرینہ کو ترجیح دینا جھوٹ کے قرائن سے آنکھ بچا جانا ہی نہیں بلکہ ایسے شبہ میں رہنا چاہیئے کہ ممکن ہے ہو، ممکن ہے کہ نہ ہو، مناسب صورت یہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہزاروں کافروں کو ایمان کے گمان سے مومن سمجھنا ایک مومن کو احتمال کفر سے کافر ٹھہرانے سے بدرجہا بہتر ہے یہ آیتِ قرآنی اس بارے

میں کافی ہے کہ وان یک کاذباً فعلیہ کفرہ وان یک صادقاً یصبکم بعض الذی یعدکم (اگر کوئی جھوٹا ہے اس کی جھوٹ اس کا کفر اسی پر ہے۔ اگر وہ سچا ہے تو اس کا ایمان اسی کے ساتھ ہے) اس کے اعتقاد۔ انقیاد اطاعت پر تحریہ و امتحان کے بغیر صبر کرنا' رائے کے قائم کرنے میں جلدی نہ کرنا' احتیاط برتنا' کسی دلیل و شبہات سے کوئی حکم نہ لگانا' بہترین طریقہ ہے تاکہ یہ وحشت و پریشانی کا سبب نہ بن جائے۔ اللہ بچانے والا ہے سب کو اپنی عصمت و حفاظت میں لینے والا وہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ قرآن میں فرماتا ہے کہ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (اے مومنو صبر کرو۔ صبر پر رہو دل کو اللہ سے لگائے رہو تقویٰ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔) عاقبت بخیر ہو۔

(اکیاسواں مکتوب)

مکتوب (۸۱)

دُنیا کی فنا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

پاک ہے وہ مالک جو زندہ ہے۔ نہ مرتا ہے نہ فنا ہوتا ہے نہ فوت ہوتا ہے اس سانحہ (جان پر بن آنے والا واقعہ) کے واقع ہو جانے سے لوگوں کے دلوں کو جو رنج و صدمہ ہوا اس کش مکش میں جو رنج و کدورت' تکلیف چھا گئی۔ حیرت و وحشت جو اس واقعہ کے یکایک واقع ہو جانے سے ہوئی۔ وہ تحریر و تقریر میں نہیں آسکتی۔ کیا کیا جائے۔ سنت الٰہی اسی طرح جاری ہے۔ جب تک ہونی ہے اسی طرح ہوتی رہے گی۔ جب تک دنیا ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ بادشاہ ہو کہ

فقیر کے لئے سب کے لئے یہی راستہ ہے جو دنیا میں آیا۔ وہ دنیا سے گیا۔ فنا ہوا اللہ ہی رہنے والا ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حق جل علیٰ اس امیر کو دولت وشوکت کے ساتھ ساتھ بلند مراتب۔ روشن طالع۔ اچھے نصیبے عطا کرے۔ جاہ وجلال کے ساتھ رکھے ملک کے بادشاہ کو اقبال اور اس کی ساری رعایا برایا خاص وعام کو خصوصاً اہلِ اسلام کو اپنے فضل سے امن واماں۔ عدل واحسان کے سایہ میں سب آفتوں ساری بری باتوں سے ماموں محفوظ رکھے۔

اے میرے اللہ درست وٹھیک بنا دے۔ امام اور اُمت حاکم ورعیت کو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت دے۔ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے کی ہدایت عطا فرما۔ بڑے بڑے مشائخین قدس اللہ رہم سے یہ دعا مروی ہے۔ اس طرح کی دعا ہمیشہ کرتے رہنا نتیجہ لاتا دنیا ودین کی سعادت کا سبب ظاہر وباطن کے امن واماں کی وجہ بن جاتا ہے۔

دوسری دعا یہ ہے۔ اے ہمارے پروردگار درست وٹھیک کر دے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو اے ہمارے پروردگار رحم فرما اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اے ہمارے پروردگار بخش دے مغفرت عطا فرما امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بزرگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو کوئی ہمیشہ ہر وقت یہ دعا کرتا رہے وہ ابدال کا مرتبہ پاتا ہے۔ ابدال کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اللہ توفیق دینے والا ہے۔

دنیا کی بے ثباتی اس کی فنا کے متعلق کیا کہیں کیا لکھیں۔ رات دن آنکھوں کے سامنے ہر چیز، شئی فنا ہوتی رہتی ہے۔ آج ہے۔ کل نہیں۔ بعض عقلمندوں نے کہا ہے کہ دنیا ڈھلتی ہوئی چھاؤں، پریشان خواب ہے بعضوں نے یہ کہا کہ یہ گزرتے ہوئے ابر کے جیسی۔ یا شیطانی خواب کی سی ہے۔ ہر سمجھدار یہ سمجھ سکتا ہے۔ اس

نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ پہلی مثال دنیا کے فنا اور اس کی بے ثباتی کی ہے اور دوسری مثال اس کی تحقیر اس کے ناچیز اور کم قیمت ہونے کی ہے۔ کسی نے خوب کہا "یہ خواب ہے یا ہوا یا افسانہ"۔ موت کا آنا دنیا سے جانا سب کا مانا ہوا ہے یہ آجاتی ہے۔ لوگ مرجاتے ہیں۔ اس میں کسی کو شک ہے نہ شبہ سب کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن مرنا اٹل ہے۔ ہر ایک کے لئے موت ہے لیکن آدمی اس سے غافل بیٹھا ہوا ہے۔ عبرت لینے، ہوشیار ہونے، حیرت میں آنے سے آنکھیں بند کئے ہوئے، غفلت کے بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ کسی کو اس کی پروا نہیں کہ کیسا سخت ومشکل کام سامنے ہے۔ سوال کیا جاتا ہے کہ ایسا یقین جس میں شک نہ ہو، وہ شک لیا ہوا یقین کونسا ہے مطلب یہ کہ ایسی چیز جس کو آدمی یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ آنے والی ہے اس یقین کے ہوتے ہوئے بھی اس میں ایسا شک رکھتا ہے جیسے کہ وہ آنے والی ہی نہ ہوں، وہ اس کو جانتا ہی نہیں۔ وہ موت ہے۔ اس کو یقین کے ساتھ ہر شخص جانتا ہے کہ آنے والی ہے لیکن زندگی اس طرح سے کرتا ہے اور اس نہج سے دنیا میں گزر کرتا ہے گویا اس کے لئے موت ہے ہی نہیں وہ موت کو جانتا ہی نہیں۔ اللہ برکت والا اور برکت دینے والا بھی وہی ہے۔ سُبحان اللہ (پاک ذات اللہ) اس کی یہ عجیب قدرت ہے۔ اس نے غفلت کا پردہ ایسا ڈالا ہے جس سے آدمی بھول میں آگیا۔ دھوکے میں مبتلا ہو گیا یہ کیسا پردہ اس پر پڑگیا کہ موت کا اس کو خیال تک نہیں آتا۔ شیر، اور اس سے بھاگنے والے آدمی کی حکایت اس سے نہایت مناسبت رکھتی ہے وہ یہ کہ ایک شیر کسی جنگل میں کسی آدمی کے پیچھے پڑگیا آدمی بھاگنے لگ گیا بھاگتے بھاگتے تنگ آکر ایک ویران کنوئیں میں کود پڑا۔ کنوئیں میں درخت تھا اس میں لٹک گیا نیچے کنوئیں میں دیکھا تو

ایک منہ کھولا ہوا اژدہا بیٹھا ہوا پایا۔ اوپر دیکھا تو شیر اس کنویں پر کھڑا ہوا ہے
اس نے دل میں سوچا کہ گرتا ہوں تو اژدہا کھا جاتا ہے۔ اوپر جاتا ہوں تو شیر کھا لیتا
ہے تھوڑی دیر اسی سوچ میں تھا کہ اس کے دیکھنے میں یہ آیا کہ چند چوہے آئے ہیں اور
اس ڈالی کو جس پر وہ تھما ہوا ہے کتر رہے ہیں وہ اور گھبرا گیا۔ کہ اب کیا کیا جائے
اوپر جاتا ہوں تو شیر ہے نیچے اترتا ہوں تو اژدہا ہے وہ چپ ہو گیا۔ اسی سوچ
و فکر میں تھا کہ اس کو شہد کا چھتہ نظر آیا۔ اس کے نظر آتے ہی وہ شیر اژدہے چوہوں
کو بھول گیا۔ انگلی ڈال کر شہد کی مکھیوں کی تکلیف رسانی سے متوجہ ہوئے بغیر شہد
چاٹنے لگ گیا اور ابھی پورا چاٹا بھی نہ تھا کہ ڈالی کٹ گئی وہ اژدہے کے منہ
میں پہنچ گیا۔ ہم ویسے ہی ہیں جیسا کہ کنویں میں گرا ہوا شہد کا چاٹنے والا تھا ایسے
ہی کنویں میں ہم ہیں جس کو دنیا کہتے ہیں۔ موت کے وقت کا شیر ہمارے پیچھے پڑا
ہوا ہے۔ آج یا کل ہم موت کے اژدہے کے منہ میں جانے والے ہیں کاشش
ایسا ہوتا کہ جینے کی مدت معین ہوتی۔ اس سفر کی طوالت کہ یہ کتنا لمبا سفر ہے
کہاں ختم ہوگا معلوم ہوتا۔ تاکہ اس کے لحاظ سے ایک روش اپنے لئے مقرر کر لیتے
اور اس راستہ کو سمجھ بوجھ کر آہستگی کے ساتھ طے کر لیتے۔ ایک قسم کی فراغت۔ ایک
طرح کا قرار پاتے۔ چند سانسیں راحت کی تو لیتے۔ یہ معلوم ہی نہیں کہ عمر کتنی ہے
کتنی مدت تک ہمیں یہاں رہنا ہے۔ اس سفر کی دوری کتنی ہے۔ کب تک
سفر میں رہنا ہے۔ قدم قدم پر ایک سانس سے دوسری سانس تک خطرہ ہی
خطرہ لگا رہتا ہے کہ شاید یہی آخری سانس ہو دن، ہفتہ، مہینہ کونسا ہے۔
کب تک چلتا ہے اگر فرض کریں کہ معلوم بھی ہوتا اور بہت دن کا بھی ہوتا تو کیا
ہوتا۔ جب یہاں سے جانا ہی ٹھیرا تو کیا دیر کیا سویر۔ جب اس کو چھوڑنا ہی ہے
معلوم ہو تو کیا نہ معلوم ہو تو کیا۔ کم مدت ہو تو کیا زیادہ مدت ہو تو کیا۔ کسی نے

کیا اچھا کہا ہے کہ جب ہمیں ڈوبنا ہی ہے ہم ڈوبنے ہی کے لئے بنائے گئے ہیں تو اب ڈوبیں تو کیا جب ڈوبیں تو کیا۔ کم اور زیادہ مدت میں فرق ہی کیا ہے سو سال رہیں یا ایک روز ہی رہیں اس آراستہ دلپسند گھر سے جانا ہے اسی صندل کے گھر ہیں کہ دنیا ہے۔ کبھی ماتم ہے اور کبھی شادی ہے" شادی ہو یا غمی جگہ کو صاف کیا کرتے ہیں۔ کبھی سر پیٹتے ہیں۔ کبھی ناچتے ہیں اگر دنیا ہمیشہ کے لئے ہوتی۔ ہمیشہ رہتی۔ اس میں ہمیشہ رہنا ہوتا۔ دنیا کے اسباب ہمیشہ کے لئے ہوتے اس میں عیش و فراغت دل کی آسائش ہوتی۔ فرصت نصیب ہوتی۔ یکساں اور ایک ہی طرح کی ہوتی۔ ایسی صورت میں اگر کوئی مولیٰ تعالیٰ کی محبت اور اس عالم کے شوق سے صبر کرتا، دنیا کی آرائشوں، زینتوں کی طرف التفات نہ کرتا تو ایک کام ہوتا۔ مردانگی ہوتی۔ جب کہ فنا ہونے والی مٹ مٹا جانے والی سرتاپا وحشت، کدورت، محنت، ہزاروں بلائیں، ایک سے ایک زیادہ رکھنے والی ہے اس کا چھوڑنا ایسا کونسا بڑا کام ایسی کونسی اہم بات اور اہمیت رکھتی ہے کہ جس پر ناز کریں، اترائیں۔ اور اس کے جاتے رہنے سے افسوس کریں حسرت میں مریں۔ پچھتائیں۔ اگر اس سے کوئی ہاتھ دھولے۔ ضرورت کے موافق اس سے کام لے اس میں کام کرے۔ چند قدم آگے بڑھ جائے تو اس کا پورے طور سے چھوڑ دینا ممکن ہے اس میں لگے رہنا اپنا وقت بیکار کھونا اپنے آپ پر اس کا احسان لینا ہے۔ یہ وہ شراب ہے کہ جس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اس کا ایک گھونٹ یا ایک قطرہ بھی پی لیں تو وہ حرص کو بڑھاتی خواہش کو زیادہ کردیتی ہے۔ اس کے پیتے ہی رہنے کو جی چاہتا ہے جیسے جیسے پیتے جاتے ہیں اتنی ہی مستی میں لاکر بیخود بے خبر کرڈالتی ہے۔ جب کوئی اس حالت تک پہنچ جاتا ہے تو نصیحت اس پر کچھ اثر نہیں کرتی۔ کوئی بات اس کے کان

سے دل میں نہیں اُترتی عاقبت کا ڈر اس میں نہیں ہوتا ہستی وغرور دنیا کی حکمرانی کا غرۃ اس کو اس حد تک لے جاتا ہے کہ وہ خدائی و پیغمبری کا دعویٰ کرنے لگ جاتا ہے۔ فرعون جو مصر کا بادشاہ تھا جس کی ریاست کے حدود صرف دس دن کے راستہ سے زیادہ نہ تھے خدائی کا دعوی کر گیا۔ دوسروں کے متعلق کیا کہا جائے۔ خدا سے بے خبر فرعون یہ تک نہیں جانتا تھا کہ زمین و آسمان خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس نے تو ایک مچھر یا مکھی تک نہیں بنائی۔ پھر یہ دعویٰ کیسا۔ وہ دیوانہ بھی نہ تھا جس سے ہم یہ سمجھ لیں کہ وہ دیوانہ پن میں ایسا کہہ گیا۔ اگر وہ دیوانہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ اس کے پاس اپنی طرف بلانے کے لئے (دعوت اسلام کے لئے) کیوں بھیجتا۔ انبیا علیہم السلام صلوٰۃ علیہ وسلامہ کی دعوت (خدا کی طرف بلانا) عقلمندوں کے لئے ہے۔ دیوانوں کے لئے نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ فرعون کی بکواس، پریشان خیالی بڑے ملک و سلطنت کی وجہ سے تھی اسی نے اس کو اس حال میں لا ڈالا۔

ایک بات سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ بعض کی سرشت (طبیعت۔ پیدائش خو) غرور حماقت کے خمیر سے بنائی گئی ہے سمجھنا، تمیز کرنا ان سے اٹھا لیا گیا ہے باوجود اچھی عقل ہونے کے وہ دیوانوں کے کام اور دیوانوں کی سی باتیں کیا کرتے ہیں۔ وہ دیوانے نہیں ہوتے، دیوانوں کی صفت رکھتے ہیں۔ ایک ایسا بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پیغمبر کہتا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ پیغمبر کیا ہوتا اور کس کو کہتے ہیں۔ سنو پیغمبری درمیانی واسطہ ہے۔ خدا و بندہ میں: خدا کا پیغام بندوں کو پہنچاتا ہے۔ خدا سے فیض لے کے بندوں کو فیض پہنچاتا ہے۔ پیغمبر ابتدائی عمر سے آخر تک گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں عالم قدس و ملکوت سے انھیں اتصال ہوتا ہے۔ ایک فرشتہ ان کے پاس آکر خدا کا پیغام پہنچاتا ہے۔

پیغمبر معجزے دکھلاتے اور زمین و آسمان میں تصرف کرتے ہیں۔ چاند کی ٹکیہ کو انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ انگلیوں سے پانی کے چشمے بہادیتے ہیں۔ انھیں درخت سجدہ اور پتھر، سبزہ سلام کرتے ہیں۔ خدا کے پاس سے ان پر کتاب نازل ہوتی ہے۔ صاحب کتاب ہوتے ہیں۔ انسان، جنات سب جمع ہوں تو ایک سورۃ خدائے تعالیٰ کی کتاب کے جیسی نہیں بنا سکتے۔ اگر سارے دنیا کے علما اور عقلمند جمع ہو جائیں اور اس کی تفسیر کرنا چاہئیں تو وہ ختم نہ ہو پوری تفسیر نہ کر سکیں۔ پیغمبر شریعت کی بنا ڈالتے ہیں۔ دنیا کو نور علم نور ایمان سے منور کر دیتے ہیں۔ کافروں کو کفر سے جاہلوں کو جہل سے نکال لاتے ہیں۔ دور والوں کو نزدیک بھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستہ پر چلاتے۔ لے چلتے ہیں۔ ظاہر و باطن، صورت و سیرت کی ساری خوبیوں میں سب سے زیادہ بہت بلند و بالا خوب تر ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خوبی میں ان کی طرح کا یا ان کے جیسا نہیں ہوتا۔ خاص خوبیوں میں انتہائی خوبی کے ساتھ موصوف و متصرف ہوتے ہیں۔ پیغمبر بہتری آراستگی سے آراستہ صلاح و فلاح کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کی روشنی اعتقاد کی پختگی سے بھی زینت پائے ہوئے ہوتی ہے ان کے نزدیک والے، علم، عمل، زہد، تقویٰ نورانیت میں سب سے بڑھے ہوئے اور سب سے بہترین ہوتے ہیں ان کی پیروی کی وجہ سے کمالات کے جامع اور خوارق و کرامات کے مظہر ہو جاتے ہیں۔ پیغمبری صرف دعوے غلبۂ سلطنت و شوکت نہیں پیغمبر کے لئے وہ سب لوازم ضروری ہیں جو مذکور ہوئے۔ لیکن اُمت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کند ذہنی ایسی گمراہی سے پناہ مانگتا ہوں اللہ کی۔ اللہ ہی کی پناہ میں آتا ہوں۔

ہر آدمی میں تین چیزیں ہوتی ہیں جن کو نفس، قلب، روح کہتے ہیں۔

نفس اس عالم کون وفساد (دنیا) سے تعلق رکھتا ہے، جسمانی وحسی لذتیں اٹھانا اس کا کمال ہے۔ نفس مٹی اور اندھیرے سے بنایا گیا ہے یہی اس کے بدن کے اجزا ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے اور بھی اجزا ہیں جن سے نسبت پا جانے سے اس میں اتنی لطافت، نورانیت آگئی کہ وہ اپنے محسوسات سے ہر چیز کو دریافت کر لیتا ہے۔ سننے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے، چھونے کی حس اس میں ہونے سے یہ لطیف ومنور ہے لیکن لذات عقلی روحانی کی نفس کو خبر نہیں۔ نفس ہی نے آدمی کو اس عالم میں پھنسا رکھا اپنی گرفت میں کر لیا ہے۔

روح انتہائی لطیف نورانی ہی نورانی ہے۔ عالم بالا کی ہے۔ عالم بالا کی ہونے سے اس کی توجہ ہمیشہ عالم قدس ہی کی طرف رہتی اور اسی سے لذتیں لیتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے علم اس کی معرفت اس کی ذات کی پہچان اور اس کے صفات کا انصاف (صفت اختیار کرنا) اس کو نصیب ہے بدن کے ساتھ اس کا تعلق۔ نفس کے ساتھ اختلاط (میل ملاپ) کے باعث یہ نفس کی محبت میں گرفتار ہے۔ اس کے عشق میں سرگشتہ وپریشان ہو جانے سے اپنا رشتہ گم اپنا مقصود و مطلوب بھول بھال گئی ہے۔ نفس کے ساتھ روح کے تعلق کو ایسا سمجھو جیسا کہ مرد اور عورت میں ہوا کرتا ہے یہ بھی بتلایا گیا ہے نفس و روح کے ملنے سے قلب (دل) پیدا ہوا۔ دل ہمیشہ الٹ پھیر میں رہتا ہے۔ کبھی روح کی طرف جاتا کبھی نفس کی طرف آتا ہے انقلاب (گردش وچکر) میں ہے۔ احکام روحانی غالب ہو جائیں۔ تو نفس وقلب اس کے تابع ہو جاتے ہیں یہ ایک نادر صورت ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں خیر صلاح ہاتھ آتا ہے اگر نفس غالب ہو جائے، غلبہ پا جائے تو روح اور قلب اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں شر وفساد برپا

ہونے لگتا ہے۔ یہ بہت مشہور بات ہے۔ اپنے مقام محل میں اس سے
زیادہ صاف و صریح اس کا بیان کیا گیا ہے۔ اس گفتگو سے ہمارا مقصد وہ
تذبذب اور کھینچ تان بیان کرنا تھا جس میں آدمی پھنس جایا کرتا ہے۔ عقل
ایک طرف، خواہش دوسری طرف لے جانا چاہتی ہے جس کی وجہ سے وہ بڑی
مشکل میں گرفتار ہے۔ اس دنیا کے رنج و غم محنت و مشقت اور تکالیف و
مصیبتیں، سختیاں اس پر مزید اضافہ ہیں جو آدمی کے سر پر پڑتی رہتی ہیں دوسری
طرف احوال آخرت، اور اس عالم کے سختیاں ہیں۔ جن کو وہ تفصیل کے ساتھ سوچتا،
تصور میں لاتا ہے تو ایک چکر میں آکر فکر و رنج سے گھل جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے
کہ اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو بہت کم ہنستے بہت زیادہ روتے۔ یعنی آخرت میں
کیا پیش آئیگا۔ کیا ہونے والا ہے۔ کیا ہوگا تو تم بہت ہی کم ہنستے اور بہت روتے۔
حکمت، آزمائش اور تقاضائے الٰہی نے عالم آخرت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے وہ پردۂ
غیب میں ہے، جو کچھ ہم دیکھتے یا پاتے ہیں وہ عالم ظاہر ہے۔ اسی سے ہم دھوکہ کھا گئے مقصد کا سرا
کھو بیٹھے ہیں۔ جیسا اس کو جاننا چاہیئے تھا نہ جانا۔ دنیا کی زندگی کے ظاہری
حالات کے دباؤ میں آخرت سے غافل ہو گئے، ہیں سچی خبر دینے والے، سچے
حضرات جو انبیاء علیہم السلام صلواۃ اللہ وسلامہ علیہم اجمعین ہیں وہ اس عالم
کی خبر پہنچاتے، علم و ہدایت کے نور دکھلاتے ہیں لیکن نفس و طبیعت کی
اندھیریوں میں گھرے ہوئے ہونے سے لوگ اس پر کان نہیں دھرتے، سوچ بچار
کر کے آگے قدم نہیں بڑھاتے، عمل کی طرف نہیں آتے۔ حقیقت حال جو
کچھ ہے وہ مرنے کے بعد معلوم ہو جائے گی۔ سب حال و احوال کھل جائیگا
کہ معاملہ کیا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ اس وقت تک ٹھہر ارہ جب تک
کہ پردہ اٹھا دیں۔ آج رات تو نے جو کیا ہے وہ کل تجھ پر ظاہر ہو جائے گا۔"

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ لوگ سوئے ہوئے ہیں، جب مریں گے ہوشیار ہوجائیں گے۔ لوگ جب تک عالم اسباب میں ہیں، سب ایک ہی کشتی میں ہیں سب سوئے ہوئے ہیں۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه تم اگر یہ کہو کہ پھر کیا کرنا چاہیئے۔ کہاں جانا چاہیئے۔ یہ باتیں ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ دنیا کا ترک لوگوں سے جدائی علیحدگی، طبیعت کے خلاف نفس کی مخالفت اختیار کرنے کے لئے فرمایا جاتا ہے۔ اس حال کا ہاتھ آنا محال، اس کام میں رہنا ایسا ہونا مشکل ہے۔ آدمی جب تک بقید حیات (زندہ اور دنیا میں) ہے دنیا کا انتظام و قاعدہ یہی ہے کہ دنیا کے اسباب اس کی گزران۔ ملنے جلنے کے طریقے، طبیعت کے آرام، نفس کی آسائش کے سوائے چارہ نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک بات کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں اس کی حقیقت اس کی تہہ تک نہ پہنچیں وہ بات دل میں نہیں اترتی۔ حیرت و پریشانی کے سوائے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ دنیا کا ترک کرنا۔ مخلوق سے الگ رہنا نفس و طبیعت کے خلاف چلنا ضروری ہے کہنے کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ حق کے خلاف نہ کریں سیدھے راستہ سے نہ بھٹکیں۔ شرع شریف کے حدود سے نکل نہ جائیں۔ جو راستہ و طریقہ کہ دین میں مقرر کردیا گیا ہے اس کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ لوگوں کے ساتھ اس طرح رہیں اور ایسا معاملہ کریں کہ ظاہر میں خلق کے ساتھ اور باطن میں حق کے ساتھ ہوں۔ بظاہر دنیا میں دنیا والوں کی طرح اور دل سے دنیا کو ترک کئے ہوئے ہیں۔ اگر نفس کے کہے پر چلیں اس کی موافقت میں عمل کریں ایسا چلنا، یہ کام کرنا، اس طریقہ کے خلاف ہوگا۔ محققین کا کہنا یہ ہے کہ اس کہنے سے مقصودِ اصلی، حق کے ساتھ موافقت ہے۔ نفس کی مخالفت نہیں۔ یعنی سالکین جو نفس کے خلاف

کام کرتے ہیں، اس کے خلاف رہتے ہیں تاکہ نفس حق کی موافقت میں آجائے اور سیدھی راہ چلنے لگ جائے۔ سیدھے سچے راستہ پر رہے۔ اگر نفس سیدھے راستہ پر چل رہا ہے تو اس کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ مخالفت کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ دنیا میں بعض فقیر تنگ دست، بعض دولتمند امیر بعض حاکم، بعض محکوم (رعایا) بعض آقا۔ بعض غلام بعض خادم بعض مخدوم وغیرہ وغیرہ ہیں۔ فقیر کے لئے صبر کی۔ دولت مند اور مالدار کے لئے شکر کی۔ امیر کے لئے حکم ماننے کی۔ آقا (مالکوں) کے لئے رحم کی۔ غلاموں کے لئے خدمت کی۔ خادموں کے لئے ادب کی۔ مخدوموں کے لئے عنایت کی ضرورت ہے۔ ان میں کا ہر ایک اپنے مقررہ قاعدہ وطریقہ ولوازم پر جب چلے۔ طریقہ بندگی عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ دے تو وہ۔ واصل اور مقبول درگاہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ ہر گروہ کے ساتھ اس کے ہنر پیشہ کسب کے اعتبار سے سلوک کیا جانا ضروری ہے۔ ہر ایک کا کوئی کام ہنر یا پیشہ ضرور ہوا کرتا ہے۔ اپنے اپنے پیشہ کسب ہنر کے لحاظ سے ہر شخص کام میں لگا ہوا ہے۔ کسب پیشہ، ہنر، کام جو بھی ہوتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی قاعدہ کرنے نہ کرنے کا طریقہ مقرر ہے۔ اگر کوئی قاعدہ کی روشنی میں اسی ڈھب پر اسی کے آداب کے ساتھ کام کرے تو اس کو باقاعدہ ہنرمند کاسب کہتے ہیں۔ شریعت بھی ایک کسب ہے اس کی تبلیغ اسی طرح کی گئی ہے سرورکائنات سید الرسل، صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ نے کسی شخص سے جو کسی ہنر وپیشہ کا تھا۔ اس کو اس سے الگ ہو جانے کے لئے نہیں فرمایا کام۔ کاج۔ کاروبار کے چھوڑ دینے کے لئے نہیں فرمایا۔ زراعت پیشہ کو زراعت (کسان کو کھیتی باڑی کے کام) میں رہنے دیا گیا۔ تاجروں کو

تجارت میں۔ بال بچے والوں کو بال بچوں میں۔ دولتمندوں مالداروں کو
مال و دولت میں۔ فقیر کو فقر و فاقہ میں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ہر جماعت
کے لئے ایک قاعدہ ایک دستورالعمل سے اس کے مطابق کام کرنے کا
طریقہ مقرر فرمادیا گیا۔ تاکہ ہر جماعت اپنے قاعدہ و طریقہ سے کام کیا کرے۔
کوئی اپنے حدود سے باہر نہ ہو سب مقررہ راستہ پر مقررہ قاعدہ وضابطہ
کے ساتھ چلا کریں۔ شارع علیہ السلام سب کو کفرستے اگناہوں سے
باہر لے آئے سب کو ایک ہی دائرہ کے اندر رکھکر یہ بتلایا گیا کہ نیک
بختی کا راز، شریعت کا ماننا اس کے احکام کے آگے سر جھکا دینا ہے۔
شریعت کے احکام پر عمل کرنا۔ اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔ نیک بختی کا
راز اور اسلامیت یہی ہے اس پر یقین رکھنا ضروری و لازمی ہے۔ ہر عمل
کا ایک بدلہ ہر ایک کے لئے ایک جزا یقینی ہے۔ نیک عمل کا نتیجہ نیک
بدعمل کا نتیجہ بُرا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی اس کو
دیکھ لیا جائے گا۔ جس کسی نے ذرہ برابر بدی کی اس کو دیکھ لیا جائے گا
انہا دنتیجہ یہ کہ ایک گروہ ایسا ہے جو اپنے کئے کا بدلہ دنیا ہی میں پانا
چاہتا ہے دنیاوی چیزوں کا خواہشمند و طالب ہے آخرت سے غافل
بے فکر ہے، ایک جماعت ایسی ہے جس کا نظریہ کام کا بدلہ آخرت
میں پانا ہے، دنیا میں جو بدلہ ملے اس کو معمولی سمجھتے ہیں اس کی کوئی قدر
وقیمت ان کے نزدیک نہیں۔ جو شخص اللہ کے واسطے کوئی کام شروع
کرتا ہے تو اس کی اپنی اس میں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کو دنیا
اور آخرت ہاتھ آجاتی ہے۔ اللہ کے پاس دنیا و آخرت کا ثواب پاتا
ہے۔ عاقبت بخیر ہو۔ فقط (سترھواں مکتوب)

مکتوب (۱۲)

دُعائے قنوت کی شرح

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

قنوت کے معنیٰ دعا، طاعت، سکوت، قیام، خشوع کے ہیں۔ ہر معنی ایک خصوصیت و مناسبت رکھتا ہے۔ یہ دعا کہاں اور کب اور کن مواقع میں اور کب پڑھی جائے اس میں اختلاف ضرور ہے لیکن معمولی۔ سب کی مانی اور اختیار کی ہوئی ہے ہر جگہ واوٗ عطف سے نہیں پڑھا کرتے یہ بھی درست ہے۔ بعض مواقع میں اگر واوٗ عطف کے بغیر بھی پڑھیں تو پڑھ سکتے۔ پڑھنا جائز ہے جو قنوت مروی و معروف پڑھا، اور سُنا گیا، بہت مشہور ہے۔ وہی لکھا جا رہا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُكَ ۔ (اے ہمارے اللہ سب کاموں دنیا و آخرت کے سارے امور اور خاص طور سے عبادت و فرمانبرداری میں تیری استعانت و مدد طلب کرتے اور چاہتے ہیں کیونکہ تیری توفیق ہی تیرے قرب کا سبب ہے، جس سے تو اپنے خاص بندوں کو سرفراز کرتا ہے۔ جب تک تیری مدد و اعانت میسر نہیں ہوتی یہ ہاتھ نہیں آتی اَللّٰھُمَّ یا اللہ کے معنیٰ میں آتا ہے، بعض بزرگانِ سلف رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ جس کسی نے اَللّٰھُمَّ کہا اور اللہ کی یاد اس سے کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے ننانوے ناموں سے یاد کیا۔ ایک قول کے لحاظ سے "اَللّٰھُمَّ اسم اعظم ہے اسی کے وسیلہ اور دوسرے شرائط کے یکجا ہو جانے سے دعا ضرور

قبول ہو جاتی ہے۔ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ جمع کے صیغہ کے ساتھ آیا۔ مطلب یہ کہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ تیری ہی استعانت (مدد) کے تجھ سے طلبگار ہیں۔ مانگنے والا 'دعا کرنے والا ایک ہوتا ہے' صیغہ واحد ہے اس کو جمع کے ساتھ عرض کرنے کی ہدایت کا اشارہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہر فرد کو چاہیئے کہ وہ اپنے گروہ یعنی مسلمانوں کی خیر طلبی کیا کرے۔ مرد وہی ہے کہ اپنی اور مسلمانوں کی خیریت و بہتری کو ایک سمجھے۔ اپنے آپ کو انہی میں کا ایک فرد جانے حق تعالیٰ کی نعمت کے دستر خوان پر تنہا خوری نہ کرے (اکیلا ہی نہ کھائے) ہو سکتا ہے کہ یہ بھی اشارہ ہو کہ سب حق تعالیٰ کی مدد و یاوری کے محتاج ہیں جل جلالہٗ و عم نوالہٗ۔ اول سے آخر تک یعنی جس قدر اب تک آئے ہیں' ازل سے ابد ابتدا سے انتہا تک جو گزرے ہیں' وہ سب جمع ہو جائیں اکٹھے ہو جائیں پھر بھی جناب لایزل کی استعانت و استمداد سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ یا یہ ہو کہ مانگنے والا نہ رہے اس کی وحدت جمع میں ضم ہو جانے سے اس کی نظر استحقاق و اعتبار سے اُٹھ جائے۔ سب کے ساتھ سب میں جماعت کے طفیل میں مقبولانِ درگاہ کے وسیلہ سے یہ دعا قبولیت کی گھڑی سے مل جائے۔ قبول ہو جائے۔ قبولیت پا جائے۔

نَسْتَغْفِرُکَ ۔ ہم تجھ سے گناہوں کی معافی و بخشائش چاہتے ہیں۔ مدد و توفیق مانگنے کے بعد صیغہ جمع ہی میں یہاں بھی دعا ہے کہ ہمارے گناہ معاف کر دے۔ ہم کو بخش دے۔ یعنی وہ دونوں صورتیں جو فائدہ اُٹھانے' ضرر سے بچنے کی ہیں ہاتھ آ جائیں۔ کیونکہ حاجت پوری ہونے' فتح مندی پانے کے بھی دست بازو یعنی پرتیں بمقصود کے ضمن میں

بطور سند لائے گئے ہیں۔ طاعت کی توفیق طلب کی تھی۔ کوئی طاعت و عبادت نقص سے خالی نہیں ہوتی۔ کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہتی ہے۔ جیسی کہ ادا ہونی چاہیئے، ہونا ممکن بھی نہیں۔ اس لئے استغفار (طلب غفر) میں آگیا۔ معافی و بخشش طلب کرنے لگ گیا۔ تاکہ نقصان و کمی و قصور جو عبادتوں میں ہوا ہے اس کا مداوا (تلافی، علاج) ہو جائے۔ مشائخ رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ خداوند تعالیٰ کے عفو، مغفرت (معافی بخشش) کی ضرورت بندگی و فرمانبرداری میں بہ نسبت گناہوں کے بہت زیادہ درکار ہوتی ہے۔ کیونکہ قرب و حضور کے مرتبہ میں بہ نسبت دوری و غیب کے کسی خطا کا یا قصور کا ہو جانا زیادہ قابل گرفت ہو جاتا ہے استغفار، اعانت امداد کے خزانوں کی چابی، حضرت واجب الوجود کے فیض کی بارش اور اس کا انعام ہے۔ جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ اللہ تعالیٰ کا جو فرمایا ہوا۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ ۔ اسی بات کی دلیل ہے۔ حضرت سید العالمین صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی نشست میں کبھی ستر مرتبہ کبھی سو مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے۔ آپ سے استغفار کی تکرار (بار بار کرنا) ثابت ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ کے اس استغفار کے معنی اس کے کرنے کا سبب کیا تھا۔ کس بارہ میں اور کس بات سے کی جاتی تھی۔ اس بارہ میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ بہت گفتگو ہوئی ہے۔ جس کو ہم نے بھی رسالہ مَرَجَ البَحرَین فی الجمع بینَ الطریقین و جمع بین الطریقت والشریعت میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ظاہر کو باطن اور صورت کو معنی سے تطبیق دے کر آپس میں مطابقت کی ہے۔ اسی میں سے جو چند

بہت اچھی اور مقام ادب سے بہت قریب باتیں اجمالاً یہاں وہی لکھ رہا ہوں
استغفار (طلب مغفرت و بخشائش) امت کے لئے ان کے گناہوں کی معافی
کے لئے کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ سراپا رحمت عین مغفرت ہیں، اس کے
باوجود بھی آپ استغفار کیوں کیا کرتے اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ استغفا
ایسا ہونا چاہیئے کہ جس سے از سر نو حضور حاصل ہو جائے۔ اگر زبان سے
استغفر اللہ کہیں، دل اور باطن حضور حق کی طلب سے غافل ہو تو ایسا
استغفار کرنا جھوٹ کہنا ہے یہ دوسرا گناہ ہوا جس کے لئے دوسرے
استغفار کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ اسی لحاظ سے حضرت رابعہ بصری
رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ ہمارا استغفار بہت سارے استغفاروں کا
محتاج ہو جاتا ہے۔ جو استغفار ہم کرتے ہیں وہ ایسا گناہ ہے جس کے
لئے دوسرے استغفار کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ استغفار تسلسل مراتب
کا لازمہ ہے۔ استغفار میں گناہ ہو جانے، ظاہر باطن ایک نہ ہونے، سراپا
استغفار نہ ہو جانے سے بہت سے استغفاروں کی ضرورت و احتیاج ہو جاتی
ہے۔ بعض علما اس طرف گئے ہیں کہ جس استغفار سے دعا مطلوب ہو، بطور
دعا کے کیا جائے تو اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ کہیں تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح سے کہنا
جھوٹ کہنا نہیں۔ یوں تو دعا میں بھی حضور کی شرط ہے لیکن غفلت کے
چھا جانے غفلت ہی میں وقت کے ساتھ اتصاف نصیب ہو جائے تو دعا
کے قبول ہونے مدعا کے بر آنے کی امید ہو جاتی ہے۔ استغفار کا وظیفہ حضرات
مشائخین قدس اللہ سرہٗ کا فرمایا ہوا یہ ہے کہ ہر روز ستر مرتبہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ
الْعَظِیْمَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ بطور دعا
کے کہا کریں۔ یا اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ

کہیں تو بہت مناسب ہے۔ پہلے ورد میں اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْم
یا اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ کہہ سکتے ہیں دوسرے میں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ
یا اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ کہیں تو ہو سکتا ہے اس طرح سے پڑھ سکتے اور تبدیل کر سکتے
ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

وَنُؤْمِنُ بِكَ اور ہم ایمان لاتے ہیں تجھ پر کہ تو گناہوں کا بخشنے والا ہے ایمان و مراتب ایمان کا دینے والا ہے۔ اس عرض کا مطلب یہ کہ ہم جو ایمان لا چکے تھے، اسی ایمان کی تجدید یعنی اسی ایمان کی نئے سرے سے تصدیق کرتے، از سر نو ایمان لاتے اس کو تازہ کرتے ہیں۔ ایمان کی تکرار کے ساتھ ساتھ تصدیق و اقرار کرتے ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی یہ آیا ہے کہ ایمان کو تازہ کیا کرو۔ یعنی کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہکر اپنے ایمانوں کی تجدید کرتے رہو۔ کلمہ کی تکرار اور اس کے ورد سے ایمان سنور جاتا، ثبوت پا جاتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ آؤ تھوڑی دیر کے لئے آپس میں مل بیٹھیں خدا تعالیٰ اور آخرت کے ذکر سے ایمان کی تجدید کریں یعنی اللہ کی یاد، اس کی نعمتوں کا مذکور کریں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان فرسودہ اور کمزور ہو جاتا ہے جس کا قوی اور تازہ کرنا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی سنت ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان گھٹیا، پرانا، کمزور ہونے کے بعد بڑھیا، نیا، قوت والا تازہ ہوتا ہے اس میں از سر نو قوت آ جاتی ہے۔ غفلت کے طاری ہونے گناہوں کی سیاہی چھا جانے سے ایمان ناقص، پرانا، کمزور ہونے کے بعد اس کی یاد، اس کی محبت اس کے ذکر و شغل کی نورانیت سے وہ کامل، نیا اور قوی ہو جاتا ہے۔ صیغۂ نفعل زبان عرب میں استمرار و تجدید کا فائدہ دیتا

ہے یعنی کام کا آناً فاناً ہونا۔ ہر گھڑی ایک نئے ایمان کا وجود میں آنا، اور اس نئے ایمان میں ہر وقت ہمیشہ ایک اور ہی لذت نصیب ہوتا ہے۔ اے ہمارے اللہ ہم کو ایمان کی حلاوت مرحمت فرما، تیری وجہ میں نظر کرنے کی جو لذت ہے وہ انتہائی لذت ہے۔ تیری وجہ سے بزرگ و برتر کوئی اور وجہ نہیں لذتِ نظر ہمیں روزی کر۔ تجدید ایمان کے جس قدر اسباب ہیں ان میں سب سے بہتر اہم سبب صالحین کی صحبت اور ان کے جمال پر نظر کرتے رہنا ہے خصوصاً وہ حضرات جو اپنے سے فانی اور حق میں باقی ہو گئے ہوں۔ خدا تعالیٰ ہمیں اس نعمت کے پہچاننے اور اس کی قدر کرنے والا کر دے۔ صاحبان سلوک نادر ہستیاں ہیں۔ اس قوم کی کتابیں انتہائی نفع بخش ہوتی ہیں۔ ان کی مصاحبت میں رہنے ان کی تصانیف کے دیکھنے سے ایمان تازہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ کام کرنے کی اُمنگ امید کی جھلک پیدا ہونے سے سیدھے راستہ کی خوبی کھل جاتی ہے۔ اللہ ولی التوفیق و ملہم الصواب (اللہ توفیق دینے والا اور بہتری کا دل میں ڈالنے والا ہے)

وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ اور ہم توکل (بھروسہ) کرتے ہیں تجھ پر جس قدر ہمارے کام ہیں وہ ہم تیرے سپرد کر دیتے ہیں۔ ایمان کے لوازم و شرائط میں سے توکل بھی ایک اہم شرط ہے۔ چنانچہ فرمان خداوند تعالیٰ و سبحانہٗ ہے کہ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ (اللہ پر توکل کرو۔ اگر تم ایمان والے ہو) توکل ہر جگہ ہر موقعہ پر کیا جاتا ہے اور خصوصاً ان حالات معاملات میں کہ جن کی فہمائش کی گئی۔ یا جو فہم میں آ سکتے ہیں۔ عام طور سے توکل کا استعمال رزق کے بارے میں کیا جاتا ہے رزق کے متعلق پورا اعتماد اور انتہائی بھروسہ خدا کے وعدہ و ضمانت پر ہونا

ضروری ہے۔ اگر اس کی ضمانت وکفالت پر جو اس نے اپنے بندوں کے لیے دی ہے یقین آجائے تو توکل ہاتھ آجاتا ہے۔ روزمرہ کے عادات کا ترک، توکل کا لازمہ نہیں۔ وہمی اور قیاسی کام وطریقے جو توکل کے منافی ہوں ان کا ترک کردینا ضروری ہے۔ اسباب کے ترک کا عام طریقہ اور ترک توسل مقام توکل کی تصحیح کے لئے کیا جاتا ہے ایسا ترک صرف اپنے نفس کی آزمائش مقام توکل میں اس کے قیام وقرار بالکلیہ سپردگی کے ادعا کی جانچ پڑتال کے لئے کیا جاتا ہے۔ مشائخین طریقت رحمہم اللہ نے ابتدائے حال میں ایسا ترک کیا ہے۔ حقیقتاً "توکل" اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر یقین وبھروسہ واعتقاد رکھنے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ضمانت وکفالت دی ہے اس کے پورے ہونے پر یقین رکھنا ہے، اور اپنے آپ کو اپنے سب کاموں کو اپنے سارے حرکات کو اس کے سپرد وحوالہ کردے کر اس کو اپنا متولی وکارساز بنالینا اسی پر ٹھہرے ہوئے رہنا ہے۔

وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ. تیری بہترین سے بہترین ثنا خیرو برکت سے کرتے ہیں۔ تیری حمد وثنا تعریف وتوصیف خیر کے ساتھ کرکے ساری بہتریاں، نیکیاں تجھ سے منسوب کرتے اور سند لیتے ہیں حق تعالیٰ کو اپنا وکیل بنالے کر اس کی نگاہ بانی دکارسازی میں آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وکیل کی نصیحت پر عمل کریں اس پر پورا بھروسہ رکھیں تو وہ موکل کی خیرخواہی کرتا ہے اور دوستی کے طریقے پر اسے لے چلتا ہے یہ جب اس کی مرضی پر چلتا ہے تو وہ اس کی مرضی سے متعلق ہوجاتا ہے جس سے دوستی کی گرہ، تعلق کا رشتہ، ربط کا سلسلہ مضبوط ومستحکم

ہو کر بہترین طریقہ سے کام انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ اس روش ایسے طریقہ کے خلاف اگر احیاناً محبت کی گرہ ڈھیلی پڑجاتی ہے تو کچھ نہ کچھ خلل اس میں ضرور آجاتا ہے۔ اسی کے دور کرنے کے خیال سے یہ کہتا ہے کہ ہم آپ کی وکالت سے راضی ہیں آپ پر ہمیں بھروسہ ہے ہم آپ کے شکرگذار و معترف ہیں آپ ہی کی تعریف کیا کرتے ہیں۔

وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ ہم تیری نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ تیری نعمتوں کا کفران (ناشکر گذاری) نہیں کرتے۔ ہم تیرے شکر گذار ہیں۔ ناشکرے نہیں۔ خصوصاً نعمت وکالت کا شکر کرتے ہیں کہ تو ہمارا وکیل ہو گیا ہم کو تدبیر، تردد، تشویش، اختیار، کام کاج کی پکڑ جھکڑ سے چھٹکارا دیدے کر فارغ البال کر دیا۔ فراغت و راحت کے بستر پر سُلا دیا۔ اس سے بڑھکر اور کیا نعمت ہو سکتی ہے۔ ہم تیری وکالت پر کیسے راضی نہ ہوں کیونکر خوش نہ رہیں۔ وکیل میں دو صفات کا ہونا ضروری ہے ایک پوری دوستی دوسرا پورا علم یہ دونوں بھی تجھ میں پورے طور سے ہیں۔ یہ مسلمہ ہے کہ باری تعالیٰ کے شکر کی اَدائی عقل کے لحاظ سے محال ہے۔ کیونکہ اس کی نعمتوں کا تواتر (پے در پے ہونا) اس کے انعام کا توارد (باہم ایک جگہ اترنا) قسم قسم سے طرح طرح سے ہوتا رہتا ہے۔ ایک نعمت سے دوسری نعمت اور ایک انعام سے دوسرا انعام ہر ہر طرح کی شکل وصورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے ان میں سے خاص خاص نعمت ہی کا شکر ادا ہوتا ہے۔ ہر ایک کا، ہر ایک کے نتائج و ذرائع کا ان کے تسلسل کا شکر، کیونکر کیسے ادا ہو سکتا ہے۔ سچ ہے یہ بات آدمی کی قوت سے زیادہ اس کے بس کی نہیں کیونکہ نعمت کی پہچان ہی نعمت ہے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ شکر کی توفیق خود ایک نعمت ہے اور نعمت ہی میں سے

ہے یہی صورت، کیفیت وحالت شکر کی بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی بھی انتہا نہیں آدمی سے کس کس بات کا شکر ادا ہو سکے۔ یہ مقام' اس قدر اور ایسی داد و دہش، بخشش وعطا اس کے لئے حیرت کا سبب بن جاتی ہے۔ اس خیال کا نکالنا بہت دشوار ہے۔ تجربہ کی بات یہ ہے کہ ایسا چکر اس قسم کی گھبراہٹ اس کو ہوتی ہے جو خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم کا اپنے کاموں سے جب کبھی مقابلہ کرتا ہے تو وہ ٹھیک نہیں پڑتا ہے۔ شکر کو مواجب ومراسم عقلیہ سمجھنا اعتزال کا مذہب ہے' باطل ہے۔ اپنے آپ کو ادائی شکر کے قابل سمجھنا صریح کھلا شرعی نقص ہے۔ یہ بات متحقق وثابت ہے کہ شکر کو شریعت کی رسم جانتے ہیں ایسی گھبراہٹ وحیرانی پیدا نہیں ہوتی۔ شارع علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ کے حکم سے ہر نعمت کا شکر شریعت کی زبان میں متعین کر دیا ہے۔ بعض محققین نے فرمایا ہے کہ نماز، روزہ، حج زکوٰۃ اور ایسی ہی چیزیں، جو لوازم بندگی ہیں ادا کی جاتی ہیں۔ انکی پابندی کی جاتی ہے۔ اس پر قائم رہتے ہیں تو بلحاظ شرع ان کو شکر گذار کہتے ہیں۔

وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ۔ ہم نکال باہر کرتے اور ترک کرتے ہیں یعنی اپنے باطن سے نکال دیتے اور ظاہر سے چھوڑ دیتے ہر اس کو جس نے گناہ کیا یا جس نے تیری نافرمانی کی عام اس سے کہ وہ نفس ہو یا لوگ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ فرماتا ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (جو کوئی اللہ و رسول اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی دوست نہیں رکھتا ان کو جو خدا اور اس کے رسول کے دشمن ہیں) اس بارہ میں وعید (بری خبر۔ بدانجامی) میں بہت ساری قرآنی آیات واحادیث آئی ہیں۔ اس مقام میں ٹھہرے رہنا خدا اور رسولؐ

کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا۔ بڑا کٹھن کام مشکل صورت ہے۔ ایمان کامل یہ ہے کہ دل زبان اعضاء جوارح سے اغیار (کافروں، خدا اور رسول کے دشمنوں) کے مخالف رہیں۔ اگر اتنا نہ ہو سکے تو کم از کم دل ہی کو ان کی محبت و موافقت سے روک رکھیں ایسے ایمان کو نہایت ضعیف ایمان کہا جاتا ہے

اَللّٰهُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ جب سب سے بیزار و الگ ماسوی اللہ سے پاک سب سے خالی ہوگیا' غیروں کی ساتھ داری چھوڑ دے کر اخلاص کے قدم پر کھڑا ہوگیا' استقامت کی راہ پر آگیا' تو عبادت کے مقام و مرتبہ میں پہنچ کر عرض کرنے لگ گیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی ہمارا مطلوب و مقصود نہیں۔ ہمارا مقصود و مطلوب تُو ہے تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں۔ دنیا و آخرت میں ہمارا سب کچھ تُو ہے۔ عبادت کے لائق بھی تُو ہے دنیا کے اغراض آخرت کے بدلے ہمارا مقصود بھی تُو ہے۔

وَلَكَ نُصَلِّيْ وَنَسْجُدُ۔ اور تیری فرمانبرداری' رضامندی' خوشنودی خوشی کے لئے ہم نماز پڑھتے' سجدہ کرتے' عبادت و بندگی میں رہا کرتے ہیں۔ عبادتیں بہت ہیں کئی قسم کی ہیں۔ نماز سب عبادتوں میں افضل اور ساری نزدیکیوں میں سب سے زیادہ نزدیک اور سب سے بہتر اور اعلیٰ نزدیکی ہے جس میں سب عبادتیں بالفعل (فوراً) موجود ہیں اس لئے اس کے ادا کرنے کی عرض و معروض ہو رہی ہے۔ اصل کے اظہار کے بعد اسی کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ لوازم عبادت کے ساتھ ساتھ معبودیت کے شرائط کی تعمیل کا اقرار کیا جا رہا ہے۔ نماز کے ارکان میں سجدہ ہی وہ انتہائی مکمل احوال ہے کہ بندہ کو خدا کی قربت بخشتا ہے۔ نماز کے بعد سجدہ کا جو مذکور آیا

اس میں ابتدا و انتہا کی طرف اشارہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو رحمت کے موتی اس پر نچھاور کئے جاتے ہیں جب رکوع میں جاتا ہے تو جو رحمت باقی رہتی ہے اس کو بھی پورے طور سے اس کے نچھاور کر دیتے ہیں۔ جب سر کو سجدہ میں رکھتا ہے تو گویا وہ رحمٰن کے قدموں میں گر پڑتا ہے۔ دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ دیتا ہے۔ اس معنیٰ کے ملاحظہ اور تصور کے بعد طالب صادق کے لئے سجدہ سے سر اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک وہ محبوب کو دیکھ نہیں لیتا سجدہ سے سر نہیں اُٹھاتا۔ مقصود کے پانے تک سجدہ ہی میں رہتا ہے۔ نماز کی فضیلتیں۔ اس کے اسرار و حقائق کو مشائخین قدس اللہ اسرارہم نے اپنی معرفت کے لحاظ سے بیان کیا ہے۔ اس کو ان کے ملفوظات میں دیکھ لینا چاہیئے۔ جذبہ کے اُبھار ایمان کی تقویت کے لئے نماز کی قدر پہچاننا اس کی خوبیوں میں اُتر آنا، اہلِ حضور و معرفت کو اپنے حال کے لحاظ سے نصیب ہوتا ہے۔ بقدر حال ہر ایک اس سے نصیبہ پاتا ہے۔ اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ اور تیری ہی طرف لپکتے ہیں۔

تیری ہی سعی و کوشش میں ہیں اور رہتے ہیں۔ تیری ہی خدمت کیا کرتے ہیں۔ حفد کے معنی خدمت کے ہیں۔ خدمتگار کو حافد کہتے ہیں۔ حافد خادم کے معنیٰ میں بھی آتا ہے محفود۔ مخدوم کو بھی کہتے ہیں۔ عمل میں تیزی و چالاکی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ یہ فقرہ ایسا ہے کہ جس میں اخلاص کے ساتھ مطالب توحید کا بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ہی ذات ہے کہ جس کی طرف ہماری دوڑ ہمارے عمل کی چالاکی و تیزی ہے۔ ہم اس کی ملازمت میں اس کی خدمت میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔

وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰى عَذَابَكَ اور ہم اپنی طاقت اور وسعت کے لحاظ سے جو خدمت ہم سے ہو رہی ہے، تیرے راستہ میں جو سعی و کوشش ہم کر رہے ہیں، جس دوڑ دھوپ میں ہم ہیں ان سب میں ہمارا بھروسہ ہماری اُمید تیری رحمت ہی پر ہے۔ تیری رحمت ہو تو سب کچھ ہے اس لئے ہم تیری رحمت کے امیدوار و متلاشی ہیں اسی امید میں زندگی بسر کر رہے ہیں تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ کسی کا کوئی استحقاق تجھ پر نہیں۔ "ثواب" صرف تیرا فضل ہے اور "عقاب" یعنی گرفت و عذاب تیرا عدل و انصاف ہے یہ سب کچھ تیرے وعدہ و عید کی بنا پر ہے کہ تونے ثواب عقاب، طاعت و معصیت کو عبادت و گنہگاری سے ربط و تعلق دے رکھا سبب وسیلہ بنا دیا ہے۔ عبادت کے ادا ہوتے رہنے میں بھی ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں گناہ کرتے ہوئے بھی ہم تجھ سے ڈرے سہمے ہوئے رہتے ہیں کیونکہ ہمارا ایمان ڈر اور امید کے درمیان ہے۔ چونکہ تیرا فرمان ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ اس لئے ہم پہلے تیری رحمت کے امیدوار و منتظر رہتے ہیں اور اسی کو ہم نے تقدم دیا ہے (سب سے پہلے رکھا ہے) اور غضب سے ڈرنے کو بعد میں لایا ہے سچ ہے جو حضرات بزرگی کی بارگاہ سے بزرگی دئے ہوئے ہیں۔ وہ عالم تسلیم کے دہشت پائے ہوؤں میں سے ہیں۔ نا امید نہ ہو کہ حق کی رحمت عام ہے اور گھمنڈ میں نہ آجا کہ خاص حضرات بھی خوف میں ہیں۔

اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ۔ البتہ تیرا عذاب کافروں کے ساتھ لاحق (ملا ہوا ہے یا ملا دیا گیا) کر دیا گیا ہے۔ اس بات کے پیش کرنے آگے بڑھا دینے، زیادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا کام تجھ پر ایمان رکھنا،

امید لگائے ہوئے رہنا، امیدواری کرنا، امید کی نظر تیری ہی طرف رکھنا ہے "ملحقٌ" کو زیر سے اور زبر سے بھی پڑھا کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں معنی ایک ہی ہیں۔ قاموس میں لَحْقَہٗ کو اَدْرَکَہ کلحقہ بتلایا ہے یعنی تیرا عذاب متعدی ہے، کافروں تک پہنچتا ہے کافروں کے لیئے عذاب لازمی ہے وہ ان سے لاحق ہوتا ہے۔ ان پر ہی کھلتا ہے۔ اور اچھی طرح سے ان کو لگ جاتا ہے۔ عذاب اس کو کہتے ہیں جو طبیعت کے خلاف ہو جس کو دیا جائے اس کے لئے درد و تکلیف ہو جائے۔ مرغوب چیز کے چلے جانے دور ہو جانے کو بھی عذاب کہتے ہیں۔ فراق میں ڈال دیئے جانے کو بھی عذاب مانتے ہیں۔ شارع علیہ السلام کی احادیث اللہ تعالیٰ کے کلام میں دوزخ کی آگ سے عذاب دیئے جانے کے متعلق صاف و صریح احکام ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے کافر آگ سے آگ میں جلائے جائینگے، فقہ حنفیہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر دعائے قنوت کے بعد ایسی دعائیں جو احادیث میں آئی ہیں جس کو ماثورہ کہتے ہیں یعنی وہ دعائیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئیں اور آپ سے منقول ہیں ان کو پڑھیں تو اچھا ہے اسی طرح دعائے قنوت جو مذہبِ شافعی میں رائج اور پڑھی جاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسن رضی اللہ عنہ وآبائہ الکرام کو سکھلائی تھی اس کو بھی پڑھیں تو زیادہ بہتر و مناسب ہے۔

اَللّٰھُمَّ اھدنا فیمن ھدیت (اے ہمارے اللہ ہم کو سیدھا راستہ دکھلا اس جماعت کے طفیل میں کہ جن کو تو نے سیدھا سچا راستہ دکھلایا ہے۔ عافنا فیمن عافیت (عافیت بخش ہم کو اس جماعت کے طفیل میں جس کو تو نے عافیت بخشی عافیت سے سرفراز فرمایا۔ تولنا فیمن تولیت (ہیں دوست رکھنے والا، ہمارے کام کا متولی ہو جا جیسا کہ تو دوست رکھنے والا اور

متولی اس جماعت کا ہوگیا اور اپنی ولاعنایت کی، اس کے طفیل میں ہمیں
بھی ولا عطا فرما۔ وبارك لنا فيما عاطيت۔ برکت دے ہم کو اس چیز
میں جو تو نے ہم کو عطا فرمائی ہے۔ اپنی نعمت سے اپنے انعام سے۔
ربنا وقنا شر ما قضيت۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو بچا اس کے
شر سے جو تیری قضا میں ہو۔ جس کا تو نے حکم دیا ہو۔ انك تقضى ولا
يقضى عليك تو حکم دے سکتا ہے تجھ پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔
انه لا يذل من واليت۔ جس کو تو دوست رکھے اس کی شان یہ ہے
کہ وہ ذلیل وخوار نہیں ہوتا۔ ولا يعز من عاديت۔ جس کو تو نے دشمن
رکھا وہ عزت والا عزیز نہیں ہوتا۔ والمهتدى من هديت جس کو
تو نے راستہ بتلایا وہ ہدایت یافتہ ہوگیا۔ ہدایت کا راستہ پایا ہوا ہوگیا۔
تبارکت ربنا وتعاليت۔ بزرگی برکت بلند مرتبہ والا۔ ہمارا پروردگار
تعالیٰ ہے جس کی حقیقت جس کے کمال کی تہہ تک کوئی نہیں پہنچتا۔ کسی
کی وہاں تک رسائی نہیں۔ یاذالجلال والاکرام۔ اے پروردگار
صاحب جلال واکرام۔ صفات سلبیہ وثبوتیہ کا رکھنے والا صفات عمدہ باطنی
کا مالک۔ بزرگ برتر۔ اغفر وارحم۔ ہم کو بخشدے۔ ہم پر رحمت کر
وتجاوز عما تعلم۔ گزر جا انجان ہو جا اس سے جو تو جانتا ہے ہمارے
گناہوں سے یعنی ہمارے گناہوں سے انجان ہو جا، اور ان سے درگزر کر۔
انك انت الاعز الاكرم۔ تو وہ ہے جو سب سے زیادہ عزت والا،
غالب۔ سب کریموں سے غالب تر کریم، سارے عزت داروں سے زیادہ
عزت والا، سارے کریموں سے زیادہ کرم والا ہے۔ وصلی اللہ علیہ وآلہ
علیٰ محمد وآلہ واصحابہ وسلم۔ (سینتیسواں مکتوب)

مکتوب ۱۳

التحیات کی شرح میں

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ۔ سب عبادات قولی یعنی وہ عبادتیں جو زبان سے ادا کی جاتی اور کہی جاتی ہیں۔ والصّلوٰۃ سب عبادات فعلی یعنے وہ عبادتیں جو اعضاء جوارح (ہاتھ پاؤں، سر، جسم، آنکھ، کان) کی حرکتوں سے کی جاتی اور ادا ہوتی ہیں۔ والطیّبات۔ تمام عبادات حالی یعنے وہ عبادتیں جو دل و دماغ و خیال روح سے کی جاتی ہیں یا ان سے معمور ہوتی ہیں وہ سب خدا تعالیٰ و تقدس ہی کے لئے ثابت اسی کے لائق و سزاوار ہیں۔ ان کلمات کی اسی طرح سے یہی تفسیر کی گئی اور کہا گیا کہ التحیات للّٰہ یہ عام طریقہ اور رسم ہے کہ جب کبھی کسی بادشاہ کے روبرو آتے اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اس کی حضوری پاتے ہیں تو پہلے پہل آداب بجالاتے سلام تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ خدمت بجالاتے ہوئے، عاجزی نیازمندی ظاہر کرکے وہ تحفہ و نذرانہ جو اس بارگاہ عالی کے لائق و مناسب ہو پیش کیا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ مقبول بارگاہ اور بادشاہ کی عنایت کے سزاوار ہو جائیں امام محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ تحیت۔ سلام بقا۔ عظمت۔ حیات کے معنوں میں آتا ہے۔ تحیات جمع ہے۔ جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔ دنیا کے بادشاہ عرب کے ہوں یا عجم کے ان کے لئے ایک

مخصوص سلامی ہوا کرتی تھی۔ ان سے درباری ان کے ملک کی رعایا ایک خاص طرح سے اس کو ادا کرتے۔ آداب شاہی بجالاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہہ رہا ہے کہ سب تحیات ہر قسم کے آداب و طریقے، بادشاہوں کے بادشاہ کے لئے جو ساری جہان کا پیدا کرنے والا ہے وہی اس کا مستحق و سزاوار ہے۔ دوسروں کے لئے یہ عارضی سے زیادہ نہیں۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے یہ ثابت ہے۔ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ شرح بخاری میں خطابی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر ملک کی رعایا اپنے بادشاہ سے ملاقات کے وقت جو آداب و سلام ادا کیا کرتے تھے وہ مخصوص کلمات ہوتے تھے۔ چنانچہ عرب میں کہتے ہیں کہ اللہ تمہیں زندگی کی نعمت سے سرفراز کرے اور عجم کے لوگ تم سلامت رہو ہزار برس کہتے ہیں اسی قسم کے کلمات۔ دوسرے ملک والے بھی اپنے ملکوں میں اپنے اپنے کلمات عظمت کہتے ہیں۔ ان سب کلمات میں سے کسی کلمہ میں یہ صلاحیت و خوبی نہ تھی کہ وہ پروردگار تعالیٰ تقدس کی تعظیم و تکریم میں استعمال ہو سکے۔ اس لئے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی تعظیم و تکریم کے لحاظ سے جو مناسب جو کلمہ اللہ کے لئے کہا گیا وہ وہ اَلتَّحِيَّاتُ ہے

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ سب (جو بھی ہو سکتی ہر قسم جنس کی) ساری تحیت یعنی تعظیم و تکریم جو ہوسکتی ہے یا تصور میں آسکتی ہے کی جاسکتی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ شانہٗ ہی کے لئے ہے اس کے سوائے کوئی اور اس کے لائق و سزاوار اور اس کا مستحق نہیں۔

وَالصَّلَوٰةُ یعنی فرض و نفل نمازیں اس کے لئے اسی کے واسطے ہیں۔ صلوٰۃ کے معنی دعا کے بھی ہیں۔ یعنی اَلدَّعَوَاتُ كُلُّهَا لِلّٰهِ

(ساری دعائیں جو بھی ہیں وہ اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی سے کی جاتی ہیں) صلوٰۃ سے رحمت کے معنیٰ میں بھی لئے جاتے ہیں یعنے ساری رحمتیں اسی سے ہیں کہ وھو الرحمٰن الرحیم (اور وہ مہربان بخشنے والا ہے۔ دنیا میں اور رحم کرنے والا عاقبت وآخرت میں)

وَالطَّیِّبَاتُ ۔ کلمات طیبہ (پاک باتیں) اس سے اعمال صالحہ بھی مراد لئے جاتے ہیں۔ یہ دونوں معنی بھی اپنے اپنے مقام پر مناسب وصحیح ہیں مناسب مقام اور درست ہیں۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ

اے نبی آپ پر سلام ہو خدائے تعالیٰ کی رحمت اس کی برکتیں نازل ہوں۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اے مومنو درود وسلام اپنے نبی اور رسول پر بھیجو (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سلام کی کیفیت جس کا مذکور یہاں آیا ہے تشہد (التحیات) کے آخر میں معلوم ہو جائے گی۔ اگر یہ کہیں کہ خطاب حاضر کے لئے ہوا کرتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر نہیں، پھر اس مخاطبت کی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ التحیات معراج کی رات میں نازل ہوئی صیغۂ حاضر میں خطاب ہوا تھا اس لئے اس کو جیسی کہ اتری وارد ہوئی تھی ویسی ہی رکھا گیا۔ معراج کی رات میں صیغہ حاضر ہی میں کہا گیا تھا اس لئے اس کو ویسی ہی رکھا گیا۔ اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اس کو پڑھا جاتا ہے۔ صحیح بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں سلام بصیغہ خطاب کہا کرتے تھے اور آپ کی حیات کے بعد یوں کہنے لگے کہ السلام علی النبی ورحمۃ اللہ

وبرکاتہٗ، کہ بلفظ خطاب شرح کے بیان کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بعض عرفائے اہلِ قرب و صاحبانِ تحقیق کا یہ فرمانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی حقیقت کے سریان کی وجہ سے ہر ذرہ میں موجودات کے موجود ہیں اور احاطت ذات حضرت سرورِ کائنات سارے ممکنات میں ساری ہے آپ نماز پڑھنے، درود بھیجنے والے کی ذات میں حاضر شاہد ہیں۔ اس لئے سلام مخاطبت کے ساتھ جو کیا جاتا یا بھیجا جاتا ہے وہ اسی حضور وشہود کے ملاحظہ سے ہوتا ہے۔ صلی اللہ علیک یا رسول اللہ احادیث صحیح میں یہ وارد ہے کہ جب بندہ مومن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس (خود) سلام کا جواب دیتے ہیں۔ اس بارہ میں کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں کیونکہ سلام کا جواب دینا آپ کے لئے مخصوص ہے۔ آپ کی قبر مبارک کے زائرین (زیارت کرنے والے) جب آپ کے سامنے آتے ہیں تو ہر آنے والے کی طرح آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی سلام عرض کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز پڑھنے والوں کے لئے بھی التحیات میں اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ کہنا چاہیئے یہی بات ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔ اسی طرح آپ پر سلام بھیجتے ہیں ظاہر ہے کہ اسی طرح عام طور سے ہوتا ہے پہلی روایت بھی صحیح ہے البتہ بعض یہ فرق ظاہر کرتے اور کہتے ہیں کہ زائرین کا سلام بواسطہ آپ کے سمع شریف (سماعت) میں پہنچتا ہے۔ اور جگہ کے لوگوں کے سلام فرشتوں کے واسطہ سے آپ تک پہنچتے ہیں جن کو خداوند تعالیٰ نے مومنوں کے سلام آپ تک پہنچانے کے لئے مقرر کر دیا ہے وہ آپ کی اُمت میں گھومتے رہتے ہیں، آپ کا اُمتی سلام عرض کرتا ہے اس کو آپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ چنانچہ احادیث میں ایسی روایت بھی آئی ہے اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے

اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ. سلام ہم پر
اور خدا تعالیٰ کے ان بندوں پر جو نیک صلاحیت پائے ہوئے نیکی کرنے
والے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسے سلام کا نزول جب معراج شریف کی رات
میں ہوا تو ظاہر ہے کہ یہ سلام اللہ تعالیٰ کے سلام کا جواب ہوا اس کا جواب یہ ہے
کہ سلام دعا ہے۔ آفات مکروہات سے سلامت رہنے کی دعا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
پاک و منزہ و مستغنی ہے اس سے کہ اس کے لئے سلامتی کی دعا کریں۔ اس سے
یہ ثابت ہوگیا کہ تحیت و سلام کے بدل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں
کو سلام بھیجا کہ وہ اس کی درگاہ کے مقرب اور اس کی عزت کے دامن سے
بندھے ہوئے ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز میں
آپ کی اقتدا میں یہ کہا کہ "السلام علی اللہ من عبادہ وعلی جبرئیل
ومیکائیل وعلی فلان فلان" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ۔ فَاِذَا صَلّٰی
احدکم فلیقل۔ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ والصلوٰۃ والطیبات۔
السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ السلام
علینا وعلی عباد اللہ الصالحین (آپ نے فرمایا کہ خدا سلام ہے
یعنی خدا تعالیٰ سلامت ہے سب کو سلامتی بخشنے والا ہے اس پر سلام ہم
کوئی معنی نہیں رکھتا مجھ پر اور نیک بندوں پر سلام بھیجا کرو تاکہ نیک بندوں
کو جو زمین و آسمان میں ہیں، سلام پہنچے کہ جبرئیل میکائیل وغیرہ
سب اس میں داخل ہیں۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ
وَرَسُوْلُهٗ۔ پہلی شہادت خدا تعالیٰ کی خدائی کی دوسری شہادت محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی ہے۔ بعض روایات میں تحقیق کے ساتھ آیا ہے کہ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ اس میں بڑھا کر پڑھیں تو بھی جائز ہے۔ روایت صحیح کے لحاظ سے مذہب حنفی میں وہی کلمے ہیں جو ہم نے اوپر اس سے پہلے لکھے احناف (مذہب حنفی رکھنے والوں) نے بعد میں اس کو بھی شریک کر لیا ہے اور یہ تشہد میں یعنی التحیات کے بعد پڑھی جاتی ہے، پڑھ سکتے ہیں۔

تشہد کے بعد درود پڑھنا احناف کے نزدیک سنت اور شافعیہ کے نزدیک فرض ہے اس کی کیفیت صحیح حدیث میں مختلف طریقہ سے آئی ہے۔ اگر اس طرح پڑھیں تو کافی ہے وہ درود شریف یہ ہے: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْد۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

اور اس تشبیہ یعنی مشابہ، ہم شکل، ہم نوعیت کرنے، کسی کے ساتھ مثال دینے میں لزوم کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر سے قیاس کر سکتے ہیں ایسا کرنے کے اسباب پائے جاتے ہیں۔ قوت وجہ تشبیہہ (ایک دوسرے کی طرح ہونے کے غلبہ میں) اور جس سے مشابہت دی گئی ہو۔ ان کے آپس میں مشابہ ہونے میں بہت گفتگو و بحث ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حبیب اللہ کے ساتھ حضرات ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کا جو مذکور آیا جیسی مشابہت لائی گئی اس کے بہت سے جواب دیے گئے ہیں اور اسباب و حالات اصل و بنیاد کو سمجھایا گیا ہے۔ اصولی طور سے ملت و شریعت کی بحث بھی آئی ہے ساری بحثیں توجیہات تاویلات کو ہم نے اپنی کتاب جذب القلوب میں لکھدیا ہے بہترین جواب یہ ہے کہ یہاں تشبیہہ صلوٰۃ کی ہے کہ وہ نفس صلوٰۃ

کے مذکور میں آئی ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ شانہٗ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ۔ (ہم نے آپ کی طرف ویسی ہی وحی بھیجی جیسی کہ نوح پر بھیجی تھی) وجہ تشبیہہ کا ظہور اس کی شہرت کے لئے کافی ہے۔

تشہد کلمہ توحید درود کے بعد جو دعا بھلی معلوم ہو وہ پڑھ سکتے احادیث میں بتلائی ہوئی دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھیں تو بہت بہتر ہے کہ یہ فضیلت رکھتی ہیں جو دعا روایتاً آئی ہے وہ یہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تعلیم دی تھی۔ ربّ انّی ظلمت نفسی ظلماً كثيرًا وّ لا يغفر الذّنوب إلّا انت فاغفرلی مغفرة مّن عندك وارحمنی انّك انت الغفور الرّحيم۔ دوسری دعا اللّٰهم انّی اعوذ بك من فتنة عذاب القبر و من فتنة عذاب النّار ومن فتنة المسيح الدّجال۔ ومن فتنة المغرم والمأثم و من فتنة المحيا والممات واعوذ بك من الفتن ماظهر منها وما بطن اللّٰهم اغفرلی ما قدمت وما اخرت وما اسررت و ما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم به منّی۔ ربّنا آتنا فی الدّنيا حسنة و فی الآخرة حسنة و قنا عذاب النّار بھی پڑھتے ہیں کہ جو سب دعاؤں کی شامل اور جامع ہے۔

(اڑتیسواں مکتوب)

مکتوب (۱۴)

دُنیا و عاقبت

اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

حقّ جلّ وَ علیٰ ۔ ہر حال میں آپ کا ناصر و معین (مددگار۔ یاور) رہے ۲۶ رجب کا لکھا ہوا محبت کے اسلوب لیا ہوا خط پہنچا۔ آنکھوں کو منور۔ دل کو مسرور کیا آپ کے آنے کی اطلاع ملی آپ سے جس قدر جلد ہو سکے۔ آپ کے اختیار میں ہو ادھر آنے کے ارادہ کو ڈھیل نہ دیں۔ اس سے زیادہ آپ کی جدائی کی طاقت و برداشت باقی نہیں اس فقیر سے حالت صحت میں ملنے' اس کی خیر و عافیت کے دریافت کو غنیمت جانیں کیا معلوم کہ اس کے بعد کیا ہو۔ اس سعادت مند کی ابتدا و انتہا کیسی ہو۔ دنیا میں جو لوگ آباد ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنے مقصد و خواہش کی طلب میں دین کے مقاصد کی خلاف ورزی کیا کرتے ہیں وہ کئی قسم کے ہیں وہ مسلمان نہیں ہیں نہ انھیں مسلمان کہہ سکتے ہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ مسلمان چاہے وہ کیسا ہی ہو کیسے ہی کمزور ایمان کا ہو وہ دین اسلام کی محبت سے خالی نہیں ہوتا مواخذہ سے ڈرتا آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں فرق و تفاوت ضرور ہے۔

ایک جماعت وہ ہوتی ہے کہ دنیا کی باتوں میں غلو کی ہوئی اس میں ایسی منہمک ہوتی ہے کہ وہ اسی کو مقصد و مقصود سمجھی ہوئی ہے۔ آخرت کے "خوف دین کے نقصان" سے ایسی بےخوف ہو گئی ہے جیسا کہ اس کا علم ہی نہیں ۔ ایسی غفلت و نادانی سے اللہ بچائے ایک جماعت ایسی ہے جو اس کا علم

تو رکھتی ہے۔ لیکن جب کوئی کام آپڑتا ہے تو شہوت کے دباؤ نفسانیت کے غلبہ میں دب جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو علم انھیں ہے وہ کمزور ہے یقین کے مرتبہ کا نہیں اس لئے وہ شہوت و لذت نفس میں پھنس کر اس کو بھلا دیتے بھول جاتے ایمان کو ہاتھ سے دیدیتے ہیں۔ بھول کا بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لالچ اور شہوت کا غلبہ ان پر ایسا ہوتا اور اس طرح چھا جاتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر اس میں گر جاتے ہیں واضله الله علیٰ علم (گمراہ کیا اللہ ان کو علم دے کر) کا اشارہ اسی طرف ہے۔ حکمت الٰہی کی اقتضار انھیں اس میں مبتلا کئے ہوئی ہے۔ دنیا اور اس کے مال و متاع۔ گمراہیوں کو آدمیوں کی آنکھوں میں اچھی زیب و زینت کی چیز دکھلایا جاتا ہے یوں بھی طبیعت کے لحاظ سے وہ بے اختیار اس طرف لپک جاتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ دنیا شیریں تر و تازہ، سرسبز و شاداب اپنے آپ میں ایک خاص مٹھاس و دلفریبی رکھتی ہے بظاہر اس میں رنگینیت زیبائش کچھ ایسی ہے کہ خود بخود آدمی اس کی طرف کھنچ جایا کرتا ہے۔ اس سے بچنے کے لئے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی مدد اعانت و نصرت کی ضرورت ہے یعنی تائید الٰہی ہی اس سے اس کو روک رکھ سکتی، اس کے جال میں پھنس جانے سے بچا سکتی ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو عصمت دوسری کو حفظت کہتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی خصوصیت خاصہ عصمت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے سوائے جو کچھ ہے اس کی طرف رخ کرنے کی یا گناہ کرلے کی صورت ہی ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ان میں اور اس میں زبردست روک انتہائی سخت آڑے آجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ صرف اللہ ہی کا کام کیا کرتے ہیں اور سب کچھ اللہ ہی کے واسطے کرتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم

کو حفظت کہتے ہیں یہ اولیاء اللہ کی حفاظت کرتی ہے اللہ نے اپنے دوستوں ہی کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ ان میں گناہ کا خیال اور اللہ کے سوائے جو کچھ ہے اس کی طرف تھوڑا سا التفات ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے غلبہ و تصرف سے انھیں محفوظ رکھا جاتا ہے جن کی شان ہیں" اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ " (میرے بندوں پر تیرا زور غلبہ نہ ہوگا)۔ فرمایا گیا ہے یعنی وہ تیرے دھوکہ و فریب میں نہ آئیں گے۔ ان پر تیرا داؤ نہ چل سکے گا۔ بعض ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی اس کا لطف و کرم انھیں توبہ و استغفار کی وجہ سے اس سے نکال لاتا ہے اذا احب اللہ عبداً لم یضرہ ذنب (جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو اس کو گناہ کوئی ضرر نہیں پہنچاتا) یہی بات ہے اسی معنی میں ہے جو کچھ لکھا گیا اس کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ بعض مواقع جو پھسل جانے اور تباہ ہو جانے کے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں اس سے محفوظ رکھا اور تم اس سے بچ گئے۔ اگر اب بھی کچھ موہوم سا خیال طبیعت کے لحاظ سے یا بعض دوستوں یا ساتھیوں کے حال سے جو بظاہر دنیادار ہوتے ہیں ظاہری نیم نام پر مرتے ہیں، کچھ رہ گیا ہو تو اس کو بھی نکال دینے کی کوشش کریں۔ استقامت و سلامتی کے مرکز میں رہ کر نعمت و کرامت الٰہی کے ممنون رہیں کیونکہ عافیت فراغت، سلامتی سے بڑھکر کوئی اور نعمت دولت نہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے۔ اس ضعیف کا اعتقاد، اس سعادت مند کی قابلیت و استعداد پر ہمیشہ سے تھا۔ ان معاملات کے ہونے اور ان کے اثر میں نہ آنے سے یہ اعتقاد اور بھی ثبات و رسوخ پا گیا۔ حق تعالیٰ تمہیں میری آرزو و

مقصد کے مطابق رکھے۔ میں تم سے جو اُمید رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ غربت، نامرادی، مسکنت، بیچارگی، خداطلبی، خداشناسی، راہ حق میں اپنے اپنے آپ کو لگانا اپنے آپ کو حق تعالٰی کے سپرد کر دینا ہے۔ اس کے بعد وہ بلند مرتبہ ہے جس کا نام بھی نہیں لے سکتا وہ تم سے جاری رہیگا۔ جو کچھ اس فقیر سے نہ ہوا اس کے ہاتھ نہ آیا، پورا نہ ہوا ناقص رہ گیا، وہ تمہارے ہاتھ سے پورا اور مکمل ہوگا۔ تمہیں حاصل ہو جائے گا۔ بلکہ کمال پائے گا۔ بیٹے کا وجود باپ ہی کا دوسرا وجود ہے بلکہ اس کا ہی وجود ہے۔ اگر توفیق ساتھ دے تو تمہیں ترک، تجرید، زہد مطلق کے راستہ پر لے جائیگی یہ خود ایک بڑی سعادت ہے لیکن یہ چیز آدمیوں کے حوصلہ و برداشت سے باہر ہے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو فقیر کی دعا ہے کہ اللہ تعالٰی تمہیں تو کم از کم ان باتوں سے جو وقت کی پریشانی کے باعث ہو کر حال سے بے حال کچھ سے کچھ ہو جانے سے بچائے۔ تمہارے لئے ہماری یہی آرزو ہے لیکن جو قضاء و قدر الٰہی میں ہے اس کا کوئی علاج نہیں۔ آپ ہر وقت یہ دعا کرتے رہیں۔ اپنے آپ پر اس کا ورد لازم کریں۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعوذبک من جھد البلا ودرك الشقا وسوء القضاء و شماتت الاعداء۔ اس دعا کے بعد اکثر اوقات یہ دعا زبان پر آتی رہتی ہے جو اس فقیر کی بڑھائی ہوئی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ من الحور بعد الکور ومن الخیبۃ بعد الرجا من المنع بعد العطاء اور یہ دعا اَللّٰھُمَّ احسن عافیتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاٰخرۃ۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں جو خیالات واحتمالات

کہ تمہارے فائدہ کے تھے اس سے اس ضعیف پر کس قدر قبض مسلط تھا اس کو نہیں کہہ سکتا تھا۔ اب ایک ذوق، فراغت انبساط اپنے باطن میں پاتا ہوں جس کو عبارت میں لانے کی زبان و قلم میں سکت نہیں۔ خدا کرے آپ اسی پر رہیں۔ اپنے پروردگار سے راضی اور اس سے امیدوار رہیں۔ پروردگار تعالیٰ خیر کے دروازے کھولے رکھے۔ سب کچھ اسی پر منحصر نہیں اگر ایک دروازہ بند ہوگیا تو اے دل ناامید نہ ہو کہ دوسرا کھل جائے گا اس بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔ قلم کو تکلف سے اور زبردستی روک رکھ رہا ہوں۔ اگر چھوڑ دیا جائے تو وہ سرپٹ چلنے لگ جائیگا

بس کنم بر طالباں را ایں بس است بانگ در کردم اگر در دہ کس است

(ختم کرتا ہوں کہ طالبوں کے لئے یہ کافی ہے۔ آواز دیدی اگر گاؤں میں کوئی ہے)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ رباعی مکتوب کے شروع سے سر میں گھوم رہی ہے کہیں اس کو رکھنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ اب لکھی جارہی ہے۔

ہل تا بکند بر آنچہ یار ت خواھد ٭ کاں یار ہمہ نظام کار ت خواہد

(وہی بہتر ہے کہ جو تیرا یار چاہے ـــــ وہ یار تیرے کام کی درستی چاہتا ہے)

او حسن و جمال روزگارت خواہد ٭ آں باد بہ تو کہ آں نگارت خواہد

(وہ دنیا کا حسن و جمال چاہتا ہے ـــــ وہی ہو جائے جو تیرا معشوق چاہتا ہے)

(بادون واں مکتوب)

مکتوب ۱۵

سورۂ عادیات کی تفسیر

اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا پروردگار عالم جل جلالہٗ قسم کھا رہا ہے غازیوں کے گھوڑوں کی کہ وہ پھنکارے مارتے ہوئے دوڑتے ہیں گھوڑے جو آواز نکالتے ہیں اس کے نام یہ ہیں صہیل ۔ بلند آواز جیسا کہ وہ عادتاً ہنہناتا ہے ۔ حمحمہ ۔ وہ آواز جب وہ دانہ چارہ کے لئے پکارا کرتا ہے ضَبْحًا وہ آواز جو دوڑنے میں اس سے نکلتی ہے ۔ گھوڑے کی فضیلت میں بہت احادیث آئی ہیں ۔ آپ نے فرمایا کہ نیکی' بہتری گھوڑوں کی پیشانیوں میں لکھی ہوئی یعنی ان کی پیشانی کے بالوں میں نیکی ہے اس سے بڑھکر اور کیا نیکی ہوسکتی ہے جس سے کفار سرنیچا کریں۔

فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ۔ اپنے سموں کے ٹکرانے سے آگ نکالنے والے ہیں یہ کیفیت وصورت گھوڑے کے دوڑنے میں ہوا کرتی ہے ۔

فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ۔ علی الصبح غارت کرنے والے ہیں یعنی صبح کے وقت حملہ آور ہونے والے ہیں یہ سواروں کی تعریف ہے جو گھوڑوں کی وساطت سے کی جا رہی ہے کہ وہ سوار ایسی صفت رکھتے ہیں ۔ عموماً ، حملہ نخت وتاراج صبح کے وقت ہی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبح سویرے جس شہر یا گاؤں پر حملہ کرنا ہوتا تو اس کے نزدیک جا کر ٹھہرے رہتے

اگر وہاں اذاں کی آواز سنتے جو اسلام کی علامت ہے تو اس کو زیر کرلینے
حملہ کرنے سے باز آجاتے۔ اگر اذاں کی آواز نہ سنتے تو اس گاؤں یا شہر پر
حملہ کرکے اس کو فتح کرلیتے۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا صبح میں غبار اُٹھاتے ہیں یعنی صبح میں
گھوڑے گرد اُٹھاتے ہیں کہ وہ ان کے دوڑنے کا نتیجہ ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ایک گروہِ دشمنانِ دین کے بیچوں بیچ
گھس آتے ہے۔ گھوڑے دوڑ اکر دشمنوں کے قلبِ لشکر (درمیانی حصہ فوج)
پر آجاتا اور غالب ہوجاتا ہے غازیِ دین کے دشمنوں کو غارت کردیتے
ہیں۔ گھوڑوں کی قسم کھانے میں درحقیقت قدرت کا اظہار اور غازیوں کا
مرتبہ بتلانا ہے اتنا سمجھ لو کہ جب گھوڑوں کی یہ عزت ہے تو غازیوں کی
کیا عزت نہ ہوگی۔ گھوڑے حیوانات میں سے ہیں اعزاز و اظہار دین کے
لیئے جب ان کی اس قدر عزت ہے تو غازیوں کی جو عزت اس کی نظر میں
ہوگی وہ ظاہر ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ - انسان اپنی پیدائش
خاصیت کے لحاظ سے بشریت کے لوازمات جو اس کی جبلت میں
نشوونما دئے گئے ہیں وہ اپنے پروردگار کا ناشکرہ ہے۔ نافرمانی کیا
کرتا ہے۔ کنجوسی کو کام میں لایا کرتا ہے۔ لکنود کے یہی تین معنی بتائے
گئے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ انسان سے یہاں مراد عبداللہ بن ابی منافق
ہے یہ سورۃ اسی کی مذمت میں نازل ہوئی ہے۔ اس روایت کے ہوتے
ہوئے بھی ربط کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا فرمانا یہ ہے کہ
غازیوں کو چاہیئے کہ وہ پروردگار تعالیٰ و تقدس کا شکر ادا کریں کہ اللہ تعالیٰ

و تقدس نے انھیں یہ توفیق مرحمت فرمائی کہ وہ دین کے دشمنوں کا مقابلہ کرکے ان کو زیر کر لیا کرتے ہیں، مال و دولت میں سے اللہ کے لئے خرچ کیا کرتے ہیں۔ کنجوسی نہیں کرتے اللہ کے سوائے دنیا میں جو کچھ ہے اس میں مبتلا نہیں ہوتے۔ خدا کے گنہگار نہیں ہوتے۔ یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَھِیْدٌ۔ خدائے تعالیٰ شانہٗ انسان کی کنجوسی ناشکری، نافرمانی پر گواہ اور مطلع اس کی اقتضائے طبیعت سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنے احوال کا آپ ہی گواہ اور مطلع ہے اس کو اچھی طرح سے جانتا ہے بلحاظ آثار و ظہور کے وہ اس کے ظہور رہیں۔ اس سے عمل میں آئے ہیں وہ اپنے ظاہری و دلی باتوں سے بخوبی واقف اس کے نتائج و ثمرات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اپنا گواہ آپ ہے اگرچہ وہ اس سے غافل ہے۔ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ اپنی خامیوں کوتاہیوں کو نہیں مانتا۔ غفلت برتے جاتا ہے۔ ہوشیار نہیں ہوتا۔

اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ، وہ مال کو دوست رکھنے میں بہت سخت ہے وہ مال کو بہت عزیز رکھتا ہے اس کو دولت پیاری ہے۔ بال بچوں، مال و دولت پیسے ٹکے پر مرا ہوا ہے۔ نقد پر جان دیتا ہے لفظ "خیر" قرآن شریف میں مال کے معنی میں بہت جگہ آیا ہے۔ مال کو مال اس لئے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کے ہاتھ کا میل ہے یہ اس کی جبلت اور پیدائشی خصلت و عادت کے جیسا ہے جس میں بھلائی بھی ہے کہ وہ خدا کے راستہ میں خرچ ہوتا ہے۔ خدا کی مخلوق پر صرف ہوتا ہے "شدید" بخیل کے معنی میں بھی آیا ہے۔ مال کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ نعمت کا شکر تک ادا نہیں کرتا۔ اس کو اللہ کے راستہ میں حق کے واسطے صرف نہیں کرتا، کنجوسی پر اتر آتا ناشکری نافرمانی

کرجاتا ہے۔

اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ کیا انسان اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کا کیا حال ہوگا جب کہ وہ قبر سے اُٹھایا جائے گا یعنی جب سب انسان اپنی قبروں سے اُٹھائیں جائیں گے۔ یعنی زندہ کئے جائیں گے۔

وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ۔ جو سینہ میں ہے وہ جمع اور حاضر کی جائے گی یعنی جو کچھ نیکی اور بدی سینہ میں یعنی چھپی ہوئی ہے وہ سامنے آجائیگی۔ اور وہی پائیں گے جو سینہ میں ہے اقوال وافعال (کہنے کرنے) کی یعنی دونوں کی تخصیص سینہ ہی سے جو مخصوص کی گئی اس کی وجہ یہ ہے کہ چھپے ہوئے کام دل کے اعمال، بنیادی اور اصلی ہاتھ پاؤں، اعضاء جوارح کے صفاتی کام اسی کی تفصیل و اظہار ہیں۔

اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ پروردگار ان کا ان کے کاموں کی خبر رکھتا ہے، دانا بینا ہے۔ یَوْمَئِذٍ اس دن یعنی قیامت کے دن ان کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا، انھیں کیا پیش آئیگا اس کو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ بدلہ دینے میں وہ زبردست قوت والا ہے اس لئے اس سے سارے حالات میں قول فعل اور حال میں ڈرتے رہنا چاہیے اور تقوی پر کاربند رہنا اور تقوی کو کام میں لانا ضروری ہے۔ اللہ ہی کی طرف سے توفیق ملتی ہے وہی توفیق دینے والا ہے۔ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن شریف کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ قرآن شریف کا ظاہر یہ کہ اس کی ظاہری عبارت سے شریعت کے قواعد اس کے احکام عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ قرآن شریف کا باطن یہ کہ اس کے باطنی اشارہ سے اہل وجد اہل حال پر تجلیات و احوال کھلتے ہیں

غازیوں کے گھوڑوں کے جو صفات بیان ہوئے ان کو اہلِ باطن نفوسِ کاملہ کی صفت ٹھہراتے ہیں۔ عَادِیٰتِ یعنی وہ نفوس جو کمالات کی طلب اور مقام قربِ الٰہی کی جستجو میں رہتے، سراپا جستجو ہو جاتے ہیں۔ وَالْمُورِیٰتِ یعنی "انوار" معارف کو نکالنے اور مشتعل کرنے والے نکار قرار دیتے ہیں وَالْمُغِیْرٰتِ غارت کرنے والا، غالب آنے والا اپنی نفس کی خواہشوں اور اس کی عادتوں پر اور فضیلتوں اور غنیمتوں کو ہاتھ لے آنے والا، کمالات پر فائز ہونے والا۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا۔ اُبھارنے والا۔ شوق دلانے والا۔ کمالاتِ غنا کا جد و جہد کا۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا جمع ہو جاتے ہیں، عالم علوی، صفات ملکوتی۔ یہ کہتے ہیں کہ ان نفوسِ کاملہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ کیونکہ آدمی کمال و سعادت اخروی قربِ الٰہی کی تحصیل میں ناشکری کیا کرتا ہے۔ کوتاہی کو کام میں لاتا ہے اور جانتا ہے کہ وہ قصور کر رہا ہے لیکن غفلت کے چھا جانے، جسمانی تعلقات میں گھر جانے سے اس میں ایک نادانی احانی ہے۔ غفلت نادانی کے اسباب، تعلقات جسمانی و لذاتِ دنیاوی ہیں۔ ان میں جو پھنس گیا وہ اسی میں رہ جاتا ہے۔ لیکن جب پردہ اُٹھ جائے گا، جس دن حقیقت حال سے آگاہی ہو جائیگی۔ تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کہ بات کیا ہے اس لئے لازم ہے کہ مراقبہ الٰہی میں رہ کر ان احوال کو ہاتھ سے جانے نہ دیں، غافل نہ رہیں۔ فارغ بیٹھ نہ رہیں اس آنے والے دن کے لئے کام کرتے ہوئے مجاہدہ میں رہیں۔ ظاہری و باطنی غازی ہو جائیں۔ و اللہ اعلم (مکتوب اُٹھاون واں)

مکتوب ۱۶

لڑائی سے مُنہ پھیرنا..... اور طاعون وبا میں مقام چھوڑنا.....

الله وَ رَسُوله

آپ کا خط ملا۔ احوال معلوم ہوئے۔ آپ کے احوال کی سلامتی کا شکر
بارگاہِ حق تعالیٰ میں ادا کیا گیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ (اللہ کا شکر
ہر حال میں) آپ نے طاعون سے بھاگنے کی نسبت سوال کیا ہے۔ اس بارہ میں یہ
حکم ہے کہ "جہاں طاعون ہو وہاں سے نہ بھاگیں جہاں ہو وہاں نہ جائیں"۔
یہ قطعیہ مسئلہ ہے اس میں اختلاف نہیں۔ احادیث صحیح میں ایسا کرنے سے منع
کیا گیا ہے۔ اس کا کرنے والا گنہگار اور ایسا کرنا گناہ ہے۔ حدیث صحیح جو
عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جس میں لڑائی سے بھاگنے کی تشبیہ دی
گئی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گناہ ہے۔ اگر کسی کا یہ اعتقاد ہو کہ اگر
بھاگ جاتا ہوں تو بچ جاتا ہوں اگر رہ جاتا ہوں ہلاک ہو جاتا ہوں تو ایسا شخص
کافر ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ طاعون سے مراد ایک عام بیماری ہے جو وبا
کی طرح پھیلتی ہے۔ سب بیماریوں سے مرنے کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ وبا
طاعون ایک ہی ہے۔ قاموس میں لکھتا ہے کہ طاعون و وبا مرض عام ہے جس
میں اکثر مبتلا ہوتے ہیں۔ احادیث میں طاعون کو عام طور سے پھیلنے والا مرض
بتلایا گیا ہے۔ طب والوں نے طاعون کے مرض کی اس طرح صراحت کی ہے کہ
وہ زہریلے مادہ کا جمع ہونا ہے جو آدمی کے جسم میں آجاتا ہے جمع ہوتا ہے

جس سے بغل کے نیچے، جوڑوں میں گانٹھ نکل آتی ہیں جنھیں گلٹیاں کہتے ہیں۔ وہ دنبل کے جیسے ہوتے ہیں جن میں جلن ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس میں بہت لوگ مبتلا ہو جاتے اور اکثر مر جاتے ہیں بہت سارے بچ جاتے ہیں۔ اگر عام ہو جائے وبائی صورت اختیار کرے تو ایسی صورت میں بھی وہ اسی معنی میں ہے۔ صرف طاعون ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر مرض جو کہیں عام ہو جائے وبائی صورت اختیار کرے تو ایسی صورت میں بھی وہ اسی معنی میں ہے۔ صرف طاعون ہی کے لئے نہیں بلکہ ہر مرض جو کہیں عام ہو جائے وبائی ہے اس کے بارے میں بھی یہی حکم ہے۔ بہت سی احادیث میں اس کا مذکور ہے اس نے جو طاعون ہی کو صرف اس کی خاص صورت و معنی سے متعلق کیا ہے وہ صریح جہل ہے اس کے سوا ہر قسم کی وبا میں اجازت کا ہونا تصور کر کے فتویٰ دے دیا۔ بلکہ وہاں سے نکلنا واجب قرار دے دیا۔ یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ جہاں وبا ہو وہاں سے نکلنا نہ چاہیئے۔ جہاں ہو وہاں جانا نہ چاہیئے۔ بہرحال وہ شخص گنہگار ہے جو یہ کہتا ہو کہ نکل جانا واجب ہے واجب کا ترک بھی گناہ ہے جزری نے آخر میں لکھتا ہے کہ طاعون ایک عام وبائی مرض ہے۔ آب وہوا کو بگاڑ دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ فساد ہے چاہے وہ ایک ملک میں ہو یا ایک شہر میں یا ایک محلہ میں، ایک گھر میں اس میں بعض سلامت رہتے ہیں، بعض مر جاتے ہیں، چاہے علاج ہو یا نہ ہو۔ ہوا میں فساد آجاتا ہے دونوں صورتوں میں یہی حکم ہے۔ جن شہروں کی ہوا صاف ہو وہاں کی بھی ہوا اگر بگڑ جائے، روئے زمین پر اگر جگہ نہ رہے تو پھر کیا ہوگا۔ ایک بات یہ کہ خود جس میں مبتلا ہوں اس کو لے کر دوسروں کے پاس جانا نہیں اس میں مبتلا کرنا ایک جگہ کے فساد کو دوسری جگہ پہنچانا

اچھی چیز نہیں اس لئے منع ہے۔ خدا کی زمین سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ احتیاط و لوازم مسنون ہیں۔ اس سے زیادہ کرنا کسی قاعدہ کے تحت نہیں آتا جو بات بزرگوں نے کہی ہے وہی سچی بات ہے کہ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ قادر مختار کے کام ہیں۔ یہ ایک عذاب ہے کہ اپنے بندوں پر امتحان کے طور سے بھیجتا ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ صبر کریں۔ حکم کی تعمیل کریں یا بصورت دیگر بے صبری کریں گناہگاری پر اتر آئیں۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝

(پیدا کیا موت اور حیات کو تاکہ آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے)

حدیث شریف میں ہے کہ طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر بھیجا گیا تھا۔ جب تم سن پاؤ کہ کسی مقام میں طاعون ہے تو تم وہاں نہ جاؤ اور جس زمین پر تم ہو یعنی جہاں تم رہتے ہو اگر وہاں ہو جائے تو وہاں سے کسی اور جگہ نہ جاؤ خبردار اس جگہ سے باہر نہ جانا حدیث میں ہے کہ طاعون سے مرنا مسلمان کے لئے شہادت کا مرتبہ پانا ہے جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ صاف آیت ہے کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو یاد رہے کہ یہ عام حکم ہے۔ ہر موقع و محل کے لئے ہے۔ ظاہر ہے کہ طاعون کے مقام میں ٹھہرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ لیکن طاعون پھیل جانے کے بعد بھاگ کھڑا ہونا کیا اہمیت کی بات نہیں کہ جس کے بارے میں مخصوص نہی (خاص طور پر منع کی گئی) ہے اس کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ سنو وہ اور یہ دونوں باتیں عام و خاص سے متعلق ہیں ہلاکت میں ڈالنا اور ہلاکت میں پڑنا دو باتیں ہیں۔ "خود کو نہ ڈالو"۔ تو پھر وہاں سے کسی اور جگہ جا کر دوسروں کو ہلاکت میں کیوں ڈالا جائے ان کے پاس اس

کا کیا جواب ہے۔ فساد کے پھیلانے سے منع کیا گیا اور طاعون کو فساد
کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے جہاں ہیں وہیں رہنا چاہیئے۔ بعض لوگ ایسے
ہیں کہ وہ گھر کے جلنے کی صورت کا قیاس کر کے۔ یا سخت بارش و طوفان کی
حالت جس میں گھر گر جانے کا خوف ہوتا ہے یہ تصور لا کر کہتے ہیں کہ ایسے
مواقع میں نکل جانے اور بھاگ کھڑے ہونے کی جب اجازت ہے تو طاعون
کو بھی ویسا ہی سمجھنا چاہیئے۔ یہ وہ صورت و حالت ہے جس کی سند لینی غلط
اور نامناسب ہے کیونکہ یہ عادتی اسباب ہیں، توہمی اسباب میں سے نہیں
اس کے جواب میں اگر یہ کہیں کہ یہ ہمارا تجربہ ہے جو طاعون کی جگہ سے نکل
آتا ہے وہ سلامت رہ جاتا ہے اس کو ہم نہیں مانتے یہ کوئی مسلمہ کلیہ
نہیں۔ کہ بچ سکتے ہیں کثرت و تواتر کے ساتھ سننے میں بھی نہیں آیا۔ اگر
ایسا ہو جائے تو بھی ہو سکتا ہے لیکن ہونا ضروری نہیں۔ ہم جس بحث میں
ہیں اس میں بھاگنے سے منع کیا گیا جس آیت پر قیاس کیا گیا ہے اس میں بھاگنے
کا کوئی مذکور نہیں بلکہ جہاں ہیں وہاں سے نہ جانے کی ہدایت پائی جاتی ہے
مثلاً جان بوجھ کر آگ میں گرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے یہ سند لینی بھی
باطل ہے یہ توہم ہی توہم ہے اس بات کی تفصیل مشکوٰۃ میں یحییٰ بن عبداللہ
بن بحیر بردون فقیر۔ ایک حدیث ابوداؤد کی روایت سے لا کر کہتا ہے کہ
یحییٰ نے مجھے خبر دی کہ کسی نے فروہ بن مسیک سے سنتے ہوئے کی یہ
روایت کی کہ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہماری ایک زمین ہے جس کو ہم
" ابین بحار کہتے ہیں یہ وہ گاؤں ہے جو سمندر کے کنارے ہے۔ ہماری
زمین وہاں ہے۔ ہم سال بھر کا غلہ و خرچ وہاں سے لے آتے ہیں بال بچوں
کے کھانے پینے کا سامان کر دیتے ہیں۔ لیکن آجکل وہاں وبا پھیلی ہوئی

ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو وہیں رہنے دو
اس سے دور رہو۔ قرق سے تلف (نقصان) آتا ہے۔ قرق ایک شہر
ہے کہ جس میں بیماریاں دبائیں، درد، دکھ بہت ہیں غور کرو۔ کہنے والا
عرض کر رہا ہے کہ وہاں وبا ہے عام بیماری ہے جس میں سب مبتلا
ہو جاتے ہیں اس کے جواب میں حکم ہوتا ہے کہ چھوڑ اس کو کہ وہاں وبا
اور مہلک بیماری ہے اس سے بچنا چاہیئے یہ بھی پوری دلیل نہیں ۔
ابھی اوپر مذکور آ گئے ہے کہ اس نے بُری فال لی غلط اندازہ لگایا۔ اس
لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دے دی۔ تاکہ وہ شرکِ
خفی میں نہ آ جائے کیونکہ اس کا حال ضعیف تھا اس کے حال پر نظر
کر کے بڑی چیز سے بچانے کے لئے چھوٹی سی بات کی اجازت دے دی
اس میں اس کو شرکِ خفی سے بچا دیا گیا۔ اس میں وہاں سے نکلنے وہاں
رہنے میں گفتگو نہیں ہے۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ جہاں وبا پھیلی ہو
وہاں سے بھاگ کھڑے ہونے کی اجازت دے دی گئی ہو۔ مسئلہ
زیرِ بحث یہ ہے کہ جب تم کسی سرزمین میں ہو جہاں وبا پھیل جائے تو
تم وہاں سے باہر کسی اور شہر میں نہ جاؤ۔ بلا آنے سے پہلے دعا، احتیاط
بچنا بچانا، واجب و لازم ہے جب آ جائے تو صبر و رضا کے ساتھ دعا
درود میں رہنا، یہ بات احادیث سے ثابت ہے۔ احادیث سے جو صحاح
میں آئی ہیں ان کے منع و نہی میں ہیں جس میں بھاگنے سے منع کیا گیا ہے
وحشت و بے صبری کے بجائے صبر و ثابت قدمی کا حکم ہے۔ شہادت کا
مرتبہ ملنے کا مذکور ہے۔ فال بُرا شگون لینے کے بارے میں جو کچھ ہے
وہی وبا و طاعون کے بارے میں بھی ہے زمین عورت گھوڑے کا

نحوست میں بعض احادیث آئی ہیں۔ یہ حدیث بھی انہی حدیثوں میں سے ہے جہاں فال اور شگون لینے کو معتبر قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس کی نفی کی گئی۔ مراد یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو ضرور ان تین چیزوں میں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ذاتی چیز نہیں۔ اس کا وجود ہی نہیں کیونکہ یہ خود قائم بذاتہ نہیں (اپنے آپ سے قائم نہیں) تاثیر دینے سے اثر آسکتا اور رہ ہوسکتا ہے۔ بعضوں نے یہ کہا ہے کہ منحوس دیکھنے میں وہ ہے جو ناسازگار، بدخلق، بُرا ہے جس سے لوگ تنگ آجائیں بُرا ہمسایہ، بُری آب و ہوا، گھوڑا جو بدمزاج اور گرم ہو منحوس ہے منحوس بدشگون کے معنیٰ میں نہیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی گھر کو بُرا سمجھے یا کسی کو گھوڑا اچھا معلوم نہ ہو تو اس کو نکال دینا چاہئیے تاکہ کراہیت جاتی رہے اس کی شرح میں احادیث موجود ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث کچھ اور کسی اور معاملہ میں ہے یہ قذف و تلف کی جو حدیث ابی داؤد سے مروی ہے وہ دوسری حدیثوں کی معارض نہیں جو صحیحین وغیرہ میں واقع ہوئی ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ فزدہ بن مسیک وہ ہیں جن سے ایک یا دو حدیث مروی ہیں اور یہ مشہور مرد بھی نہیں ہیں کہ جن کا نام پہچان لیا جائے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ ثقہ بھی ہیں یا نہیں روضتہ الاحباب میں۔ آخر کتاب میں سماع کے بارے میں یہ حدیث بھی گفتگو میں آئی ہے ایک خلط ملط ہے۔ اس میں ایک ایسا خیال مل گیا ہے جس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بہرحال حکم یہی ہے کہ اپنے فساد اپنی بیماری

میں دوسرے کو پیسٹ نہ لو جہاں رہتے ہو، وہاں رہو، جہاں بیماری و با پھیلی ہو وہاں نہ جاؤ۔ دوسروں کے فساد بیماری کو اپنے گلے نہ ڈال لو۔ جہاں ہو وہاں سے نہ نکلو نہ کہیں جاؤ، دوسروں کو اپنے فساد اپنی بیماری میں مبتلا نہ کرو۔

دوسری بات جو آپ نے دریافت کی ہے وہ یہ تھی کہ وہ کھانا جو میت کے ساتھ بھیجا جاتا ہے اس کو کھا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس بارہ میں کلیہ یہ ہے کہ صدقہ فقیروں کا حق ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدقہ دولتمند کے لئے بھی جائز ہے۔ لیکن فتویٰ اس بارے میں کراہیت کا ہے۔ البتہ وہ کھانا جو میت کے گھر والوں کے پاس بھجوایا جاتا ہے وہ میت کے گھر والوں کے لئے مخصوص ہے۔ جو مصیبت زدہ، رنجیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس بطور ضیافت کے بھیجتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ جائز ہے بعضوں نے یہ کہا ہے کہ تین دن تک کا کھانا اہلِ میّت ہی کے لئے مخصوص ہے۔

آپ نے یہ لکھا تھا کہ ایک شخص نے وصیت کی میرے بعد میری روح کے لئے حلوا روٹی پکا کر نیک لوگوں کو کھلائیں اس کی ادائی لازم آتی ہے یا نہیں۔ یہ پورے طور سے وصیت میں داخل ہے۔ وصیت بالعموم علی الاطلاق جائز ہے۔ کتاب مطالب المؤمنین میں ایک بات اس کے متعلق لکھی ہے۔ چنانچہ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ ایک شخص نے وصیت کی کہ جو لوگ میری میّت میں شریک ہوں تعزیت کے لئے آئیں تو میری وصیت یہ ہے کہ انھیں کھانا کھلایا جائے۔ آپ نے فرمایا جائز ہے ضرور کھلایا جائے۔ کیونکہ وصیت میں ثلث تک (تین حصہ تک) اجازت ہے چنانچہ ان لوگوں کو جو حاضر تھے کھلایا گیا۔ اس میں امیر بھی تھے فقیر بھی تھے

چونکہ اس نے نیک مردوں کا ذکر کیا ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے اگر خلش اس سے ہو رہی ہے کہ میری روح کے لئے جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ کسی کے نام یا کسی کی روح کے لئے کہیں تو وہ کھانا مکروہ ہے۔ اگر میری روح سے اس نے یہ مطلب لیا ہو یا اس کا یہ ارادہ ہو کہ نیک لوگوں کو کھلائیں تو اس کا ثواب میری روح کو پہنچے گا' تو کیا چیز ہے کہ جس سے بچیں۔ اس سے کہاں لازم آتا ہے کہ صدقہ زندگی ہی میں دیا جائے تاکہ مرنے کے بعد نفع دے۔ ان کے لئے یہی حکم ہوا ہے۔ یہ جو کچھ کہ ملکوں میں مشہور و معروف ہے رائج ہو گیا ہے کہ کسی بزرگ کی روح کے لئے کھانا پکاتے ہیں تاکہ لوگوں کو کھلائیں تاکہ اس کا ثواب اس بزرگ کی روح کو پہنچے' اگر صدقہ کہیں تو وہ فقیروں ہی کے لئے ہے۔ اگر بطور ضیافت کیا ہے تو سب کھا سکتے ہیں۔ اگر دلیل قطعی سے ثابت ہو جائے کہ یہ لفظ (یعنی میری روح) کہنا درست نہیں۔ اگرچہ کہ اس کے معنی صحیح ہیں تو وہ اور بات ہے۔ یہ لفظ ہی نہیں کہنا چاہئے۔ ایسا نہیں ہے

یہ بات آپ کے خط میں یہ تحریر تھی کہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کفن میں عمامہ نہیں ہے فقہ کی کتابوں میں اس بارے میں بہت بحثیں ہیں۔ تحقیقی بات کیا ہے آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہے کہ عمامہ کا بڑھانا بعض متاخرین کی مہربانی' نیک کام ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں۔ اسناد دینے میں کیوں یہ شروع کیا گیا معلوم نہیں ہوتا۔ کتاب شرح میں ابومکارم کہتے ہیں کہ یہ مروی ہے عمر رضی اللہ عنہ سے جس کو مالک نے لیا ہے۔ لیکن حدیث سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ عمامہ نہ تھا۔ ظاہر حدیث کا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تین کپڑوں میں کفنایا گیا۔ جو صاف و سفید تھے۔ اس میں قمیص و عمامہ نہ تھا

اس حدیث کی تاویل وہ لوگ جو عمامہ کے قائل ہیں یوں کرتے ہیں ان تین کپڑوں میں قمیص عمامہ داخل نہیں بلکہ یہ علحدہ تھے۔ اس لحاظ سے پانچ کپڑے ہوئے۔

ایک اور بات آپ نے یہ لکھی تھی کہ کوئی روایت یا حدیث اس بارے میں بھی ہے کہ جواب نامہ میت کے لئے لکھتے اور اس کے سینہ پر رکھتے ہیں۔ ایسی حدیث ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہماری نظر سے نہیں گزری۔ البتہ بعض کتابوں میں جو قوی و ضعیف روایات جمع کر دئے گئے ہیں جیسے کہ مفتاح الجنان وغیرہ۔ البتہ کنز العباد نقل کفایہ شعبی میں ایک بات کہی گئی ہے جو اس سے مناسبت رکھتی ہے وہ کہتا ہے کہ متقدمین سے کسی نے لڑکے کو وصیت کی کہ جب مجھکو نہلا کر کفن پہنادیں تو میری پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھدینا۔ چنانچہ ویسا ہی کیا گیا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کو خواب میں دیکھا گیا اور پوچھا گیا کہ کیا حال ہے تو جواب دیا کہ جب تم مجھکو قبر میں رکھکر چلے گئے تو فرشتے عذاب کے لئے آئے۔ میری پیشانی اور سینہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا ہوا دیکھا تو مجھ سے انھوں نے کہا تو امن پا گیا عذاب سے۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو کوئی جمعہ کی رات کو مرتا ہے تو جمعہ کے دن وہ قبر کے عذاب سے امان پا جاتا ہے۔ کیا اسی دن کے لئے مخصوص ہے یا حشر تک۔ یہ بشارت اہلِ ایمان کے لئے ہے کافروں کے لئے بھی ہے؟ آپ نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے وہ مشکوٰۃ میں مذکور ہے کہ عن عبداللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ما من مسلم یموت یوم الجمعۃ او لیلۃ الا وقاہ اللہ فتنۃ القبر۔ رواہ احمد والترمذی قال ھذا حدیث لیس اسنادہ بمتصل۔ سیوطی نے جمع الجوامع میں احمد بیہقی۔ شیرازی اور القاب میں ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابی نعیم رضی اللہ عنہ سے اور حلیہ میں

جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ جو کوئی جمعہ کو مرتا ہے وہ عذاب قبر سے نجات پاتا ہے۔ قیامت میں جب اُٹھتا ہے میدان حشر میں آتا ہے تو اس کے منہ پر شہیدوں کی مہر ہوتی ہے۔ ان احادیث کا ظاہر ہمیشہ کو ثابت کرتا ہے۔ واللہ اعلم۔ چونکہ حدیث میں مسلم واقع ہوگیا ہے اس لئے کافر بالکل خارج ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ او لیلۃ الجمعتہ یا جمعہ کی رات خاص کرتا ہے۔ یا شک راوی کا ہے۔ بظاہر خصوصیت ہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی نے کہا کہ ہمارا عمل قرآن و حدیث پر نہیں ہے۔ ہمارا عمل فقہ پر ہے تو اس پر کیا لازم آتا ہے۔ سنئے اگر اس نے یہ بات قرآن و حدیث کو خفیف ٹھہرانے یا ان سے بے تعلق ہونے کے لئے کہی ہے اور فقہ کی تعظیم و ترجیح دینے کے لئے کہی ہے تو کافر ہوجاتا مرتد بن جاتا ہے اگر اس لحاظ سے کہا ہے کہ یہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے۔ قرآن و حدیث ہی سے مجتہدین نے آیات قرآن و احادیث کو مطابق کرکے ناسخ منسوخ کو پہچان کر کہا۔ اس کی تاویل کی ہے اور میں ان کی تقلید میں ہوں' ضرورتاً ان کی تقلید کرتا ہوں' مجھ میں یہ قدرت نہیں کہ احکام شرع کو خود کتاب و سنت سے معلوم کروں ایک بات ٹھہرا کر اس پر چلوں اس لئے مجھ پر لازم ہے کہ ان روایات کی جو امام صاحبان نے فرمائی ہیں اس پر چلوں اسی پر رہوں' اس لئے ان کی تقلید میں ہوں' یہ کہنا ایک وجہ رکھتا ہے۔ یہ فرمان ہے کہ پوچھو اہل علم سے اگر تم نہیں جانتے ائمہ فقہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کی بھی اتباع قرآن حدیث ہی سے نکالے ہوئے احکام کی اتباع ہے۔ آپ کے جوابات جلدی میں لکھدئے گئے۔ لکھتے وقت اگر کوئی خطا ہوگئی ہو تو اصلاح کردیں واللہ اعلم۔ (چھیاسٹھواں مکتوب)

مکتوب (۱۷)

ایمانِ باس

(زندگی سے ناامیدی اور خوف میں لایا ہوا ایمان)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحق وارزقنا اتباعہ (اے ہمارے اللہ دکھلا ہم کو حق اور اس کی پیروی عطا کر) اچھی طرح سے سمجھ لو۔ یقین کے ساتھ جان لو کہ ہمارے علمائے ملت۔ آئمائے دین و شریعت کا فیصلہ یہ ہے کہ زندگی سے ناامید، خوف طاری ہو جانے کے بعد لایا ہوا ایمان مقبول نہیں متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ایمان البأس غیر مقبول (خوف و ناامیدی میں لایا ہوا ایمان مقبول نہیں) باس کے معنی لغت میں سختی۔ عذاب۔ خوف دکھ کے ہیں۔ شرع میں نزع کے عالم میں یعنی سکرات موت میں آخرت کے احوال جو مرنے سے تھوڑی دیر پہلے مرنے والے پر کھل جاتے ہیں اس کے دیکھنے میں آنے کے بعد کا ایمان مراد ہے۔ بعض احادیث میں یہ ہے کہ ہر شخص مومن ہو یا کافر مرتے وقت اپنی جگہ مومن جنت میں، کافر دوزخ میں دیکھ لیتا ہے اس کے دکھ جانے یا دیکھ لینے کے بعد اگر کوئی کافر ایمان لے آئے تو اس کا ایمان قابلِ اعتبار نہیں یعنی وہ ایمان ہی نہیں۔ کیونکہ غیب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایمان بندہ کا اختیار کیا ہوا پسند کیا ہوا۔ دیکھا بھالا ہوا ہوتا ہے اس کا تعلق امور دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور اس کی اطاعت اس کے رسول کی اتباع و فرمانبرداری سے ہے۔ مگر پر موت آکھڑی ہو جانے

احوال آخرت کھل جانے غیب کے دکھ جانے کے بعد غیب پر ایمان لانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا جس کو ایمان بالغیب کہتے ہیں وہ یہ نہیں ہے بلکہ یہ اضطراری ایمان ہے۔ اختیاری ایمان نہ ہونے سے اس کا کوئی اعتبار یا کسی قسم کی اس کی وقعت نہیں ایسے وقت میں یہ ایمان لانا ویسا ہی ہے جیسا کہ قیامت میں کافر ایمان لا کر کہیں گے۔ اے پروردگار ہم نے دیکھ لیا سن لیا۔ ہمیں دنیا میں لوٹا دے تاکہ ہم نیک عمل کریں کیونکہ ہم یقین لائے ہوئے ہیں۔ خداوندا! ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہمارے کان سننے والے ہو گئے ہم نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ جو کچھ تیرے پیغمبروں نے خبر دی تھی اور جو کچھ تیرے کتاب میں تو نے فرمایا تھا وہ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ بالکل سچ ہے حق ہے ہمیں دنیا میں پھر بھیج دے تاکہ وہاں جا کر از سر نو ایمان لے آئیں۔ نیک عمل کر کے ثواب کے مستحق ہو جائیں۔ وہاں کا یہ ایمان۔ اقرار۔ اعتراف (مان لینا) ساری چیزوں اور سب باتوں کا حق ہونا جیسا کہ کہا گیا تھا ویسے ہونا' حق کی طرف سے ہونا۔ ماننا یہ وقتیہ یقین انھیں اس وقت کوئی کام نہ دے گا۔ کارآمد نہ ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی توبہ موت کے غرارے لگنے سے پہلے قبول کرتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ موت کی سکرات جان کنی' گنگھٹی میں دم آنے سے پہلے جو توبہ کی جائے وہ مقبول لائق پذیرائی ہوتی ہے۔ ایسی توبہ قابل اعتبار لائق بھروسہ ہے۔ سچ ہے کہ توبہ یہی ہے اور ایسی توبہ ہی قبول ہوتی ہے ایسا ایمان لائق قبول قابلِ وقعت اعتبار ہے قرآن مجید میں ہے کہ سختی ناامیدی کے دیکھنے کے اور دوسری صورتوں کے رونما ہونے کے بعد کا ایمان۔ ایمان نہیں۔ عذاب الٰہی کے سامنے آجانے زندگی سے ناامیدی ہو جانے کے بعد کا ایمان ایمان نہیں۔

عذاب الٰہی کے سامنے آجانے زندگی سے ناامیدی کے بعد وہ ایمان انہیں نفع نہ دے گا۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ ایسوں کے لئے توبہ نہیں ہے۔ جو گناہ کرتے رہے بڑے کام و گناہ میں رہے۔ موت کے سر پر آکھڑے ہونے تک اسی میں رہے جب موت لے ان کو آگھیرا تو اس وقت وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم اب توبہ کرتے ہیں۔ اسی آیت سے سند و دلیل لینا زیادہ مناسب ہے کہ یہ بہت واضح ہے۔ صراحت سے فرمایا گیا ممکن ہے کہ پہلی آیت میں قیامت کے علامات خوف آفتاب کا مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع کرنا' مراد ہو بعض مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے یہ آخری یعنی دوسری آیت جو ہم لکھ آئے ہیں صراحت کے ساتھ کھلے طور سے اس کو بیان کر رہی ہے۔ پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے کہ ایسے وقت میں جو توبہ کی جائے وہ مقبول نہیں۔ وہ توبہ توبہ ہی نہیں کیونکہ جب موت سر پہ آکھڑی ہو جائے تو توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ایمان مقبول نہیں ہوتا مطلب یہ کہ ایسے وقت کی توبہ توبہ نہیں ان حالات میں لایا ہوا ایمان' ایمان نہیں۔ آیات قرآنی سے ثابت اور ظاہر ہو گیا کہ ایسی حالت میں گناہوں سے توبہ توبہ نہیں وہ فائدہ مند نہیں مقبول نہیں اگرچہ بعض علماء کو اس میں اختلاف ہے لیکن مسلمہ بات یہ ہے کہ زندگی سے مایوسی ہو جانے خوف کے چھا جانے آخرت کے احوال دکھ جانے۔ دیکھنے میں آنے کے بعد کفر سے جو توبہ کی جائے وہ مقبول و معتبر نہیں۔

سب عالموں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے۔ سب کو اس سے اتفاق ہے کہ "فرعون" کا ایمان لانا جب کہ وہ ڈوب رہا تھا مقبول نہیں۔ یہ اس کا ایمان ایسے وقت کا ہے جب کہ اس کے لئے کوئی صورت ڈوبنے سے

بچنے کی نہ تھی۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ موت کے پنجے میں پھنس گیا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ میں بنی اسرائیل کے خدا پر ایمان لایا۔ اجماعِ امت اس پر ہے کہ وہ ڈوبتے ہوئے جو ایمان لایا وہ مقبول نہیں کیونکہ ایسے حالات میں جس کو خوف و ناامیدی اضطرار کہتے ہیں یہ وقت اپنی پسند اور اپنے اختیار کا نہیں ہوتا۔ بلکہ مایوسی اور زندگی کی امید نہ ہونے کا ہوتا ہے۔ ایمان لانے کا یہ وقت ان حالات میں لایا ہوا ایمان قابلِ قبول نہیں۔ سارے علما، مجتہدین، مشائخ مقتدا اس پر متفق ہیں۔ ان میں کا کوئی بھی اس میں مختلف نہیں شرع کی زبان اور اسلام کی عام شہرت میں فرعون کو ہر جگہ برا ٹھہرایا گیا۔ وہ کفر میں ضرب المثل ہو گیا غرور، تکبر، دشمنی میں کوئی اس کے برابر نہیں کئی قرآنی آیتوں سے یہ ثابت اور ظاہر ہے کہ وہ کافر تھا۔ اس کے کفر، اس کے کافر ہونے برے عادات برے انجام کی خبر کئی آیاتِ قرآنی میں موجود ہے۔ اس کے سفلہ پن اس کی ابتدا اور انجام کے متعلق صریح آیات موجود ہیں۔ چنانچہ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝ (اللہ نے دنیا اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لیا) اور فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا (فرعون نے سرکشی نافرمانی کی رسول کی پس ہم نے اس کو بڑے وبال میں دھر پکڑا) ایک اور مقام پر فرماتا ہے کہ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝ (برائی اور تکبر کیا فرعون اور اس کے لشکر نے ناحق زمین میں۔ اس نے اور اس کے لشکر نے گمان کیا کہ ان کو ہمارے پاس واپس نہیں آنا ہے۔ اس کا فرمان یہ بھی ہے کہ ہم سخت پکڑنے والے اور انتہائی ضابطہ خوب بدلہ لینے والے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی حال، کافروں، منکروں کا ہوا۔ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ

فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ (ہم نے قہر و غضب کے ساتھ اس کے اور اس کے لشکر کو پکڑ لیا۔ ڈال دیا اس کو اور اس کے لشکر کو دریا میں اور ڈبو دیا ان کو اس میں) فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (دیکھو ظالموں کا انجام کیسا۔ انتہا کیسی ہوئی) وہ ظالم، متکبر، کافر جو خدا تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ بُرائی کرتے تھے اپنے کیے کے بدلے میں دنیا اور آخرت گرفتار ہو کر رُسوا ہو گئے۔ اس کو بھی سُن لو کہ وہ فرماتا ہے۔ جَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ (ہم نے انھیں یعنی فرعون کو اور اس کے لشکر کو امام و پیشوا راستہ بھٹکے ہوئے کافروں اور منکروں کا بنایا ؛ کہ وہ بلاتے ہیں ان کو دوزخ کی طرف یعنی کفر و عصیان ان سے کرا کے ان کو دوزخ میں پہنچا دیتے ہیں) وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ لَا یُنْصَرُوْنَ ۝ (اور قیامت کے دن مدد و امداد نہیں دے جائیں گے یعنی انھیں کوئی دوزخ سے نہ بچائیگا۔ دوزخ کا عذاب رفع نہ ہوگا۔ بلکہ وہ ہمیشہ ذلیل و خوار ہو کر دوزخ میں جلتے رہیں گے) اَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً (دنیا میں اس پر اس کے لشکر پر ہم نے لعنت کی) وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِیْنَ ۝ (قیامت کے دن وہ اور ان کے لشکر والے بُرے اور قبیح، مردود ہوں گے)

ان کا حال کلام الٰہی سے تم نے سُن لیا جو حال اس کا ہوا وہ تم نے دیکھ لیا۔ جیسا تھا اس کو بھی تم نے سُن لیا۔ پھر اس کا، اس کے لشکر کا اس دنیا سے ایمان کے ساتھ جانا کہاں سے اور کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ایمان لا کر پاک و صاف ہو کر دنیا سے گیا ہوتا تو اس کا قرآن میں بار بار کئی جگہ اس طرح سے ذکر نہ آتا۔ ان الفاظ میں اس کو بیان نہ کیا جاتا۔ اگر اس کے کردار کو صرف اس کے زندگی کے واقعات ہی تک محدود رکھا جاتا تو وہ ایک بات بھی

تھی۔ بخلاف اس کے عاقبت میں اس کو بُرا ٹھہرایا۔ دوزخ کے لائق قرار دیا کوئی
سمجھدار جس کو عربی آتی ہو، ان اشاروں، ان ضمیروں یعنی اسماء و اشارات کو
جو اس آیت میں آئی ہیں صرف لشکر ہی سے مخصوص نہ کرے گا۔ کہ یہ دونوں
سے متعلق ہیں دونوں کا مذکور ہے اسی لحاظ سے کسی کا یہ کہنا کہ وہ فرعون سے
متعلق نہیں کوئی معقول بات نہیں کیونکہ وہ کسی مسلمان مومن صادق۔
خدا تعالیٰ پر ایمان لایا ہوا، ایماندار کا مانا ہوا نہیں۔ دنیا سے ایمان کے
ساتھ نہیں گیا۔ کہیں اس کی اس طرح سے تعریف نہیں کی گئی۔ اس کو کافروں
ہی میں شمار کیا گیا اور کیا جاتا ہے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اس کا خاتمہ اچھا
اور عاقبت بخیر ہوئی۔ خدا تعالیٰ بھی یہ خبر نہیں دیتا کہ ہمارا ایک بندہ
تھا جس نے ساری عمر کفر نافرمانی میں گزاری آخر میں ہمارے فضل نے اس
کی دستگیری کی، اس کا ہم نے ایسا حال کیا وہ سلامتی کے ساتھ آگیا۔ بخلاف
اس کے ہر جگہ اس کی مذمت کی گئی۔ خدا تعالیٰ اس پر ملامت کرتا ہے اس کو
برا بدترین فرماتا ہے۔ اسلام و ایمان کے عنوان کے تحت اس کا مذکورہ تک
نہیں ہوا۔ البتہ اس آیت میں کہ: حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ
اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ وَ اَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝
اس آیت کے مضمون و مطلب سے خود روشن ہو جاتا ہے کہ بات کیا ہے
طرزِ کلام کے ظاہر سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ظالم نے تمام عمر برائی،
بے تکے پن، بڑا پن جتانے، بڑائی ہانکنے میں گزاری۔ کفر کیا نافرمانی کی۔ موسیٰ
و ہارون علیہما السّلام اور ان کی قوم نے اس کے ہلاک ہونے عذاب میں
مبتلا کردئے جانے کی خدا سے درخواست کی۔ جب وہ اپنی زندگی سے
مایوس ہو گیا، عذاب الٰہی دیکھ پایا تو آخری وقت میں زبان سے بنی اسرائیل

کے خدا کو مانا۔ اسلام لانے کا اقرار کیا۔ اس آیت میں پیغمبر پر جو موسیٰ علیہ السلام تھے ایمان لانے کا ذکر ہی نہیں۔ بنی اسرائیل جس کو خدا مانتے تھے اس پر ایمان لایا۔ عذاب سامنے آنے کے بعد ڈر کر ایمان کا اقرار کیا ڈوبتے ہوئے کہا روایت کرتے ہیں کہ اس وقت اس کو یہ جواب ملا کہ اب ایمان کے ظاہر کرنے اسلام لانے سے کیا فائدہ کہ اختیار کی باگ تیرے ہاتھ سے نکل چکی ۔ کوئی علاج باقی نہ رہا۔ تیرا کفر و فساد کیا ہوا کدھر چلا گیا۔ تیرا بڑھا ہوا غرور گھمنڈ کیسے رفو چکر ہو گیا۔ آج تجھکو دنیا میں رسوا و بدنام کرتا ہوں۔ تیری لاش کو دریا کی تہہ سے باہر لاتا ہوں ۔ دنیا کے لوگوں کے لئے تماشہ اور تجھ کو دنیا والوں کے لئے عبرت کی وجہ بناتا ہوں۔ خدا اور اس کے رسول کے ساتھ غرور گھمنڈ تکبر کرنے کا بدلہ دنیا اور آخرت میں رسوائی و بدنامی ہے چنانچہ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (اللہ نے دنیا اور آخرت کے عذاب میں پکڑ لیا، اس میں عبرت ہے اس کے لئے جو ڈرتا ہے ۔ فرعون کی بیوی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صندوق سے برآمد کر کے فرعون کے سامنے لائے جانے کے بعد یہ کہنا قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ (مت قتل کر اس کو کہ یہ میری تیری آنکھ کا ٹھنڈک ہو) یہ صرف اس کا ظن و گمان تھا ۔ پروردگار کی حکمت اس میں یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام اس قرینہ و گمان کی وجہ سے ظالم کے ہاتھ سے چھٹکارا پا جائیں اس طرح ہلاک نہ ہونے پائیں جیسا کہ اور لڑکے ہوئے۔ آسیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ ایک حیلہ و چال تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو قتل سے بچا لیا جائے یا یہ ہو کہ حق تعالیٰ کے اطلاع دینے سے حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے ایسا کہا ہو اور ان کو بچا لیا ہو یا یہ ہو کہ موسیٰ

کے حال اور ان کے آئندہ پیش آنے والی خوبیوں کو فراست (تیزی فہم) قیافہ سے یا الہام سے انھوں نے پایا ہو. یا یہ کہ فرعون کے گھر والے انھیں اٹھالیں گے اس کا علم انھیں ملا ہو۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ فالتقطه اٰل فرعون لیکون لهم عدوًا وحزنًا (پس اٹھالیا اس کو فرعون کے گھر والوں نے جو سخت دشمن اور اس کی فکر میں تھے) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقتًا عداوت مراد تھی. کیونکہ یہی بات اور یہی صورت ان کے ساتھ پیش آئی۔ کوئی پیغمبر کسی مسلمان کا یا مسلمانوں کا دشمن نہیں ہوتا. اگر یہ کہیں کہ اس سے مقصود وہ عداوت ہے جو زندگی میں رکھتا تھا تو پھر یہ کہنا ہوگا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک کا ہونا بھی اسی حالت میں ہوا ہوگا۔ جو کچھ قرآن سے فہم میں آتا ہے وہ اسی قدر ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے فرعون کی مذمت، احادیث، اقوال صحابہ و تابعین و علما و مشائخ متقدمین و متاخرین کے کلام میں پائی جاتی مسلسل روایت میں آئی ہے وہ اپنے حال پر اپنی جگہ برقرار ہے۔ اگر قرآن کا مفہوم احادیث کے اشارے سلف کے آثار، اس کے ایمان، اسلام، حسن خاتمہ (اچھے انجام) پر ہوتے تو وہ ضرور مشہور و معروف اور عوام کو معلوم ہوتے۔ کفر و نافرمانی میں وہ ضرب المثل نہ ہوجاتا۔ روایت کی جاتی ہے کہ جب ابو جہل لعین جنگ بدر میں مارا گیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس امت کا فرعون مرگیا۔ اگر فرعون مومن، پاک صاف ہو کر دنیا سے جاتا تو ابوجہل لعین جو یقینی دوزخی کافر بدبختوں میں سے تھا جس کا خاتمہ کفر پہ ہوا، کافر مرا، برے انجام کو پہنچا اس کو فرعون کا لقب نہ دیا جاتا۔ اس کو فرعون نہ کہا جاتا۔ اس کے ساتھ اس کو تشبیہ نہ دیجاتی۔ اگر یہ کہیں کہ یہ مشابہ کرنا بلحاظ تکبر و برائی کے ہوا ہے جو جیتے جی

اس کی تھی تو ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعت کی زبان میں کسی کو توبہ کرنے اسلام و ایمان میں آجانے کے بعد اس کے پچھلے کفر و گناہوں سے جو وہ کیا کرتا تھا یاد نہیں کیا کرتے۔ اس طرح نہیں کہتے۔ کسی سے مشابہ نہیں کرتے۔ چنانچہ کئی بڑے بڑے قریش کے سردار جو زندگی بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت کیا کرتے کفر میں مگن رہا کرتے تھے جب آپ پر اور خدا پر ایمان لائے، مسلمان ہوئے دنیا سے گئے شرع میں کہیں ان کے پچھلے حالات کی بنا پر ان کی برائی مذمت مذکور نہ ہوئی نہ ذکر آیا۔ قرآن مجید میں فرعون کو اتنی کثرت سے جابجا بُرا کہا گیا برے ہونے کی مثال دی گئی ہے۔ عبرت لینے کا ذریعہ اس کی آخرت ہونے کا مذکور ہے۔

طریقت کے جس قدر مشائخ قدس اللہ سرہم گزرے ہیں ان میں سے کسی نے اس کی نسبت اسلام و ایمان سے نہ دی۔ سب کے سب اس کو کافر مرا کہتے ہیں، دوزخ کا کندہ فرماتے ہیں صرف شیخ محی الدین عربی رحمۃ اللہ علیہ ہی ایسے ہیں جنھوں نے اپنی کتاب فصوص میں فرعون کے متعلق ایمانِ یاس کی بحث کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ایمان یاس قابلِ قبول یعنی مقبول ہے مردود نہیں۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ متفقہ مسئلہ اور اجماع امت کے خلاف ہے انھوں نے فرعون سے ایمانِ یاس کی نفی کی ہے حقیقی بات یہی ہے کہ فرعون کا ڈوب جانے کی حالت کو سمجھ جانا ـ خوف کا اس پر طاری ہونا۔ اس عالم کا جس کو آخرت کہتے ہیں سامنے آجانا اس کی وجہ سے اس کا ایمان لانا۔ ایسا ایمان ہے کہ جس کا کوئی اعتبار نہیں وہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اور لوگ جو پانی میں ڈوب جاتے ہیں اُن ڈوبنے والوں کی یہ صورت نہیں ہوتی۔ بعض بچ جاتے ہیں بعض مر جاتے ہیں اس کو ڈوبنا ڈوبنے کو سمجھنا اس کا لاحق ہو جانا نہیں کہتے۔ قاموس

کا مصنف کہتا ہے کہ ادرکہ کے معنیٰ ہیں۔ لحقہ (ڈوبنے لگ گیا۔ ڈوبنے کی حالت میں آگیا ڈوبنے سے متصل ہو گیا) ہے بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ کلمہ اپنے دل میں کہا۔ ڈوبتے ہوئے کہا شیخ محی الدین ابن عربی رح نے اپنی ایک دوسری کتاب میں جس کا نام فتوحاتِ مکیہ ہے فرعون پر لعنت بھیجی ہے، اس کو سخت سست کہا ہے کافر اور کٹر کافر کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ دوزخ میں کئی درجہ ہیں ایک درجہ دوسرے سے بڑھکر سخت ہے اس میں انتہائی درجہ مغروروں، متکبّروں کے لئے ہے رب العزّت نے انتہائی سخت دردناک عذاب جو پیدا کیا ہے وہ ایسے کافروں کے لئے ہے جیسے کہ نمرود، فرعون اور ایسے ہی گروہ کے دوسرے لوگ۔ کتاب فصوص میں جو کچھ لکھا وہ اپنی سابقہ کتاب فتوحاتِ مکیہ کے خلاف لکھا ہے اس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ ان کا مقصود یہاں آیاتِ قرآنی ادرکہ الغرق کے احتمال کا بیان کرنا ہے۔ اسی کی یہ بحث اور جادہ (طریقہ) کی تحقیق منظور ہے۔ درحقیقت ان کا مذہب اور جادہ وہی ہے جو انھوں نے فتوحات میں لکھا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے جس اندازہ سے کہ ان کا مذہب و اعتقاد فرعون کے ایمان کے متعلق ہے وہ دوسروں کے دل میں کیسے جگہ پا سکتا ہے تمام علماء و مشائخ ان کے اس کہنے سے حیرت و تعجب میں ہیں۔ اور انتہا میں اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ ان کی انتہائی لاپروائی اور غفلت کا نمونہ ہے جن لوگوں نے ان کے قول کی توجیہہ اس کی تطبیق میں تاویلات کی ہیں انھوں نے "تکلف سے کام لیا ہے" بیکار دلائل لائے ہیں اہل علم حضرات ان کے قول کو اس ملت مذہب کے بالکل خلاف جانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا کہنا سچے عقیدہ اور صریح آیات سے ٹکرا رہا ہے ———

ان کا یہی مذہب جانتے ہیں یہ اعتقاد رکھتے ہوئے بھی چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ انبیاء علیہم السّلام کے سوائے کسی کو عصمت حاصل نہیں اگر کسی سے کہیں غلطی یا خطا ہوگئی ہے تو کوئی نقصان کی بات نہیں ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے دلائل کی پھیر میں بہہ جاتا ہے، اتنی سی بات کے لئے تکلف اور بات بنانے کی کیا ضرورت اور اس کے ثابت کرنے سے کیا فائدہ۔ جب کہ قرآن و حدیث میں جس کی کوئی سند اس کی تائید میں نہ ہو۔ ائمہ مذہب جو مقتدیانِ دین اہلِ علم کے مانے ہوئے ہیں جن کی اتباع اہلِ علم کرتے اور ان کا مذہب اختیار کئے ہوئے ہیں ان حضرات سے بھی تو اپنے اجتہاد میں غلطی ہوگئی ہے۔ اگر شیخ رحمتہ اللہ علیہ سے بھی کسی مسئلہ میں خطا ہوگئی تو یہ ان کے کمال کی منافی نہیں۔ اگر تقلید و اتباع ہی ہے تو اہلِ فتویٰ سے ہدایت رہبری پانا بہترین کام ہے۔ ایسا کرنا احتیاط سے قریب تر بھی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ وہ اہلِ کشف صاحبانِ یقین میں سے ہیں۔ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ اپنے کشف کے لحاظ سے کہا ہے اور اتنے حقائق، دقائق معارف و مواجید ان سے ظہور میں آئے ہیں ان سے خطا ہونے کا امکان ہی نہیں جو کچھ شیخ نے اس کتاب میں فرمایا ہے بغیر کسی تفاوت نقصان و زیادتی کے حضرتِ رسالت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ان تک پہنچا ہے تو یہ بات اور ہے۔ یہاں کسی کو دم مارنے کی جگہ نہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کلام کی حقیقت کیا ہے ان کے حقائق، احوال، مواجید وہ اپنی جگہ اپنے حال پر ہیں۔ یہاں گفتگو دلیل شرعی میں ہو رہی ہے۔ وہ کوئی ہو اتنا تو جانتا ہے کہ انسان بھول چوک خطا سے خالی نہیں عصمت انبیاء علیہم السّلام

کی خصوصیت خاصہ ہے ان کے سوائے کسی کو حاصل نہیں۔ یہ سن لو کہ شیخ فتوحات میں لکھتے ہیں کہ کوئی آیت ہمیشہ دوزخ میں عذاب ہونے کی نازل نہیں ہوئی۔ آگ میں پہنچنا ملتزم (لازم کرنے والا) عذاب نہیں حالانکہ اکثر جگہ قرآن میں یہ آیا ہے سورہ مائدہ میں ہے کہ فِی الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ ○ اور سورہ فرقان میں یُخَلِّدُ فِیْهِ مُهَانًا۔ اسم اشارہ لوٹتا ہے عذاب کی طرف۔ سورہ الٓم سجدہ میں وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ۔ سورہ زخرف میں اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ۔ اگر سب کچھ انھوں نے کشف کی بناء پر لکھا ہے تو پھر فتوحات میں فرعون کے کفر کو سخت ترین کفر کہنا کیا معنی رکھتا ہے واللہ اعلم۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بات کیا ہے۔

ہماری نصیحت یہ ہے کہ کفر و ایمان کے احکام میں معتقدات کے بڑے راستہ سے الگ نہ ہونا چاہیئے۔ ائمہ و مجتہدین کے تابع رہنا ضروری ہے۔ آداب واخلاق میں مشائخ کے تابع رہنا اور نیک گمان اور اعتقاد اس گروہ پر رکھنا لازمی ہے ان کے اقوال کی توجیہہ، تطبیق، علماء کے کلام سے اور مجتہدین کے اجتہاد سے کرنا چاہیئے۔ اللہ توفیق کا دینے والا اور وہی بہتری کا دل میں ڈالنے والا ہے۔

شیخ ابن حجر مکی رحمتہ اللہ نے کتاب دواجر میں ذکر کیا ہے کہ علماء امت، مجتہدین دین فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ○ کی آیت قرآنی سے فرعون کے کفر پر متفق یعنی ایک رائے ہیں اس اجماع کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ مسئلہ سبھوں کا متفقہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانا رسول پر ایمان لائے بغیر صحیح و معتبر نہیں۔ اس کو ایمان ہی نہیں

کہتے وہ ایمان ہی نہیں اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ فرعون اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا لیکن رسول یعنی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا ثبوت وجود و مذکور نہیں۔ ان آیات میں یہ ذکر تک نہیں آیا، یہ ذکر چھیڑا تک نہیں گیا۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ ایسا ایمان نفع نہیں دیتا مثلاً اگر کوئی کافر یہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں ہے۔ کوئی بندگی کے لائق اللہ کے سوائے ایمان لاتا ہوں جس پر مسلمان ایمان لائے ہیں تو وہ مومن یا مسلم نہیں ہوتا۔ جب تک وہ یہ نہ کہے کہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا پیغمبر مانتا ہوں سچا جانتا ہوں۔ اس کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار نہ کرے مسلم و مومن نہیں ہوتا۔ اگر یہ سوال اٹھائیں کہ وہ جادوگر جو فرعون نے بلائے تھے وہ بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے انھیں نہ پیغمبر مانا نہ اقرار کیا لیکن ان کا ایمان سب کا مقبول ہے۔ اور جن الفاظ میں وہ ایمان لائے وہ قبول ہوگیا اس کا جواب یہ ہے کہ۔ بات ایسی نہیں بلکہ انھوں نے یہ کہا کہ ہم ایمان لائے " ربّ العٰلمین ربّ موسیٰ و ہارون پر"۔ انھوں نے موسیٰ و ہارون علیہما السّلام پر ایمان لالیا۔ دونوں پیغمبروں کا نام لیا جس سے ان کی پیغمبری کا اقرار ہوگیا۔ انھوں نے بنی اسرائیل کا خدا نہیں کہا جو ایک جماعت تھی۔ سب پیغمبر نہ تھے چنانچہ فرعون نے کہا کہ اس خدا پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے۔ جادوگر موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھکر خدا پر ایمان لائے، معجزہ رسول پر ایمان لانا خدا پر اس کے رسول پر ایمان لانا ہے۔ وہ پورے طور سے موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السّلام پر ایمان لے آئے۔ ان کی رسالت کو مانا، بخلاف اس کے فرعون کے کہنے میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا نہ تو اشارہ ہے نہ صراحت صرف بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ السّلام کا ذکر تک نہیں۔ لہٰذا وہ موسیٰ علیہ السّلام سے

کفر کئے ہوئے اُن سے عداوت ۔ غرور۔ خود سری میں ہے ۔

اگر کوئی یہ کہے کہ بعض صوفیا سے منقول ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد بھی ایمان نفع دیتا ہے تو اس سے فرعون پر جو اجماع کے ساتھ کفر کا بے ایمان ہونے کا حکم لگایا گیا ہے وہ جائز نہ ہوگا کیونکہ اس کو کافر ٹھہرانے کی بنیاد یہی ہے ۔ جب وہاں خلاف ہے تو یہاں بھی ہوگا ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ قول صوفیائے مجتہدین کا ہونا ثابت ہو جائے تو ان کے کہے ہوئے کی تاویل ہو سکتی ہے اس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن ان کا قول اجماع کے خلاف نہیں ہو سکتا ۔ اگر یہ بات ہے تو عام آدمی کے لئے جس کو احساسِ موت نہ ہو یا وہ مرض الموت میں ہو یہ بات متعلق ہوگی ۔ یہ ہم پر لازم نہیں آتی کیونکہ ہماری گفتگو اجماع علماء و مشائخ کے متفقہ مسئلہ سے ہے ۔ فرعون کے کفر کے بارے میں گفتگو ہے ۔ صرف ایمان یاس ہی میں ہماری بحث نہیں بلکہ اور اعتبارات سے بھی ہے کہ جس سے یا جس کی بنا پر وہ کافر ثابت ہوتا ہے ۔ دوزخ اس کا گھر ہے ۔ کیونکہ وہ نہ تو خدا پر ایمان لایا نہ اس کے رسول پر جو موسیٰ علیہ السلام تھے ۔ اگر یہ کہیں کہ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے ایمان اضطراری کے قائل ہونے کے باعث فرعون کے ایمان میں گفتگو کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول ٹھیک اور قابل تسلیم نہیں ۔ انبیاء علیہم السلام کے سوائے کوئی خطا سے بچ نہیں سکتا ۔ عصمت ان ہی کے لئے مخصوص ہے قرآن کی صریح صاف آیات اور احادیث کی موجودگی میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں پائی جاتی ۔ اور نہ کی جا سکتی ہے ۔ آئمہ کے تفاسیر جو صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے روایتوں پر مبنی ہیں اور مجتہدین کے اقوال جو بلحاظ حدیث قرآن و اجماع کے ساتھ

ہیں بہت کافی ہیں۔ ہمارا مقصود ثابت اور واضح ہوگیا کہ نا امیدی خوف کی
حالت میں جو زندگی سے ہو۔ لایا ہوا ایمان صحیح ایمان نہیں ہوتا۔ بلکہ ایمان
ہی نہیں فرعون کا ایمان ثابت نہیں وہ کافر جیسا کافر مرا۔ کافروں کے جیسا
اس کو عذاب ہوگا۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ ایمان یاس صحیح
ہے پھر بھی فرعون کا ایمان اس میں نہیں آتا۔ وہ اس لئے کہ وہ موسیٰ وہارون
علیہما السلام پر ایمان نہیں لایا یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ کتاب زواجر
کا شرح نما ترجمہ ہے۔ اللہ ہی باطن کا بہتر اور اچھی طرح سے جاننے والا ہے۔
اور چھپے ہوئے راز سے خوب واقف و باخبر ہے۔ والصلوٰۃ والسلام
علی سید الرسل الصادق المصدق محمد وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔
(اسّیواں مکتوب)

مکتوب (۸۱)

اسبابِ خیر خوف رجا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

واما مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (جو کچھ لوگوں کو فائدہ
دیتی ہے وہ پھیلا دیتا ہے ٹھہرا رکھتا ہے۔ زمین میں) کی آیت اس طرف
اشارہ کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خلق کے وجود کو نفع پہنچانے والا، ان کے کام
آنے والا، ہمیشہ رہنے والا ہے اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے دلوں کی توجہ کا
ان کے وقت کا کہ وہ اس کے لطف کے مظاہر (جائے ظہور) ہیں، کارساز
و نگہبان ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر چیز کے لئے کسی نہ کسی سبب کی ضرورت

ہے اللہ تعالیٰ سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی وہ ہے کہ جس نے نیکی اور احسان کو ایسا سبب بنایا کہ وہ ہمیشہ اور دیرپا رہے جنھیں وہ سیدھے راستے سے لے جانا چاہتا ہے انھیں اچھے کردار عطا فرماتا ہے وہ دو جہاں میں نیک اور نیکی پر رہتے ہیں۔ وہ نیک صفات اچھی خوبیاں پسندیدہ عادات اطوار نیک کرداری میں ایک دوسرے سے بڑھکر ہوتے ہیں۔ اپنی روش میں اپنے ساتھ چلنے والوں سے تیز، زیادہ تیز چلنے والے بارگاہِ عالی کی عنایت خاص سے مخصوص ہونے سے منزلِ مقصود کو جلد پہنچ جاتے ہیں ہمیں اس کا پورا تجربہ ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوتا عقل بھی یہی دلیل وسند پیش کرتی ہے۔ اس کی حجت بھی یہی ہے کہ نیکی و بدی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جو نیکی کیا کرتا ہے وہ بدی کی صورت نہیں دیکھتا۔ کسی کا مقولہ ہے کہ اگر ایمان وطاعت کی راہ میں ایک دم کا بھی نقصان کیا تو میں کافر ہوں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے اس پر بھی غور کرلو کہ نیک کام کرنے والے سے اگر کبھی اتفاقاً بُرا کام ہوجائے تو نیکی کی نورانیت (روشنی) میں بدی کی ظلمت (اندھیرا) گم ہوجاتی ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بدی کے سیلاب کا صدمہ نیکی کی عمارت کو ڈھا دیتا ہے۔ یہ صرف اس کا کرم ہے اس کو عقل سے نہیں پا سکتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ یہ میرا امتیازی نشان ہے۔ یاد رکھو کہ ساری نیکیوں کی جڑ بنیاد کا نام ایمان ہے نعوذ باللہ اگر یہ جاتا رہے تو کسی نیکی کا نام ونشان تک نہیں رہتا۔ اور وہ شخص جس میں ایمان نہ ہو وہ ایسا جسم ہے جس میں جان نہیں ایسی صورت ہے جس میں معنی نہیں۔ ایمان کے بغیر کوئی عمل کوئی کردار کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا۔ نتیجہ نہیں لاتا۔ کارآمد نہیں ہوتا۔ پروان نہیں

پڑھتا۔ اس لئے خصوصیت سے نیکوں کی نیکی پر نظر جمائے رہنا ضروری ہے کہ یہی اصل چیز، جڑ، بنیاد ہے۔ جو کچھ ہے وہ ایمان ہی ہے جس درخت کی جڑ پیڑ نہ ہو وہ کیا پھل پھول لائے۔ سچ ہے۔ کوئی نیکی ایمان کے بغیر کوئی وزن وقیمت نہیں رکھتی۔ نیکی میں شمار ہی نہیں ہوتی۔ جس کسی میں ایمان ہو اس سے کتنا ہی بڑا گناہ سرزد ہو جائے معافی کی اُمید ہے۔
مسلمانوں کے معتقدات میں بھی اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ کہ ایمان عمل کے بغیر بھی موجود رہتا ہے۔ لیکن کمی ونقصان کے ساتھ۔ اگر کسی چیز میں کمی ونقصان آجائے تو یہ اس کو اس کی حقیقت سے جدا نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل کا نہ ہونا ایمان کے کمال کا جو درجہ ہے اس سے نیچے اتار کر اور نیچے پہنچا دیتا ہے۔ ایمان حقیقتاً دل سے الوہیت ورسالت کی تصدیق کرنا خدا تعالیٰ کو ایک لائق بندگی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جاننا ماننا ہے اس کے سوا جو کچھ ہیں وہ سب اسی کے آثار، وثمرات ونتائج ہیں۔ اگر یہ نسبت حقیقی طور سے حاصل ہو تو دل کے حوالی (آس پاس) میں گناہ کا خیال تک نہیں آسکتا ہے۔ اگر وہ دل کے اطراف ہی گھومے تو جلد لوٹ جاتا ہے۔
جس کسی کے دل میں ایمان کی حقیقت ایک دفعہ سما جاتی ہے تو حقیقی ایمان کی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقت دل سے باہر جا نہیں سکتی۔ جو پلٹ جاتا ہے وہ دروازے کے باہر ہی سے پلٹ جاتا ہے۔ جو فانی ہو گیا۔ اس پر مرمٹ گیا وہ اپنے اوصاف کی طرف نہیں لوٹتا۔ یہ صوفیا قدس اللہ اسرارہم کا قول ہے۔ وہ اس رنگ کے ہوتے اور اسی میں رہتے ہیں۔
ان میں ایمانِ اصلی ہوتا ہے۔ عارضی نہیں ہوتا۔ اگر کسی کے گناہ سوپہاڑوں کے برابر بھی ہوں تو خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

رکھنے کے طفیل میں وہ مچھر کے پَر کے برابر بھی وزن وقیمت نہیں رکھتے۔ جب تک یہ نسبت درست نہ ہو جائے ہر چیز ہر بات مشکل ہے۔جب یہ درست ہو جاتی ہے تو کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ ایمان کا غم کھاتے رہنا ضروری ہے۔حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ رونے چلانے گڑگڑانے میں ساری رات گذارا کرتے۔ آہیں کیا کرتے۔ آپ سے کہا گیا کہ خوش رہا کرو کہ کسی گناہ کا بار کسی بدی کا بوجھ تمہاری گردن پر نہیں تو اس کا انھوں نے یہ جواب دیا کہ اگر پہاڑ برابر گناہ بھی ہوں تو وہ میرے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر نہیں۔ میرا رونا یہ ہے کہ میں ایمان کو سلامت لے جاتا ہوں یا نہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

ایمان چو سلامت بر لب بریم   احسنت برین چستی و چالاکیٔ ما

(قبر کے اندر جانے تک ایمان اگر سلامت لیجائیں تو یہ انتہائی تعریف ہمارے چستی وچالاکی کی ہوگی۔)

سچ ہے کہ رحمت کی ہوائیں امید کی خوشگوار لہریں دل کی کلی کھلا دیتی اُمید کے پھول کو تازہ رکھتی ہیں۔ ایمان کے دَو پر ہیں ایک پر اُمید کا دوسرا پر خوف کا۔ گرم ہوا کے اثر سے درخت کُملایا مُرجھایا ہی نہیں جاتا بلکہ خشک بھی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جِلاتا مارتا۔ عزّت و ذلّت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفات جو ایک دوسرے کی ضد ہیں انہی میں سے یہ دُو صفات بھی ہیں۔ جو بندہ کو ایک حال سے دوسرے حال میں لے آتے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں اس بات کے خلاصہ اور معنی کو کسی نے خوب ادا کیا ہے " وہ کبھی مجھکو لطف سے نوازتا اور کبھی ناز سے مار ڈالتا ہے وہ شوخ مجھ کو زندہ کرتا پھر مار ڈالتا ہے "

ایمان کا راستہ امید اور بیم کے درمیان، آس اور خوف دونوں کے بیچوں بیچ ہے۔ اس راستہ کو اسی طرح رکھا گیا ہے۔ بعضے امید کو ترجیح دیتے مقدم رکھتے ہیں کہ یہ محبت و انس کا دلی جذبہ۔ رحمت کی دلیل و حجت ہے۔ بعض اس کے خلاف ہیں وہ خوف کو اہمیت دیتے اور کہتے ہیں کہ خوف کے کوڑے سے سالک سہما ہوا رہتا اور تیز چلتا ہے کام زیادہ کرتا جاتا ہے ان کا کہنا ہے کہ جب تک زندہ رہیں خوف کا اور جب موت آجائے تو امید کا غلبہ ہونا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ نیک بختی اور سعادت مندی خوش نصیبی کی علامت یہ ہے کہ دونوں بھی رہیں تاکہ کام انتہائی خوبی کے ساتھ پورا ہو جائے کسی نے خوب کہا کہ وہ حضرات جو درگاہ تکریم کے خاص مرتبہ والے ہیں اس مرتبہ میں ہوتے ہوئے بھی عالم تسلیم سے دہشت زدہ ہیں نا امید نہ ہو کہ حق تعالیٰ کی رحمت عام ہے اور مغرور نہ ہو جا کہ خاص حضرات بھی خوف میں ہیں"

خدا تعالیٰ عاقبت بخیر کرے۔ دنیا اور آخرت میں عافیت سے نصیبہ پانے سے محروم نہ رکھے۔ ساری نعمتوں کی جڑ بنیاد عافیت ہی ہے عافیت عرفِ عام میں (عام طور سے) صحت و تندرستی کو کہتے ہیں جس میں تمام عافتوں سے سلامتی در ہائی ہے۔ چاہے اس دنیا میں ہو یا اس دنیا میں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سے عافیت کا مانگنے والا اللہ کو بہت پیارا ہے۔ سب سے بہترین محبوب ترین چیز جو درگاہِ حق تعالیٰ سبحانہٗ سے ہم طلب کرتے ہیں وہ عافیت ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سے فرمایا کہ چچا خدا تعالیٰ سے عافیت

مانگا کرو کہ یہ بہترین چیز ہے۔ کیونکہ سب میں جو بہترین چیز ہوتی ہے وہی اس سے مانگا کرتے ہیں۔ یہ بیان مشائخ کے وظائف میں موجود ہے۔ جس کو سب جانتے ہیں۔ اگر اس پر مداومت ہاتھ آجاوے تو یہ بہترین دعا ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ العفو والعافیۃ والمعافات الدائمۃ فی الدنیا والاٰخرۃ (اے میرے پروردگار میں مانگتا ہوں تجھ سے معافی اور عافیت اور بخشائش ہمیشہ کے لئے دنیا میں اور آخرت میں) گفتگو اور تحریر کا مقصد کچھ اور تھا قلم کہیں اور لے آیا میں اپنی قلم کی سرتابی سے رنجیدہ ہوں کہ وہ سیدھا چلنا نہیں چاہتا۔ جوش میں آئے بغیر نہیں رہتا مگر برا نہیں چلتا۔ مقصود دعا تھی اور آپ کے وجود کے لئے آپ کی صحت وسلامتی کا شکرانہ ادا کرنا تھا کہ آپ نے صحت وسلامتی پائی اور کمزوری کے عارضہ سے جو آپ کے لطیف عنصر پر تھا۔ اللہ کے فضل، فقیروں کے نصیب اور درویشوں کی دعا سے محبّوں (دوستوں) کی توجہ سے وحشت کا غبار چہرے سے صاف ہو گیا آپ کا وجود شریف بہت غنیمت ہے۔ آپ کی ذات کی بقا محض حکمت اور عین مصلحت ہے۔ جہان کے پیدا کرنے والے کا محض لطف ہے کہ وہ اپنی مصلحت عام کو کسی بندہ کے لئے خاص کر دیتا ہے، سارے کمالات ان ہی دو کلمات میں منحصر ہیں اللہ کے حکم کی تعظیم کرنا۔ اللہ کی مخلوق پر شفقت کرنا۔ اے اللہ اس کو اور زیادہ کر کم نہ کر۔ عافیت بخیر ہو۔

(چوبیسواں مکتوب)

مکتوب (۱۹)

قال، حال، قلم کے نتائج

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

آدمی کی تین بولیاں ہیں۔ حال۔ قال۔ قلم اِن سے جو کچھ۔ کہتا ہے۔ وہی کہا جاتا اور لکھا جاتا ہے یہ رَسم و عادت: تکلف و بناوٹ سے متعلق یا اس سے ملا ہوا نہیں ہوتا بلکہ دل میں جو کچھ چھُپا ہوا ہے اس کا وجہ ثبوت اُس کے کھل جانے کا حکم رکھتا ہے۔ اِن میں بعض نازک، پوشیدہ احوال ایسے بھی ہوتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے اس لئے عام طور سے وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ اس سے یہ بالکل الگ ہیں لیکن باوجود اس کے اعتبار عقلی سے ساقط نہیں۔ عقل میں ایک مقام و قرینہ رکھتے ہیں۔

قال یعنی جو کچھ کہنے میں آتا ہے جس کو سب لوگ زبان سے کہنا کہا کرتے ہیں، جس میں الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ زبان، دل اور ضمیر کی ترجمان ہے خیالات اور دلی جذبات کا اظہار ہوتا وہ بیان میں آتے ہیں، دل کی کتاب کا عنوان ہونے کے علاوہ آدمی جو کچھ کہتا، بیان کرتا یا دکھلاتا ہے وہ اسی سے کہتا، بیان کرتا، اور دکھلاتا ہے، یہ سب جو کچھ دل میں ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ عالم انفس (ذات، حقیقت) سے جو کچھ کہ دل کے ملکوت (عالم ارواح) پر آتا ہے وہ حق ہے ثابت ہے بلکہ یہ حقیقت میں واجب الوجود قدیم کی صفت حقانیت کا سایہ و پرتو ہے اگر کوئی اس کو سچائی سے الفاظ، عبارت، بیان

میں لائے تو وہ سچا ہے۔ اگر نفس کی ملمع کاری خنّاس کے وسوسہ اور وہم کی صورتیں بنانے سے جو عالم انفس کا شیطان ہے۔ اگر کوئی جھوٹی چیز اس سے امتزاج (ملاوٹ) پا جاوے یا مل جائے اس کو الفاظ و عبارت و بیان میں لائے تو وہ جھوٹا ہے۔ جو بھی صورت علم میں سمائی یا ذہن میں اُتری ہوئی دل کے اندر بیٹھی ہوئی ہوتی ہے عموماً وہی زبان کے ذریعہ سے باہر آجاتی ہے۔ صورت کے تصور کے بغیر وہ کسی عبارت میں اس لئے نہیں آتی یہ دل کے اندرونی خلوت ہے۔ لیکن اس کا راز نہیں۔ یہ بیرونی ادنیٰ خیالات کی ایک حکایت ہے جو زبان پر آتی اور ادا ہو جاتی ہے۔

حضرت باری تعالیٰ سُبحانہٗ و تعالیٰ کا علم حق ہے اس کے علم کی لوح (جاننے کی تختی) تغیر و تحریف سے محفوظ ہے عالم ملکوت میں نورانیات و روحانیات جسمانی غلاف، پردہ سے پاک و منزّہ ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے نور کی معنوی محاذت و مقابلت (آمنے سامنے) سے منوّر و روشن ہیں۔

آدمی تو روح نفس کے اجتماع (جمع ہونے) نور و ظلمت کے امتزاج (مل جانے ایک ہو جانے) کشف و حجاب (کھلنا بند ہونا) تجلی و استتار (دکھنے چھپنے) کی پھیر میں گرفتار ہونے کے باوجود بھی اپنی اصلی فطرت و روحانیت پر اچھی طرح سے سلامت بھی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ نفس کی ہمنشینی شیطان کی جعلسازی دھوکہ بازی اس کی فطرت کے کارخانہ میں خلل کا سبب بنی ہوئی ہے۔ من یکن الشیطٰن لہ قرینا فساء قرینا (جس کا دوست شیطان ہو گیا وہ بُرا ساتھی ہے) کی آیت کریمہ اور فابواہ یھودانہ ینصرانہ (ان کے ماں باپ اس کو یہودی نصرانی بنا دیتے ہیں) کی حدیث شریف اسی بارے میں ہے قلم کی بے تکی روانی۔ زبان کی افتراپردازی سے

اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں لے لے۔ اگرچہ قلم کی حرکت رکھنے والے کے اختیار میں ہے لیکن وہ اس کے ہاتھ سے اختیار لے لیتا ہے جھوٹ سچ کا جیسا اور سچ جھوٹ کا جیسا کر دے کر ایک دوسرے کی بھیر میں ڈال دیتا ہے۔ اور جو چاہے لکھ دیتا ہے۔ اس کا یہ کاروبار بھی دل ہی کی طرف راجع اور مائل ہے۔ بظاہر اگرچہ اس کی حرکت فطری جمادی ہے۔ لیکن بصیرت کی آنکھوں میں یہ حرکت شوقِ ارادی سے زیادہ قوی ہے۔ نورِ علم ہی ہے جو دل کے ارادہ کی حرکت اپنے جاری اور رواں ہونے کے مقامات یعنی اعصاب و عضلات کے ذریعہ زبان پر آکر بول اٹھتا اور زبان قلم سے ظہور کرتا یعنی تحریر میں آجاتا ہے جو کہا گیا ہے وہ یہی بات ہے کہ قلم سے جو کچھ نکل جاتا ہے وہ ایک آزمائش ہے یعنی اس کی بولی بڑی آفت سخت فتنہ ہے۔ پناہ مانگتا ہوں اللہ سے اس کے فتنوں اور اس کی آفتوں سے۔

یہ واردات یہ ساری باتیں کس تقریب سے زبان پر آئیں اور کس تمہید سے بیان ہوئے، اس کا مقصود کیا تھا، یہ سب کچھ قلم ہی کے سر اٹھانے بے لگام ہو جانے کی علامت و نشانی اور اس کے جوش جنون کا مظاہرہ ہے۔ ظاہر مقصود یہی معلوم ہوتا ہے کہ عریضہ کے پہنچنے میں جو قصور رہ گیا۔ اس کا عذر پیش اور معذوری ظاہر کرے۔ ایسے امور میں مشکل ترین صورت و سخت ترین حالت جو لکھنے والے پر ہوتی ہے۔ لکھنے میں اپنا مفہوم مقصود حروف و الفاظ وجملوں میں لانے میں جو دقت ہوتی ہے وہ ایک پسندیدہ مخصوص حالت ضرور ہے۔ خطوط کا لکھنا خصوصاً جب کہ جس کو خط لکھا جا رہا ہے اگر وہ انتہائی بلند درجہ کا ہو۔ لکھنے والا غیر مشہور ناواقف گمنامی خواری میں پڑا ہوا ہو تو لکھنے میں جو حیرانی پریشانی اس کو ہوتی ہے اس سے زیادہ حیران

و پریشان اس کا قلم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تعریف کے مراسم کی حد شوق و محبت کا بیان، اعتدال کے ساتھ درمیانی مرتبہ میں ٹھہرے ہوئے احتیاط کے دائرہ میں حقیقت سے باہر نہ ہونا، انتہائی مشکل و دشوار بات ہے۔ مبالغہ اختیار کرکے تعریف نہ کرے تو ایسا خط عام مروجہ عادت و رسم کے خلاف سمجھا جاتا ہے اگر مبالغہ کرنا چاہئے تو دین کی بزرگی یقین کے اعتبار کا دباؤ جاتا رہتا ہے۔ کاش دنیا میں یہ رسم و عادت جاری نہ ہوتی۔ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جن کے حضور میں یہ عریضہ جا رہا ہے ان کی نظر محبت، جذبہ قبول، کسی تعریف کرنے والے کی تعریف اور توصیف پر نہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ ذاتی حسن و خوبی کے فطرتی کرم، لازمہ اصالت، جوہر صفات کی وجہ سے مدح و ثنا کے تکلّف سے مطلقاً لا پرواہ ہیں۔ خصوصاً درویشوں کے گروہ سے جن سے زبانِ حال، زبان قال سے دعا کے سوائے کسی اور بات کی طلب نہیں۔ ان سے کسی رابطۂ خدمت و ثنا گستری بالکل منظور نہیں ہاں یہی کہ دعا مطلوب و منظور رہے یہی وجہ ہے کہ غائب حاضر سے زیادہ نظر قبول و عنایت میں محفوظ ہے مدعائے کلام میں دعا کا ذکر آ گیا اسی تقریب سے یہ مضمون بھی آ گیا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعا اس کے آداب میں گفتگو آ جائے تو مناسب ہے سُنیئے۔ سب سے بہتر اور جامع دعا جس میں سب دعائیں شامل ہیں جو ساری دعاؤں کا خلاصہ ہے وہ قرآن شریف میں آئی ہے جس کے کرنے کی انتہائی ترغیب دی گئی ہے اس کے سوا دوسری جس قدر دعائیں ہیں وہ سب اسی میں شامل اسی طرف راجع ہیں۔ وہ دعا یہ ہے۔ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (اے

ہمارے پروردگار عطا کر ہم کو دنیا میں نیکی ۔ آخرت میں بہتری بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے) انتہائی خوبی و کمال، انتہائی مقام تک عروج، چاہے وہ روحانی ہو یا دنیاوی اور وہ سارے لذات و شہوات جسمانی جو تصور میں آسکتے ہیں یا آئیں وہ سب اس آیتِ کریمہ دعا عالیہ میں موجود ہیں طالب اگر حضور وقت میں عاجزی و خوشامد سے بھلائی، خوبی جو کچھ بھی طلب کیا کرتا ہے، امید کو لئے ہوئے اس کے کرم پر نظر لگائے رکھتا ہے مانگنے میں روتا پلاتا ہے ایسا کرنے میں اس کام میں جو لذت ملتی ہے وہ دعا کرنے والا ہی جانتا ہے۔ دنیا کے حسنات (بہتریاں) وہی ہیں جو آخرت کا وسیلہ او رضا قبت کے کام بننے کا ذریعہ وسبب ہو جائیں۔ اس کے سوائے جو ہیں وہ حسنات میں داخل نہیں۔ سب دعاؤں کا خلاصہ نہایت مختصر استدعا ہے اس سے بہتر و خوب تر۔ ساری عافیتوں بہتریوں حسنات کے طلب کرنے مانگنے کی کوئی اور ایسی دعا نہیں۔ فرض کرو اگر دنیا کی زندگی میں کوئی دشواری، سختی پیش آجائے یا کوئی مکروہ ناپسندیدہ چیز سامنے آجائے جس کا نتیجہ اچھا جس کی عاقبت بخیر ہو جائے تو سب کچھ اس کے لئے آسان ہے۔ اس کا کام بن جانا۔ ہر مقصود کا مقصود۔ ہر خلاصہ کا خلاصہ ہے اس راستہ کے چلنے والے کا مطلوب یہ ہوتا ہے کہ تجھ کو تجھ سے چاہتا ہوں کہ تو ہر مدعا کی انتہا، ہر مقصود کی حقیقت ہے مطلوب حقیقی تو ہے۔ یہ مقام تجرید اور ایسا بلند مقام ہے کہ کھڑے ہونے کے تصور ہی سے کپکپی سی ہونے لگتی ہے۔ لیکن وہ صاحبان ہمت جن کی فطرت سلیمہ، محبت کے جذبات، ہوا و ہوس کے لوث سے پاک ہوتے ہیں یہ انہی کا کام ہے اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا (اے ہمارے اللہ یہ روزی کر ہم کو)

عمل کا دائرہ تنگ ہونے سے اس کی تلافی، دعا استغفار، طلب خیر و سلامتی سے کرنا ضروری ہے، وہ غفور و رحیم دنیا و آخرت کے تمام حسنات و عاقبت کے تمام لطائف حسن و عاقبت سے سرفراز کرنے والا ہے۔ وہ اپنی طلب سے، اپنی رضا و محبت سے نزدیک ہے خدا آپ کو یہ وقت نصیب کرے۔ خطوط لکھنے کا طریقہ اور رسم یہ ہوا کرتی ہے کہ دعا کے بعد اپنا حال لکھا جاتا ہے آپ کے خط میں ایسی کوئی بات کہنے اور لکھنے کی نہیں پائی گئی بجز حسرت و ندامت اور عمر اور اس کی حکایت اور منزل مقصود سے دور رہنے کے اور کچھ نہیں ہے یہ کہے بغیر رہا بھی نہیں جاتا کہ ایک زمانے میں ہمت کی رفاقت، توفیق کی مدد سے ہاتھ پاؤں مار کر سفر کیا۔ زندگی سے لذت، عمر بھر کا ایک فائدہ آپ کے پاس سے پایا۔ چونکہ جوانی تھی، توفیق رفیق تھی، شوق کا توشہ ساتھ تھا اس لئے شوق میں گیا، ذوق میں رہا بسلامتی میں پہنچ کر اس کے سامنے ان کی حضوری میں بیٹھ گیا۔ اب دیکھ رہا ہوں کہ وہی سودا غلبہ کر رہا ہے۔ اور انہی مقامات (مکہ و مدینہ) کی محبت جوش میں آ رہی ہے۔ اے دونوں عالم کے رب میری مدد کر۔ نزدیکی کے مقام میں پہنچا دے کوئی وقت ایسا نہیں کہ یہ خیال نہ آتا ہو، کبھی اس خیال سے خالی نہیں ہوں معلوم نہیں کہ پردۂ غیب اور ارادہ ازلی میں کیا ہے۔ پہلی مرتبہ تدبیر و مصلحت کی قید، نتیجہ سوچنے کے وصلہ (وقفہ مرتبہ) سے نکل آیا۔ ارادہ کی وجہ، ٹھہرنے کا سبب، دماغ و خیال میں نہ آیا۔ اب جو کچھ خیال میں آتا ہے تو وہ محبت و خواہش اپنے وقت کا ٹھیک کرنا ہے سوچ میں جو کچھ سوچتا ہوں وہ یہی ہے کہ اپنا وقت ٹھیک ہو جائے۔ مصلحت اسی میں سمجھتا ہے کہ عمر کا باقی

حصہ اس آستانہ کی خدمت میں گذر جائے تاکہ اس ملک کی پریشانی اور اس زمانے کے لوگوں کی لاپرواہی اور انجان پن سے نکل جائے۔ اس آستانہ پر دل کے سکون اور محبت کے مقام میں جگہ پائے کیسی اچھی میری قسمت اور کیسا اچھا میرا وقت ہوگا جب کہ اس خوش نصیبی کے لئے شوق اپنے کام میں لگ جائے تاکہ کسی تدبیر و مشورہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ جو روک ہے وہ یہی ہے۔ اگر سفر کے لئے نکلنا ٹھہر گیا تو میرے لئے آپ کی مجلس عالی میں حاضر ہونا لازم ہوگا۔ آپ کے پاس سفر کرکے حاضر ہونے کو میں نے خدا کے سپرد کردیا ہے۔ زیادہ لکھنا مقامِ ادب سے دور ہے خلافِ ادب ہے والسّلام۔ (پچیسواں مکتوب)

مکتوب (۲۰)

حضرت نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا مکتوب مبارک جو آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو تعزیت فرزند میں تحریر کرایا تھا۔

اللہ و رسولہٗ

بِسۡمِ اللہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ (شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور بخشنے والا ہے۔

من محمّد رسول اللہ الی معاذ بن جبل۔ (محمد رسول اللہ کی طرف سے معاذ بن جبل کو)۔

سَلَامٌ علیک (سلامتی و امن ہو تم پر ساری آفتوں تکلیفوں

اور نقصانوں سے خصوصاً بے صبری، بیقراری رونے پلانے آہ واہ کرنے سے مصیبت میں۔)

فانی احمد الیک اللہ الذی لا الہ الا ھو (میں حمد وثنا تعریف وتوصیف خدا تعالیٰ کی کرتا ہوں کہ وہ اللہ ایسا ہے کہ اس کے سوائے کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ یہ تمہارے پاس بھجوا رہا اور تم تک پہنچا رہا ہوں)

امابعد فاعظم اللہ لک الاجر۔ (خدا تعالیٰ کی حمد کے بعد تیرے لئے دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تجھ کو بزرگ بنا دے اور اس مصیبت کے بدلے میں تجھکو بدلہ وثواب عطا فرمائے۔ یعنی تجھکو صبر دے بندے کیلئے مصیبت پر اور تقدیر سے آئی ہوئی باتوں پر صبر کرنا ضروری ہے صبر کرنے سے اجر وثواب ملتا ہے اگر صبر (برداشت) نہ کرے تو عذاب وعقاب کا مستحق ہو جاتا ہے)

والھمک الصبر۔ (خدا تعالیٰ تمہیں صبر دے تمہارے دل میں صبر ڈال دے)

ورزقنا وایاک الشکر (نصیب کرے ہم کو اور تم کو اس نعمتوں کا شکر۔ شکر کو ہمارا رزق روزینہ کر دے)

فان انفسنا واموالنا واھلینا من مواھب اللہ عزوجل ھنیۃ (ہماری جانیں ہماری ذاتیں ہمارے بال بچے گھر والے سب اللہ ہی کے دئے ہوئے عطا کئے ہوئے ہیں ہمارے لئے گوارا تر، پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔)

وعواریۃ المستودعۃ۔ (اس کی عاریتی دی ہوئی امانتیں ہیں یعنی چند روز کے لئے دی ہوئی اس کی امانتیں ہیں۔ جو اس نے ہمارے

لئے رکھ چھوڑی ہیں یعنی یہ جو نعمتیں اس نے ہمیں دی ہیں اس کو ہماری ملک نہیں بنایا۔ بلکہ عاریتاً دی ہیں چند روز برتنے کے لئے بطور امانت ہمارے پاس رکھی ہیں۔ سب کچھ اسی کی ملک ہے وہی جائیداد کا مالک ہے جب چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ مال و دولت بال بچے سب کچھ اس کی ودیعت ہے ایک نہ ایک دن ضرور واپس لے لیتا ہے۔)

تمتع بها الیٰ اجل معدود۔ (ہمیں فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔ برت لینے دیتا ہے۔ ان نعمتوں کو ایک وعدہ تک دی ہوئی مقرر کی ہوئی معین مدت تک چند روزہ اس وقت تک کے لئے کہ اس کا حکم آجائے یا جب تک کہ اس کا ارادہ ہو۔

یقبضها لوقت معلوم۔ (جس وقت چاہتا ہے قبضہ میں کرلیتا ہے وقت مقررہ پر اپنے قبضہ میں کرلیتا ہے)

ثُمَّ اَفْرض علینا الشکر اِذَا اعطیٰ۔ (پھر ہم پر اس نے فرض کردیا ہے نعمت کے شکر کا ادا کرنا۔ جب کہ وہ نعمت عطا کرے)

والصبر اذا ابتلیٰ۔ (فرض کردیا ہم پر جب وہ دُکھ دے ہوئے کرکے کسی بلا میں مبتلا کردے کسی آزمائش و امتحان میں ڈال دے آدمی کے احوال و اوقات چار ہی قسم کے ہیں۔ نعمت¹ - بلا² - طاعت³ - معصیت⁴ نعمت¹ میں شکر۔ بلا² میں صبر۔ طاعت³ میں توفیق پر نظر۔ معصیت و گناہ میں توبہ۔

فکان ابنك من مواهب الهنیة وعواریة المستودعة (تمہارا لڑکا۔ خدا کی بہترین بخشش و عطا تھی جو تمہیں عاریتاً ملی۔ اور بطور امانت تمہارے پاس رکھی گئی تھی۔)

متعك غبطة وسرورًا (فائدہ مند اور سود مند کیا تھا مجھ کو اس سے خوبی اور خوش حالی کے ساتھ، جس پر لوگ رشک کرتے تھے)

یقبضه باجر کثیر (لے لیا مجھ سے بے انتہا اجر کے بدلے میں بعض نسخوں میں اجر کبیر ہے۔ بہت بڑے اجر کے بدلے میں۔ یعنی اگرچہ واپس لے لیا۔ مگر بہت بڑے معاوضہ کے ساتھ۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا بدلہ بہت ہی بڑا ہے۔ محسوسات ومعقولات میں نہیں آسکتا۔ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی کا بچہ خدا تعالیٰ لے لیتا ہے۔ جو اس کے جگر کا ٹکڑا ہوتا ہے اور وہ مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے لئے ایک گھر بنائیں جس کا نام صبر کرنے والے کا گھر ہو)

الصلوٰۃ والرحمة والهدىٰ ان صبرت (درود سلام رحمت، حق تعالیٰ کی اور اس کی ہدایت ہے تمہارے لئے اگر خدا کے اجر وثواب پر نظر رکھکر صبر کریں یہ اشارہ ہے اس آیت کریمہ کی طرف کہ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ٥ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خوشخبری دے دیجئے صبر کرنے والے لوگوں کو جب پہنچے ان کو کوئی مصیبت تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے لئے اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں یہ وہ ہیں جن پر اللہ کا درود وسلام اس کی رحمت ہوتی ہے اور یہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ پائے ہوئے ہدایت پر ہیں۔

فاصبروا لا یحبط جزعك اجرك (صبر کر۔ ایسا نہ ہو کہ تیری بے صبری ثواب کو ملیامیٹ کردے ملنے والا اجر حبط (باطل

ونابود) ہو جائے۔

فتندم - (تو پشیمان نہ ہو جائے ندامت میں نہ آجائے) آخرت میں شرمندہ نہ ہو کہ کیوں صبر نہ کیا، ثواب، بدلہ، معاوضہ کو ہاتھ سے کھو دیا

واعلم ان الجزع لا یرد شیئا۔ (سمجھ لو کہ بے صبری کسی چیز کو دفع نہیں کرتی لوٹا نہیں لاتی) یعنی مصیبت کو دور نہیں کرتی۔ کسی گئی ہوئی چیز کو واپس نہیں لاتی۔)

ولا یدفع حزنا۔ (رنج وغم کو دور اور دفع نہیں کرتی بلکہ اس میں زیادتی کر دیتی ہے۔ اس سے رنج وغم میں زیادتی ہو جاتی ہے۔

ما ھو نازل فکان قد۔ (جو چیز اترنے والی ہے بلاؤں حادثوں میں سے وہ ضرور اترے گی سامنے آئے گی یعنی جو جا چکا وہ واپس نہیں آتا اتنا تو کر ثواب و بدلہ کو جانے نہ دے۔

وَاصْبِرْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (صبر کر۔ اللہ ضائع نہیں کرتا نیکی کرنے والوں کا بدلہ۔)

(انسٹھواں مکتوب)

مکتوب (۶۱)

سید الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف توجہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اے ہمارے پروردگار۔ تو نے ہم کو جو نعمت دی اس کو اور زیادہ کر۔ جیسا کہ زیادہ کیا۔ ہمیشہ کے لئے اور ہمیشہ کی کر دے۔ جب یہ عطا فرمایا تو اس میں برکت و پاکیزگی عطا فرمایا۔

آپ کا یہ حکم ہوا تھا کہ یہ حقیر کبھی کبھی عریضہ بھیج کر اپنے آپ کو آپ کی

مجلس عالیہ میں حاضر ہونے اور آپ کے یاد میں آنے کا موقع دیا کرے۔ حکم کی تعمیل کرنا آپ کے بلند اشارہ پر کاربند ہونا، وقت کے لحاظ سے مناسب معلوم ہوا۔ کیونکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ تم پر سننا اور ماننا لازم ہے جب اس مقام پر آیا تو ٹھہر گیا زحمت دینے۔ وہم میں ڈالنے والے مقاصد و معانی آنے لگ گئے بعض تکلف لئے ہوئے تھے جو فقراء کے وقت کے موافق نہ تھے۔ بعض بے انتہا بے تکلف تھے جن کا اظہار مسکین کے مناسب حال نہ تھا۔ بلحاظ تردد و حیرت ان دونوں سے بھی کہ شک وشبہ عوارض کا لازمہ ہیں۔ جب تعلق نظر کر لیا گیا تو سب آرزوؤں کا خلاصہ و مطلب انتہائی پسندیدگی کا طریقہ یعنی آپ کی ذات ستودہ صفات کے لئے دعائے خیر سمجھ میں آیا چنانچہ اس میں مشغول ہو گیا۔ اس سے زیادہ فقیر سے اور کیا ہو سکتا ہے۔

مقصود کی انتہا اور اس کی حقیقت کا جب تصور کیا، پوری طرح حقیقت حال میں آ گیا، تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ دعا کے اقسام ہر مدعا حاصل ہونے کا سب سے قریب ترین راستہ یہ ہے کہ " انتہائی طلب "جستجو" توفیق کی استمداد" "تڑپ" کے ساتھ مانگیں جو خیر و ہدایت کا باعث ہے۔ اسی طرح سے استدعا ہوتی رہنی چاہیئے۔ خیر کے سارے دروازے کھلنے اور سارے مرادات کے حاصل ہونے کی چابی یہی ہے۔ اسی کو طلب کی حقیقت کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مطلوب کا شوق، طلب کا جذبہ طالب کے اندر اس طرح چکر کھائے اور اس طرح طالب پر چھا جائے کہ اگر ساری دنیا کے عقلمند ایک جگہ جمع ہو جائیں متفقہ طور سے کہہ دیں، حکم لگا دیں کہ یہ ناممکن ہے۔ محال ہے کوئی امکان ہی نہیں۔ اس کا ملنا حاصل ہونا کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی طریقہ سے بھی ہاتھ نہیں آتا۔ یہ مقصد ملنا محال ہے یہ سب سننے کے بعد بھی طالب کے

کان پر جوں تک نہ رینگے وہ ٹس سے مس نہ ہو۔ لوگوں کے سننے سے اپنی سچی طلب، جستجو، تلاش سے باز نہ آئے۔ بلکہ یہ سمجھے کہ طلب و مقصد کو پہنچنے کے لئے یہ سب ایک ہے اور ایک ساتھ ہیں۔ حصول مقصد کے لئے سب کے سب دامن پکڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ "طلب ہمارا کام اور مبارک حرکت ہے یہ طلب حق کے راستہ کے روکنے والے کو مارنے والی ہے یہ تیری دولت اور ظاہری محبت کی نشانی ہے۔ یہ طلب صبح کے وقت بانگ دینے والے مرغ کی آواز ہے جو نعرہ لگاتا ہے کہ صبح ہو گئی صبح ہو گئی" لیکن اس حالت کا ظہور اور اس کا باہر آنا عادت کی وجہ سے ہے۔ اس لئے عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو سمجھ میں نہ آئے تو چھوڑ بھی تو نہیں سکتے کیونکہ اپنے اختیار سے اجتہاد میں قدم رکھنا۔ سعی و کوشش میں لگے رہنا ضروری ہے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا لازمی ہے۔ بہترین اور اصلی چیز اس راستہ میں کچھ کرنا ہی ہے کام میں لگ جانا ہے۔ بیکار بیٹھنا صرف آرزو ہی آرزو میں مطلوب کی راہ دیکھتے انتظار میں رہنا، خیال ہی خیال، ہوس ہی ہوس ٹھنڈے لوہے کا پیٹنا ہے۔ اگر یہ کام کرنے کا ہے اور کرنا ہی ہے تو کسی جوانمرد کے زیر سایہ۔ کسی صاحب درد کی صحبت میں کیا جائے۔ جب اس طرح سے کیا جاتا ہے تو اس میں اور ہی خاصیت اور ہی اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر خود سو برس بھی کرتے رہیں تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ جوانمرد صاحب درد کے ساتھ تھوڑی مدت کی صحبت کا اثر اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ایک گھنٹہ کے لئے بھی کسی جوانمرد راہ حقیقت و معرفت کی صحبت ملنا آجائے آپس میں الفت و محبت کا اتفاق ہو جائے تو ساری عمر کا سرمایہ و توشہ ہو جاتا ہے۔ صحبت کی تاثیر سب کی مسلمہ ہے۔ کسی کو اس میں کلام نہیں۔

تجربہ سے آزمائش کے بعد عقلمندوں نے اس کو پایا ہے صحبت کی تاثیر سے ایمان کا نور یقین کی صورت اندر ہی اندر دل میں پیدا ہو جاتی مستولی (غالب۔ زورآور) منقش ہو کر ایسی جم جاتی نفس کو اس طرح سے اور ایسا گھیر لیتی ہے کہ اس نور یقین کا مٹنا، زوال میں آنا ممکن ہی نہیں۔ اور کچھ ہونے کی صورت یہی نہیں بلکہ بدیہی علوم کا حکم لے لیتا، اولیت میں آجاتا ہے۔ اس میں جو خاص خوبی ہے وہ بیان میں نہیں آسکتی جو کچھ بھی عمل سے کوشش وسعی کرنے سے وجود میں آتا ہے وہ ایسا ہے جو باہر سے اندر آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ فتور (خلل) وقصور (کمی) سے قریب ہو جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے اس کا باہر چلا جانا بھی ممکن ہے۔ کسی مردِ کامل کے ساتھ کام کرنے صحبت پانے کی تاثیر سے ظاہر وباطن یکساں ہو جاتا ہے۔ جو کچھ کہ وجود میں آجاتا ہے وہ اندر باہر کو گھیر لیتا ہے۔ گھٹنے زوال پا جانے اور چلے جانے اور فتور۔ نقصان میں آجانے سے محفوظ ہو جاتا ہے آئے ہوئے کا چلا جانا محال ہو جاتا ہے کسی نے خوب کہا ہے کہ میرے اندر سے وہ باہر نہیں جاتا کہ اس نے میرے اندر باہر کو گھیر لیا ہے"۔

ولی کے پہچاننے اس کے پانے کی کیا صورت ہے۔ ولی کو کس طرح پہچانیں۔ کس قاعدہ وضابطہ کے تحت تمیز کریں۔ یہ بڑا اہم کام بہت مشکل چیز ہے۔ یہ صرف اس وقت آسان ہو جاتا ہو جب اللہ تعالیٰ سبحانہ اس کو آسان کردے۔ اہل فقہ گروہ متکلمین رحمہم اللہ علیہم جو سلامتی کا راستہ چلے ہیں۔ انھوں نے ولی کی یہ تعریف کی ہے۔ ان کا

کا کہنا یہ ہے کہ ولی وہ ہے جو اللہ کو جانتا ہو۔ اس کا عرفان پایا ہوا ہو طاقت بشری کے لحاظ سے عبادات و طاعات کرتا ہو۔ خواہشات میں مبتلا نہ ہو۔ اللہ کی معرفت کی اگر قید نہ ہوتی تو ولی کا پہچاننا بہت آسان ہوتا۔ معرفت کا مرتبہ معنوی نسبت۔ اس کے رتبہ کا پہچاننا۔ اس کا اندازہ کرنا ہر کسی سے کیسے ہو سکتا ہے۔ ظاہری حالات کے لحاظ سے کیونکر اور کیسے پہچان ہو سکتی ہے۔ حقیقی ولی کو دعویدار ولایت سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں طالب کا جگر خون اور پتہ پانی پانی ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عبادتوں کی پابندی۔ خواہشوں سے پرہیز۔ حضور و استقامت کی صفت۔ ظاہری علامت پہچاننے کی کسوٹی ہے اسلام و اسلام کی راہ پر انصاف کی نظر رہنا گمراہی کے راستہ پر نہ چلنا۔ یہی صحیح بات ہے اگر ولی ہاتھ آ جائے۔ اگر اس کی پہچان ہو جائے تو اس سے نسبت پیدا کرنے فائدہ اٹھانے کا کیا قاعدہ طریقہ ہو سکتا ہے؟ اس نور کے حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے اگر کوئی کہدے کہ پہچان لینا ہی کافی ہے تو اس سے جان بوجھ کر انکار کر دو۔ کیونکہ یقین سے اس کو اپنے آپ میں ڈھونڈنے کا حکم ہوا ہے۔ فائدہ اٹھانا فائدہ کی طلب میں رہنے کا طریقہ اس پر منحصر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی دوست سے تجھ کو شناسا اور آشنا کرا کے اس کی دوستی اس کی محبت تیرے دل میں پیدا کر دے۔ اپنے دوستوں کو تجھ پر مہربان کر دے۔ تیرے دل کو ان کے دل کے ساتھ جو نور الٰہی کا مستقر (جائے قرار) ہے مقابل و محاذی بنا دے۔ تاکہ اس نور کی روشنی تیرے دل پر پڑنے سے تیرا دل روشن و منوّر ہو جائے یہ مقابلت و محاذات دوام و استمرار کے ساتھ جتنی پائی جائے گی (یہ سامنا

برابر ہونا۔ ہمیشہ ہر وقت کا جب ہو جائے گا اور جس قدر یہ حالت ہوگی)
اسی قدر نورانیت پیدا ہوگی۔ موافقت اور اتباع میں کھینچ لی جائے گی
جیسے جیسے ترقی زیادہ ہوتی جاتی ہے ایک روشنی سے دوسری روشنی
ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نورانیت کا راستہ جس کو چاہتا ہے دکھاتا ہے
یہ آمنا سامنا ایک کا دوسرے کے مقابل آنا۔ محاذ بن جانا۔ مقابل بننا
جب مرتب ہو جاتا ہے تو انوار کے شعلہ کی روشنیاں صورتیں بنانے لگتی
ہیں۔ حکمت نظری کے فروغ کے اس مسئلہ میں وہ حضرات جو زیادہ جان
پہچان والے، دوستی میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں،

خدا تعالیٰ کے اولیاء کی پہچان ان کی شناسائی کو خدا ہی پر چھوڑ دیتے
ہیں کہ وہ عزّ اسمہٗ اپنے دوستوں کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے۔ ہماری
خواہش و استدعا اسی قدر ہے کہ وہ ہمیں ان میں سے کسی ایک سے ملا دے
ہمارے لئے انھیں اپنے راستہ کی دلیل و سند کردے۔

ہمارے پیر اور سارے عوالم کے پیر حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین
ابو محمد عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ آدھی رات کے بعد
اُٹھ کر تازہ وضو کرکے دو رکعت نماز پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد سجدہ میں
جائے۔ گڑگڑائے آہ و زاری کرے۔ اور انتہائی عاجزی کے ساتھ درگاہ مولیٰ
تعالیٰ میں یہ دعا کرے یارب۔ یارب دلنی علیّ عبد من عبادك
المقربین یدلنی علیك ویعلمنی طریق الوصول الیك (اے
پروردگار تیرے بندوں میں سے ایک بندہ کو جو تیری نزدیکی پایا ہوا ہے، میرے
لئے دلیل راہ بنادے کہ وہ مجھ کو تیری راہ کی تعلیم تجھ سے ملنے کا طریقہ بتلائے)
یہ دعا جس طرح کہ فرمایا گیا۔ ہمیشہ کے لئے استقرار پا جائے۔ تو ضرور گوہر مقصد

ہاتھ آجائے گا۔ ہر وقت ہر حال میں یہی دعا کرتا رہے یہی تیری دعا ہونی چاہیئے تاکہ مراد کے چہرہ پر جو پردہ پڑا ہوا ہے وہ اُٹھ جائے ۔ یہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ تجربہ سے صحیح اور زود اثر ثابت ہوئی ہے۔ یہ عمل بہت با اثر ہے ۔ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے ۔ یوں تو ہر دعا جو آخرت کے کاموں کے لئے' سچی توجہ' دل کی تڑپ کے ساتھ کی جاتی ہے وہ کسی توقف کے بغیر قبول اور قبولیت کی سرفرازی سے سرفراز ہو جاتی ہے ۔ اگر تھوڑا سا توقف کبھی دعا کی قبولیت میں ہوتا ہے وہ دنیا کے فضولیات کی وجہ سے ہوجاتا ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح کی دیر طالب کی بہتری اور اس کی صلاحیت کی اصلاح کے لئے ہو۔ اسی میں اس کی اندرونی تعمیر چھپی ہوئی ہو۔ دین کے امور میں اجابت دعا۔ دعا سے بہت نزدیک ہے ۔ مانگنے ہی سے ملتی ہے ۔ ایسی ہمّت والا کون ہے جو سچائی ۔خلوص دل ۔ زبان وقت ۔ غلبہ حال کے ساتھ ماسوی اللہ سے الگ ہوکر دعا کرے ۔ دل کی گہرائیوں باطن کے خلوص سے اس بلند و بالا مطلب کی استدعا کرے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہمت کے پاؤں رز جاتے ہیں لیکن جس کو اللہ نے منتخب کرلیا اور اپنے فضل سے مخصوص کرلیا۔ اپنی توفیق کو جس کا رفیق کردیا اس کا کیا کہنا کہ وہ زبردست حکمت والا اللہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا' توفیق ہے ۔حق سبحانہٗ و تعالیٰ دنیاوی نعمت کو اخروی سعادت کا وسیلہ بنائے دونوں جہاں کی سعادت کی استواری ہمیشہ دائم' قائم اور باقی رکھے کہ وہی ہر چیز پر قادر ہے ۔

اس سے بالاتر ۔ راست تر (بہت اونچا ۔ بہت سیدھا) ایک اور راستہ ہے جس کو شاذلیہ طریق کے متاخرین ۔مشائخ قدس اللہ اسرارھم نے

طالبوں کو بتلایا ہے صرف متاخرین مشائخ ہی کا نہیں بلکہ متقدمین و متاخرین سب کا ہی مسلمہ (مانا ہوا) راستہ ہے۔ اس کے سوائے اور کوئی راستہ نہیں۔ اگر ہو بھی تو وہ مقصد کو پہنچانے والا نہیں۔ انتہائی اعلیٰ اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ سچی انتہائی توجہ کے ساتھ، ہمیشہ ہر وقت، حضرت سید کائنات منبع تمام کمالات صلی اللہ علیہ وسلم سے راست، بغیر کسی وسیلہ واسطہ کے انوار و ہدایت کا اقتباس کرنا۔ اور اسرار حقیقت کا استفادہ کرتے رہنا چاہیئے۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے اس سلوک اس طریقہ میں ان کے امام و قبلہ امیرالمؤمنین امام المسلمین حسن ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔ اللہ کا سلام ان پر ہو کہ حضرت امام علیہ السلام اس امت کے پہلے قطب اور سید السادات ہیں۔ آپ کا فرمانا یہ ہے کہ پانی کا منبع (جگہ پانی نکلنے کی) سے پینا نہر سے لینے سے زیادہ روشن و پاکیزہ ہے یہ نہایت واضح فرمان ہے امت کے اختلافات، مذاہب اور ان کے طریقہ کار میں علما میں خاصا اختلاف ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی شان میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ مختلف فیہ مسئلہ نہیں کسی ایک کو بھی اس سے اختلاف نہیں آپ کی حیات۔ بشائبہ مجاز توہم و تاویل کے بغیر ایک حقیقت دائم و باقی ہے۔ آپ اپنی امت کے اعمال کے حاضر و ناظر ہیں طالبانِ حقیقت اور متوجہ رہنے والوں کے مفیض و مربی (فیض دینے والے۔ تربیت و پرورش کرنے والے) ہیں بہترین نزدیک تر وسیلہ۔ اس طریق خاص کے سلوک کا یہ ہے کہ توبہ و طہارت کے بعد صلوٰۃ (درود شریف) کا تحفہ کثرت کے ساتھ۔ ہمیشہ ہر وقت، بھیجتے رہنا۔ کلمہ توحید کا درود شریف کے ساتھ ساتھ تکرار کرتے

رہنا چاہیئے کہ مقصود اصلی و مطلوب حقیقی یہی ہے۔ مداومت و استقامت کے ساتھ انتہائی توجہ سے کثرت سے درود شریف عرض کرنے سے اس مقدس مطہر بارگاہ میں رسائی ہوجاتی ہے۔ عرض معروض کا موقع نصیب ہوجاتا ہے عنایت ازلی نے آپ کو اس سعادتِ کبریٰ سے ممتاز و مخصوص کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ نے سب انبیاء علیہم السلام اور سارے رسول صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین میں آپ کو خاص امتیاز و فضیلت سے مختص کردیا۔ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیماً کثیراً۔

ہم ایک ایسی جماعت بھی دیکھا کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مزے لیتے ہوئے گفتگو کرتی ہے مجلس کرتی اس میں سرگرم ہوتی ہے، لیکن جب حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں گفتگو آجاتی ہے تو حیرت مذموم کے کانٹے اور نامعلوم اندھیرے کے گرد و غبار کہ وہ ان کے باطن کے حال سے ان کے دماغ میں وقیتہ آگرتا ہے، ان کو گھیر لیتے ہیں۔ اس سے وہ مبہوت ہوجاتے ہیں۔ اور ایسی صورت بنا لیتے ہیں۔ ایسا کچھ کہنے لگتے ہیں جس سے کہنے والے کے حضور وقت، صفائی باطن کو بھی لے کر چل دیتا ہے سبحان اللہ۔ متواتر شہادتوں، اس قدر صاف دلیلوں، انوار کے ظہور اسرار کے روشن اور ظاہر ہونے کے باوجود جو ہزار سال میں ہوتے آئے ہیں جنکی تصدیق جن کی سچائی ثابت ہوتی رہتی ہے آپ کے بلند حال آپ کی عالی مقام شان مشاہدہٗ مسلسل روایتوں سے معلوم و ظاہر ہوچکی ہے اس پر بھی اگر کوئی تقلید کی تنگی سے نہ نکلا، تردد انکار کے بھنور میں پھنسا ہوا رہا، تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی سے ہزار برس تک ایک بات کہی اور سمجھائی جائے پھر بھی وہ اس کو نہ سمجھا نہ یاد رکھا۔ کورا کا کورا جیسا کہ تھا ویسا ہی رہا۔ اس

سے بڑھکر کوئی درجہ ناسمجھی، کند ذہنی، بیوقوفی، حماقت کا نہیں قسم اللہ کی ہرگز نہیں۔ میں پناہ میں آتا ہوں اللہ کی ہر نافہمی اور کند ذہنی سے۔

شرعاً، عقلاً، عرفاً اس سلوک کے طریقہ کا اختیار کرنا اور اس راستہ پر چلنا، فرض اور مصلحت عین ہے اس میں تردد و توقف بے کار ہے۔ اس کو اختیار کر لینا اس پر چلنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مستقیم طریقے اور استوار ملت پر ہم کو تم کو قائم رکھے۔ دونوں عالم کا پروردگار ہمارے لئے یہ راستہ کھول دے ہمیں سیدھا سچا راستہ دکھلائے۔ اس پر چلائے۔ گفتگو کچھ اور تھی میں کہیں اور آ گیا مجھ کو معذور سمجھیں کہ اختیار کی باگ میرے ہاتھوں میں نہیں ہے آپ کی مجلس عالی کے ذوق تصور نے مجھکو یہ بتلادیا کہ کسی کے لئے اگر خط آدھی ملاقات ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں میرے لئے پوری ملاقات پورا مشاہدہ عین حضور ہے۔ دعا ہے کہ انوار سعادت وکرامت۔ توفیق استقامت بہترگی حالت، متواتر متوالی (یعنی پے در پے) رہے۔ آمین ثم آمین فقط

(اٹھارواں مکتوب)

مکتوب (۳۲)

طریقت۔ عبادت۔ وظائف

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

شیخ کامل عارف واصل حضرت علی متقی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ تبیین الطرق میں فرماتے ہیں کہ جو راستہ اللہ کی طرف لے جاتا ہے وہ عبادت ہے۔ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا اور سچا

راستہ ہے)۔

عبادت دو قسم کی ہے امتثالی اور اجتنابی (مفروضہ۔ ممنوعہ) (کرنے کو کہی ہوئی۔ کرنے سے منع کی ہوئی) امتثالی وہ ہے جس کو بلحاظ حکم کرنا پڑتا ہے۔ اجتنابی وہ ہے جس سے کسی حکم کے لحاظ سے پرہیز کرنا اور بچنا پڑتا ہے۔ فرائض کی ادائی نجات سے نوافل کی ادائی قرب سے وابستہ ہے۔ پرہیز بچاؤ اسی کی تکمیل کے لئے اسی کا پورا کرنا ہے۔ نوافل بہت ہیں لیکن وہ بھی دو قسم ہی کی ہیں انھیں بھی امتثالی و اجتنابی کہا گیا ہے۔ امتثالی نوافل میں سُنّتیں۔ نفلیں۔ مستحب اور دخل ہیں جن کی ادائی اچھے آداب بہترین طریقہ سے ہونی ضروری ہے۔ اجتنابی نوافل میں ایسے مکروہات کا ترک کرنا ہے جو بہت اچھے تو نہ ہوں لیکن ان میں کوئی کھلی برائی بھی نہ ہو ان کو اس لئے ترک کرنا پڑتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ایسی بات نہ ہو جائے جس کی وجہ سے کام میں برائی آجائے۔ مثلاً چکنی چپٹی غذائیں خواہش کی ازدیاد کے لئے عطریات اور خوشبو کا ترک دراصل اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے شہوت کے غالب اور حرام کے سرزد ہو جانے کا ڈر لگا ہوا ہے۔

شیخ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال میں ہے کہ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق (اللہ کی طرف جانے کے راستے لوگوں کی سانس کی تعداد کے برابر ہے) حدیث قدسی میں فرماتے ہیں کہ اللہ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں۔ میرے سوائے کوئی اور بندگی کے لائق نہیں۔ میں سب رحم کرنے والوں سے بے انتہا رحم کرنے والا ہوں۔ میں نے ایک ڈھانچہ پیدا کیا اس کو تین سو دس سال رکھ چھوڑا لوگوں کی تخلیق اس شہادت کے ساتھ کی گئی کہ اللہ ہی بندگی کے لائق ہے پھر میں نے انھیں جنت میں داخل

کیا یہ اشارہ ان نوافل کی کثرت کی طرف ہے جو امتثالی ہیں یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ذکر نفل نمازیں قرآن کی تلاوت۔ استغفار، تسبیح، دعا۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام۔ نفل روزے بطور نفل کعبہ کا طواف کرنا۔ صدقہ دینا۔ حج ادا کرنا۔ بیمار کی مزاج پرسی کرنا۔ جنازہ کے ساتھ جانا۔ نیک کام کرنے کا حکم کرنا۔ بُرے کام سے روکنا یہ صرف ایسی صورت میں جب کہ واجب اور لازم ہو۔ دین کے علوم پڑھانا پڑھنا۔ ہر طرح سے مسلمانوں کی امداد اعانت کرنا۔ سب میں کمترین مدد یہ ہے کہ اذیت (تکلیف) کا مسلمانوں کے راستہ سے دور کر دینا ان کے سوا اور بھی بہت سارے رفاہ عام (لوگوں کو فائدہ پہنچانے) کے کام ہیں۔ جو گنتی میں نہیں آتے فرائض کی ادائی ہو جانے کے بعد نوافل میں سے جو کچھ اختیار کئے ہوئے ہوں ان کو التزاماً ادا کرنا ان میں انہماک پیدا کرنا بیشتر اوقات ان میں مشغول و منہمک رہنا۔ جو لوگ نفل روزہ رکھتے، تلاوت قرآن کرتے۔ نوافل کی ادائی میں رہتے ہیں انھیں ایسی ساری باتوں اور چیزوں سے جو اس راستہ کی روک ہیں علٰحدگی اور بچاؤ ہاتھ آجاتا ہے ساری مزاحمتیں دور ہو کر مقصود اصلی کہ خدا تعالیٰ کا قرب (نزدیکی) ہے انشاءاللہ حاصل ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے قرب کے لئے ہر قسم کے نوافل جو امتثالی ہیں ان سب کا ادا کرنا مشروط نہیں کیونکہ سب کا بوقت واحد ادا کرنا کسی سے بھی ممکن نہیں۔ اس لئے کسی ایک نفل یا ذکر کی مداومت (ہمیشہ اور کثرت سے کرتے رہنا) بہتر ہے اور ممکن بھی ہے کر بھی سکتے ہیں اور یہی کافی ہے ادائی کی لازمی شرط یہ ہے کہ خطرات کو دور اور مکروہات سے پرہیز کریں۔

اس بارے میں یہ بھی سن لو کہ "اللہ کی طرف جانے کا راستہ ایک ہے" "یا یہ کہ اللہ کی طرف جانے کے راستے بے انتہا ہیں"۔ کہنے میں کوئی فرق نہیں۔

یہ ایک سی بات ہے ۔ دونوں قول ٹھیک ودرست ہیں ۔ایک حقیقت رکھتے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس راستہ کے چلنے والے بھائی بھائی ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں ۔سب ایک ہی راستہ کے چلنے والے اور سب ایک سے ہیں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں ۔ یہ ضرور ہے کہ باپ جدا جدا ہیں ۔ مطلب یہ کہ طریقہ تعلیم وتربیت، اذکار ونوافل کے اختیار کرنے کے بارے میں مشائخ مختلف ضرور رہیں لیکن سب کے لوٹ آنے (رجوع ہونے) کی جگہ ایک ہی ہے جس کو شریعت کہتے ہیں ۔شریعت کی پابندی، عبادت وتقویٰ کتاب وسنّت کی پیروی کرنا مشائخ رضوان اللہ علیہم کے ساتھ ارادت رکھنا یہ سب کچھ ایک ہی چیز کے لئے ہے ۔سب کا اختیار کیا ہوا مخصوص کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہی ہے یہ ذکر حضور کے پیدا ہونے فوائد کے ہاتھ آنے میں بے نظیر ولاجواب ہے ۔ اس کلمہ کی تکرار سوچ بوجھ ،فکر، ذکر، سے جو بات ہاتھ آتی ہے وہ کسی اور کلمہ میں نہ ہونے سے سارے مشائخ اسی کی تعلیم وتلقین اختیار فرمائے ہیں یہ مسلمہ ہے حقیقت یہی ہے کہ نماز سب عبادات کا مجموعہ ہے اس کی ادائی ہوجانے سے عبادت کے جتنے اقسام ہیں وہ سب ادا ہوجاتے ہیں اس لئے نفل نماز کو ذکر پر فضیلت دی گئی ہے کہ نماز میں ذکر فکر تکبیر تہلیل تسبیح دعا تلاوت مراقبہ وغیرہ سب کچھ ہے ۔

متفقہ مسئلہ یہ ہے کہ ہر مسلمان ایمان والے بھائی کی مدد واعانت ایصالِ خیر (اپنے سے اس تک نیکی وبہتری کا پہنچانا) نفل نماز سے زیادہ افضل ہے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اجتنابی قسم کی جو عبادات ہیں ان کی ادائی اس لئے اہمیت رکھتی ہے ضروری ہے کہ ان امور پر عمل نہ ہونے، ان سے بچاؤ بن جانے سے عبادات نہایت عمدگی آسانی اور بلاکسی روک کے ادا ہوجاتی

ہیں۔ منع کئے ہوئے سے بچنے کے لئے کوشش بھی ضرور کرنی پڑتی ہے۔ وقت کا التزام اس کا تعین اس کی کانٹ چھانٹ میں رہ کر انتہائی کوشش کیساتھ ان کی ادائی کی جاتی ہے لیکن کسی صورت میں بھی نوافل کو فرائض پر تقدم یا فضیلت نہیں دی جاتی۔ امتثالی عبادات کی ادائی و تکمیل فرض سُنت نفل کے اعتبار و تعین کے ساتھ ہوا کرتی ہے کرنے والے کی رائے کو اس میں قطعاً دخل نہیں ہوتا عبادات سے مقصود نزدیکی پانا اس کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہے وہ بتدریج کافی مدت میں یا مدتِ دراز کے بعد ہی کیوں نہ ہاتھ آئے۔ مثلاً بیماری میں دوا کھائی جاتی، پرہیز کیا جاتا ہے۔ صحت کی امید رکھی جاتی ہے اس التزام سے تندرستی صحت کا حاصل ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ مناسب دوا و علاج کے ساتھ ساتھ پرہیز بھی ہو رہا ہے دیر سویر میں اچھا ہو جانا ضروری ہے۔ بخلاف اس کے اگر کوئی عبادات امتثالی میں اپنی رائے کو دخل دے۔ مکروہات کے کرنے سے اپنے آپ کو نہ بچائے وہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔ جیسے کہ ایک بیمار ہو رہ دوا تو کھا رہا ہو لیکن پرہیز نہ کرتا ہو تو وہ صحت نہیں پا سکتا لیکن جو دوا بھی کھائے پرہیز بھی کرے وہ بیماری سے اچھا ہی نہیں بلکہ صحت مند طاقتور بھی ہوتا ہے۔ نقصان تکلیف دینے والی چیزوں اور باتوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا عقلمندوں کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ نفع اٹھانا گھاٹے میں آنے سے بہت بہتر ہے جو کہا گیا وہ اسی لئے کہ مکروہات سے بچنا، نوافل کی ادائی سے زیادہ اہم ہے اگر کسی کے کپڑے بہت میلے بھی ہو جائیں تو ایسے کپڑوں میں نماز ہو جاتی ہے۔ بعض ایسے اوقات بھی پیش آجاتے ہیں جن میں میل کچیل کا دور کرنا نوافل کی ادائی سے زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے۔ فرائض امتثالی و اجتنابی کو ادا کرتے ہوئے جو کوئی اس راستہ میں چلتا ہے وہ اپنا مقصو

جو قرب الٰہی پایا جاتا ہے۔ قرب الٰہی (اللہ تعالیٰ و تقدس کی نزدیکی) سے مراد سالک کا اپنے آپ سے اور غیر اللہ (اللہ تعالیٰ کے غیر) سے نکل آنا ہے۔ وصل کے معنی۔ اللہ تعالیٰ کے سوائے سب کو کاٹ کر پھینک دینا۔ اللہ ہی کا خیال و اندیشہ رہے یہی خطرہ منحصر ہو جائے۔ ہلاکت و خطرہ میں ڈالنے والے اندیشے و خیالات سے مراد یہ ہے کہ وہ منع کی ہوئی حرام ٹھہرائی ہوئی باتوں کی نسبت سے انحصار (بچاؤ، علیحدگی) پائیں۔ جائز ٹھہرائی ہوئی چیزوں باتوں اور مکروہات کے بھی اندیشے ہوتے رہتے ہیں اس میں بھی ہلاکت کا ڈر ہے۔ جائز ٹھہرائے ہوئے سے وہ سارے لگاؤ ساری مشغولیتیں مراد ہیں جو علم اور مخلوقات سے متعلق ہوتی ہیں۔ جیسے کہ آسمان زمین، پہاڑ، درخت زندگی اور گزران کے اسباب و ضروریات وغیرہ وغیرہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ سالک کا جائز اندیشہ و خیال سے نکلے بغیر جس نزدیکی میں وہ ہے وہ قرب ناقص (ادھوری نزدیکی) ہے جب جائز اندیشہ و خیالات بھی اس سے چلے جاتے ہیں تو اس کو قرب تام (پوری نزدیکی) حاصل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ سلوک حق میں سالک غیر حق سے جس قدر دور ہوتا جائے اسی قدر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔

سُنئے اب ہم غیر کا بیان اور ہی طرح سے ایک اور ہی عبارت میں کرتے ہیں حق تک پہنچنے میں اصلی پردے۔ روک یعنی وہ چیزیں جو پہنچنے سے مانع آیا کرتی ہیں وہ چار ہیں دنیا، خلق، نفس، شیطان۔ ان سے نکل آنے ان کو دور کر دینے کے جو اصولی طریقے ہیں ان کو کتاب منہاج العابدین میں لکھ دیا گیا ہے۔

سب یہ جانتے ہیں کہ فرائض کی ادائی کے بعد۔ نوافل کی کثرت کیساتھ

ادائی اصلی عبادت ہے۔ فرائض و نوافل قسم اور فرد کے اعتبار کرتے تناسب کے لحاظ سے قلیل الوقوع اور کثیر الوقوع ہو جاتے ہیں۔ قلیل الوقوع وہ عبادتیں ہیں کہ کبھی کبھی بلحاظ حالات و مواقع ادا ہوتی ہیں مثلاً حج، جہاد، زکوٰۃ۔ کثیر الوقوع وہ عبادتیں ہیں جو ہر حالت و ہر موقعہ میں روزانہ کثرت کے ساتھ ادا ہوتی ہیں۔ وہ شریعت کے طریقے اور رسوم ہیں جیسے کہ نمازیں، روزے اوراد، اذکار یہ اس طرح ہوتے رہتے ہیں جیسے کہ کھانا، پینا، جاگنا سونا، پہننا وغیرہ کہ یہ سب پر لازمی اور ضروری ہونے سے کئے جاتے اور کرنے پڑتے ہیں۔ سالک کو دونوں قسم کے کام میں لگے رہنا ضروری ہے۔ کرنے۔ پانے کے اوقات مقرر کرنا پڑتا ہے ظاہر ہے کہ ضرورت کی لازمی چیزوں کے بغیر چارہ نہیں فرائض۔ نوافل۔ رسوم و عادات پر عمل کرنے کے متعلق مختصر ہدایتیں کتاب "عین علم" میں لکھی گئی ہیں وہ کافی ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی احیاء العلوم کے خلاصہ میں جس کو مختصر احیاء بھی کہتے ہیں پائی جاتی ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی کافی ہے۔ اگر پورے طور سے واقف ہونا منظور ہو تو احیاء العلوم اور مبسوط وغیرہ اور ایسی ہی فقہ کی کتابیں دیکھ سکتے ہیں

شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ضابطہ جو ہم نے بیان کردیا ہیں طالب کے لئے معرفت و قرب کے حاصل کرنے کے کافی، یقینی ہیں۔ مرشد اور استاد کی ضرورت مقصد کے جلد حاصل ہونے مطلب مقصود کی طرف آسانی سے راستہ طے ہونے کے لئے ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہو جائے تو مرشد اور استاد کے بغیر بھی سلوک راستہ طے ہو سکتا ہے اس کا طے کرنا ممکن ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ

کا فرمایا ہوا ہے کہ جو ہماری راہ میں سعی و کوشش کرتے ہیں ہم انھیں اپنی راہ بتاتے ہیں۔ اس میں بہت دن ایک طویل مدت اچھا خاصہ زمانہ گزر جاتا ہے۔ انتھک کوشش ضروری ہی نہیں ہوتی ایک مدت تک صبر و تحمل کرنا پڑتا ہے اس کا ثبوت یہ کہ اللہ تعالیٰ اسی آیت میں صبر کرو۔ ٹھہرے رہو۔ دل لگائے رہو کی تنبیہ فرماتا ہے بہتری و فلاح پانے کی امید دلاتا ہے۔

مرید سالک کے مشاھدات میں جو کچھ آتا ہے ان میں بہت سارے ایسے امور ہوتے ہیں جن کو وہ سمجھ جاتا ہے بعض ایسے امور بھی ہوتے ہیں جن کو وہ سمجھ نہیں سکتا۔ وہ بخوبی اس کی سمجھ میں نہیں آتے راستہ مل تو جاتا ہے لیکن تفصیل اور خوبی کے ساتھ سب کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ کہیں ٹھہر جاتا ہے۔ اپنے فائدے نقصان کی چیزوں اور ایسی صورتوں کا فائدہ یا نقصان نہیں جانتا اس سے اس کو صبر کے ساتھ پورا نہیں کر پاتا برداشت نہیں کرتا ٹھہر نہیں جاتا۔ بجائے اس کے اگر سالک صبر کو ساتھ لئے ہوئے برداشت کرتے رہے دل لگا کر کام پورا کر کے بڑھ جائے تو راستہ پاتا ہے جب آگے بڑھ جاتا ہے اس کو راستہ مل جاتا ہے تو اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ فائدہ کیا ہوتا ہے نقصان کسے کہتے ہیں ان پریشانیوں کا اصلی سبب اور اطمینان کی صورت کیا ہے وہ کیسے ہو سکتی اس کو فارسی میں کسی نے خوب کہا ہے ؎

نے کہ سود و زیاں خود نمیدانی ۔۔۔ زاں جہت در چنیں پریشانی

تو اپنا نقصان فائدہ نہیں جانتا۔ اسی سے ایسی پریشانی میں ہے

(تیسرا مکتوب)

مکتوب (۲۳)

شُکر کی حقیقت، ذِکر کی تجدید

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

یہ جاننا ضروری ہے کہ دو وجہ سے نعمت کا شکر، نعمت سے بہتر ہوتا ہے کیونکہ وہ نعمت کے باقی رہنے کا سبب ہے۔ خدا تعالیٰ کا فرمان ہوا ہے کہ اگر شکر کروگے تو ہم اور زیادہ دیں گے۔ اس لئے نعمت کے شکار کو شکر کے دام (جال) سے پکڑ سکتے ہیں۔ شکر حقیقتاً نعمت دینے والے کی پہچان ہے۔ یعنی یہ جانتا ہے کہ نعمت اسی کی دی ہوئی ہے۔ علم کی صفت کا نتیجہ معرفت کی نسبت کا پھل یہی ہے۔ تاکہ جُودُ و عطا کہ اخلاق کا مقصود ہے علم کے ضمیمہ کے لاحقہ سے کمال علمی و عملی کے ساتھ مل کر جوہر ذات کے کمال کو جامعیت کی آراستگی سے مُزیّن کرتا اور زینت بخشتا رہے۔ یہ نہ ہو تو عمل کی صورت بے معنی اور علم و معرفت کی معنی بے جسم و روح ہو کر رہ جائے گی۔ شکر کا سلسلہ اپنی انتہا پر پہنچ کر معرفت پر ختم ہو جائے تو یہ جان جاتا ہے کہ سب کچھ اور یہ سب جو بھی ہیں وہ اسی کی طرف سے ہیں سب کا سب کچھ دینے والا وہی ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ کے سوائے کوئی اور نہیں۔ اللہ ہی اللہ ہے) لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰهِ (پیدا کرنے والا۔ اللہ ہی ہے اللہ کے سوائے کوئی اور نہیں۔

لا فاعل فی الحقیقة غیر اللہ (فی الحقیقت فاعل حقیقی حقیقت میں کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اس کے سوائے کوئی فاعل حقیقی یعنی حقیقتاً کرنے والا نہیں)

حدیث شریف میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ :-

پروردگار تیری نعمتوں کا شکر کیسے اور کیونکر ادا کروں۔ اور اس سلسلہ کی انتہا کیسے اور کیونکر اور کیا ہوگی۔ تو فرمان ہوا کہ اے داؤد جب تم یہ جان جاؤ گے کہ جو کچھ تم میں ہے وہ ہماری ہی نعمت ہے۔ تو تم ہمارا شکر کرو گے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ شکر کی حقیقت اور اس کی انتہا اس قدر ہے کہ تو اپنے آپ کو درمیان میں نہ دیکھے۔ سب کچھ ہمارا ہی ہے جانے اسی طرح دیکھنے سمجھنے اور۔ اس کام کی بنیاد اپنی ہستی کی نفی اپنے وجود کے ترک پر رکھی گئی ہے اچھی طرح سمجھو کہ ہستی کی نفی وجود کے ترک کا مطلب کیا ہے۔ کس ہستی کی نفی، اور کس وجود کا ترک ممکن ہے ہستی کی نفی، وجود کے ترک سے مراد اپنے وجود کا ترک (چھوڑنا) نیستی کی یافت (پانا) عدم کا ادراک (سمجھنا) ہوگا۔ ذات صفات، مال و دولت ساری باتیں اور چیزیں حق تعالیٰ ہی کی عطا ہیں۔ آدمی کا اس میں دخل نہیں۔ آدمی ایسا کہاں کہ اس کو وجود کا نام دیں وجود کہہ سکیں۔ وجود کی تعریف اس قوم (صوفیہ) کی کتابوں سے تفصیل و تحقیق کے ساتھ معلوم کر سکتے ہیں۔ یا ایسے مرد کی زبان سے سن سکتے ہیں کہ وہ اس راستے کا آشنا ہو۔ مرد کامل سے سننے کی تاثیر اور ہی ہے اور ایسی نورانیت رکھتی ہے جو دل نشین ہو جاتی ہے بشرطیکہ فطرت کے لحاظ سے کسی سعادت مند کی ذات میں یہ جوہر یہ معنی رکھا گیا ہو تو وہ اپنے ذوق سے اس کو پاتا ہے یہ مرتبہ مقصود سے زیادہ نزدیک بہت بلند ہے۔

اصلی بات اسی قدر ہے کہ جس کی فطرت میں قبول حق کی استعداد رکھی نہ گئی ہو اس سے جو بھی کہا جائے اس کو الٹا سمجھتا ہے اس پر اس کا اثر الٹا پڑتا ہے جو کچھ کہا جائے سمجھا یا جائے اس کے خلاف چلتا ہے۔ کیا کیا جائے کہ اس کی سمجھ ہی الٹی ہوتی ہے۔ اعوذ باللہ من ھٰذا (اللہ کی پناہ ایسے سے اس سے) ہاں جن کی فطرت میں قبول حق کی استعداد ہوتی ہے۔

جب وہ نیک حضرات کے ساتھ بیٹھتے اور ان کی مصاحبت میں رہتے ہیں تو ضرور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ واقعہ اسی قدر ہے کہ جس کی جیسی استعداد ہوگی اس لحاظ سے اس کو فہم و فیض ملتا اور ہاتھ آتا ہے قوی سے فعل میں آتا ہے وہ سب موانعات جو اس کو روکے ہوئے اس کے مقصود کے آڑے آئے ہوئے۔ اس کے لئے پردہ و روک ہیں، ان سب کو سامنے سے اٹھا دیتا ہے بڑی مشکل تو یہ ہے کہ استعداد و قابلیت کے ہوتے ہوئے بھی کام کا دارومدار طلب و جستجو پر منحصر رکھا گیا ہے۔ سچ ہے کسی کام کسی کسب میں آنے کسی حرکت کے بغیر مقصود کی آرزو کرنا ہوس و خیال کے سوا اور کیا ہے۔ حقیقی طلب جس کو کہتے ہیں وہ مطلوب کی طلب اور مطلوب میں استغراق، انتہائی انہماک ہے۔ اس میں اس کے کام میں اس طرح مشغول ہو جانا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا ہے وہ دور ہو جائے ہوا ہو جائے، اس کے سوا کچھ نہ رہے۔ ایسا مرد، نادر، نایاب بلکہ معدوم ہے۔ کیا کیا جائے کہ کسی کھٹکے و حرکت کے بغیر اور آرام سے بیٹھے رہنے کی بھی گنجائش نہیں۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا۔ اس میں لگے ہوئے رہنا اس راستے کے لوازمات سے ہے لیکن اس کے ساتھ رہنا۔ اس سے جدا ہونا بھی مشکل ہے۔ اس کو نہیں پا سکتے تو چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ضروری ہونے سے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ مقصود کے قبلہ کی طرف رخ کرنے کی کوشش کرتے رہنا۔ ہاتھ پاؤں مارنا ضروری ہے۔ تاکہ کسی وقت ایک ہی وقت کی مناسبت میں نکل آجائے۔ قدم سیدھے سیدھے راستہ پر پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف کا حاصل مضمون خوشخبری کا راہ نمائی لیا ہوا ہو جائے۔ ایسی ہی ایک اور حدیث شریف میں یہ ہے کہ اللہ عزوجل برکتوں کا عطا کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے دن رات

ایک گھڑی ایسی بنائی ہے اور اپنے جود وکرم حقیقی سے اس میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اس وقت جو بھی اس سے مانگیں وہ پاتے ہیں۔ سچ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم اللہ کی آپ سچے ہیں۔ سچے بنائے گئے ہیں سچے ثابت ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ حرکت وجنبش اسی مرتبہ سے اور یہیں سے اور اسی سے متعلق ہے وہاں سب کچھ مہیا ہے۔ جو کچھ وقت کے ذوق میں آتا ہے وہ رسائی پائے ہوؤں کے تجربوں میں ٹھیک پڑتا ہے۔ اور سامنے آتا ہے مثلاً اگر کوئی آدمی رات میں الگ خالی جگہ ایک کونے میں حضور دل کے ساتھ زبان حال سے کہنے لگ جائے۔ زبان سے ادا کرے۔ دل سے متوجہ ہو جائے۔ حلاوت وقت، یقین باطن سے۔ درگاہ عزّ وجلّ میں سر نیاز جھکا کر، ہاتھ اٹھا کر زبان حال یا قال سے جو عرض درگاہ عزّ وجلّ میں عرض کرے اس کا قبول نہ ہونا کیا معنی۔ ایسی دعا ضرور قبول ہوتی ہے قبول نہ ہونا عجیب ہے۔ اور مقصود کا دامن ہاتھ میں نہ آنا کوئی بات نہیں ضرور ہاتھ آتا ہے نہ آنا نادر ہے۔ سنو بہترین دعا۔ "مجھ سے تجھ کو چاہتا ہوں" ہے۔ یہی اصلی دعا ہے بقیہ اس کی فرع (شاخ ڈالیاں) ہیں وَبِاللّٰہِ التَّوفِیق (اللہ ہی توفیق دینے والا ہے) اصلی دعا، دعا کا عرض کرنا ہے۔ دعا کی خاصیت اور وقت کے متعلق کسی اور موقع پر کہیں اور لکھا جائے گا۔ اب معذور سمجھیں۔

ہمارا مقصود۔ اس مکتوب میں یہ عرض کرنا تھا کہ حق تعالیٰ کی نعمت اور اس کا حقِ نعمت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں آپ سے آپ کے فقرائے وقت کے ذمہ میں آگیا اور ثابت ہوگیا۔ اس کی شکر گزاری۔ اس کی ملازمت کے بعد دعائے خیر کو ایسا سمجھ لیا گیا ہے، جیسے کہ بعض عریضوں کے بھیجنے کے ضمن میں کبھی کوئی بات جو خیر اندیشی وخیر طلبی کی ہوتی ہے وہ بھی لکھدی جاتی ہے۔

ذوق ہم زبانی، لذت صحبت روحانی، حاضران مجلس سے لیا کرتے ہیں عادت کے لحاظ سے ارادہ کی مناسبت سے کبھی اس ذرۂ بے مقدار کے بارے میں اس تنکہ کو جس کو قلم کہتے ہیں آپ چلاتے ہیں اور جو کچھ کہ زمانے کے لائق۔ دوستوں، احبابوں اور اس حقیر کے حال کے مناسب ہوتا ہے وہ تحریر فرمادیتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی جانی بوجھی بات آجاتی ہے تو وہ سعادت کا سبب بنجاتی ہے۔ یہ ہماری بڑی سعادت و قبولیت ہے لیکن چھپانے اور دل میں رکھنے کی شرط سے مشروط ہے۔ تاکہ بات پردہ ہی میں رہ جائے۔ اور طلب وادب کے دائرے سے باہر نہ ہو جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے اس حقیر کا کیا مرتبہ کہ آپ کے سامنے نصیحت کے لئے زبان کھولے حقیقت کا بیان کرنا شروع کردے۔ دوسری یہ ہے کہ قلم کی طبیعت میں جولانی و طغیانی رکھی گئی ہے نہ معلوم وہ کہاں سر نکالتا ہے۔ کیا لکھ جاتا ہے اور سننے والے کی سمجھ میں کیا آتا ہے اور وہ کس میدان و گھاٹی میں پہنچ جاتا ہے۔ جس زمانہ میں کہ ہم ہیں اس وقت فقراء سے احکام اسلام و شریعت کا کہنا، حقائق و اسرار توحید کے کہنے کا حکم رکھتا ہے بلکہ اس سے بھی مشکل ہے۔ ہمارے زمانہ میں ملامیتہ۔ فرقہ اہل شریعت سے پناہ لیتا ہوں اللہ کی ایسی نادانی و گمراہی و بغاوت سے اور چاہتا ہوں عاقبت کا بخیر ہونا۔ (اکیسواں مکتوب)

مکتوب (۲۴)

عقلمندوں کی تنبیہہ ہر روز کا ورد

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

خواجہ نصیر فلسفی نے ایک خط شیخ عالم عارف صدر الدین تونوی قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ العزیز کو لکھا اور درخواست کی کہ حق تک پہنچنے کے لئے کچھ لکھکر بھجوا دیں اور راہِ حق کی راہنمائی کریں۔ یہ لکھکر خواجہ اس خیال میں تھے کہ حقائق و معارف وجود کے بارے میں توحید و تحقیق مبداء و معاد اور ایسے ہی مسائل میں کچھ نہ کچھ جواب میں لکھیں گے اور خواجہ کے لئے علم و فکر کی قوت سے اس میں پھیل کر گفتگو کرنے کی ایک صورت پیدا ہو جائے گی۔ باتیں بنانے، لفظی بحث کا موقع مل جائے گا۔

شیخ نے چند دعائیں جو حدیث شریف میں آئی ہیں انتخاب کر کے بھجوا دیں اور لکھ بھیجا کہ اس کو اپنا وظیفہ بنالو۔ روزآنہ مقررہ وقت پر پڑھا کرو۔ اس کی مداومت حاصل کرو۔ تاکہ راستہ کھل جائے۔ کچھ چیز روشن ہو جائے۔ اس کے بعد جو مصلحت ہوگی وہ کیا جائے گا۔ نصیر طوسی کو خواجہ کی یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوئی اور انھوں نے شیخ کو لکھا کہ یہ چیزیں مبتدیوں اور نوواردوں کو لکھنے کی ہیں۔ مجھ جیسے کے لئے جو علوم و معارف میں باریکیاں نکالتا ہے مطالب علمی کی تحقیق میں بہت اونچے مرتبہ پر پہنچ گیا ہے اس کو اس سے کیا مناسبت اس کے جواب میں شیخ نے یہ لکھا کہ ان میں

کا ہر ایک اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کا ایک خزانہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خزانہ دار ہیں۔ اس کے حکم سے اس کے بندوں کی ضرورتوں مصلحتوں کے لیے خرچ فرمایا کرتے ہیں۔ منتہی مبتدی کا سوال ہی نہیں۔ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دسترخوان کے ٹکڑے کھاتے ہیں علم وعقل کے آ جانے سے کوئی منتہی نہیں ہوتا۔ شرع پر عمل کرنا ضروری ہے تاکہ کام نکلے۔ عمل سے کام نکلتا ہے۔ باتیں بنانے سے نہیں نکلتا۔ اس تمہید اس حکایت کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد چند دعاؤں کا لکھنا ہے تاکہ وقت کی مصلحت کے لحاظ سے ان پر قابو پائے۔ شریر دنکے شر کے دور کرنے اور ان کے شر سے بچنے۔ سکون پیدا ہو جانے کے لئے ان کا ورد رکھنا اکثر ضروری ہو جاتا ہے جن کے پڑھنے سے ایسی چیزوں اور بہت ساری اور چیزوں باتوں سے محفوظ رہتے ہیں اس لئے ان کا بتلا دینا ' ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ امر محبت و خیر خواہی کے لوازمات سے ہے۔ حق تعالیٰ نے مجھکو مشائخ کی محبت اور ان کی پیروی میں رکھا اور ان سے مشرف کیا ان کے سوائے کسی اور کی پیروی سے محفوظ کر دیا۔

(۱) اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ (میں اپنا کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں اللہ دانا ہے اپنے بندوں پر) یہ دعا نفسانیت کے ٹکرا جانے اور دشمنوں کے شر و حسد سے بچانے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے یہ قرآن مجید کی آیت ہے۔ کیفیتِ خاص کے ساتھ نازل ہوئی ہے اس کی صدق و خوبی پر قرآن ناطق (گویا) ہے۔ اس خاصیت کو اس سے ملا کر بعد ذکر فرماتا ہے کہ فوقہ اللہ سیات مامکروا وحاق بال فرعون سوء العذاب سورۂ مومن میں یہ قصہ ہے کہ فرعون کے لوگ جو قبطی تھے

بنی اسرائیل کے اکھیڑ پھینکنے مٹا ڈالنے کی کوشش میں تھے اس تفویض کی برکت اور حق تعالیٰ کے لطف و حمایت سے وہ بچ گئے۔ انھیں دشمنوں سے بچانے ان کی حفاظت کرنے میں یہ دعا کارگر ہوگئی۔ کسی خاص قسم کا کوئی دشمن مراد نہیں۔ ہر قسم کے دشمن دشمنی ہر قسم کے شر اور شریروں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اگر آسانی سے ہر روز توفیق پائے تو اس کا ورد دس دفعہ سے کم نہ ہو سو دفعہ سے زاید کی ضرورت نہیں۔ یعنی روزانہ کم از کم دس دفعہ اور زیادہ سے زیادہ سو بار پڑھنا چاہیئے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

(نہیں ہے لائق بندگی مگر تو کہ پاک ذات ہے اور میں ظالموں میں سے ہوں) خدا تعالیٰ کے کلام میں سے یہ ایک اکسیر اور دوسرا خزانہ ہے جس کی خاصیت کے متعلق فرمان ہوا کہ:

فَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (نجات دی ہم اس کو غم سے اسی طرح نجات دیتے ہیں ہم ایمان والوں کو) حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں پہنچ گئے۔ خدا تعالیٰ نے اس تسبیح کی برکت سے آپ کو نجات دی۔ چنانچہ فرماتا ہے فلولا انہ کان من المسبحین لبث فی بطنہ الیٰ یوم یبعثون (اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا اس کے پیٹ میں قیامت تک حشر ہونے تک رہتا)

توحید کے راز کا مشاہدہ، الوہیت کی عظمت کا وجود، عبودیت کا شہود، کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ میں ہے اور اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ میں اپنا عجز و لاچاری کا ایک عظیم ذوق ہے۔ اس لحاظ سے مقصود کی دریافت و یافت احاطہ سے باہر نہیں ہوسکتی۔ بعض حضرات مسلمانوں میں بہتر تھے انھوں نے کہا کہ ایک لاکھ دفعہ اس ورد کا پڑھنا منزل مقصود کو پہنچا دیتا ہے۔ سچ مانو۔ تصدیق کرو۔

جس طریقہ پر کہ ہم ہیں، ہمیں کسی عدد معین یعنی مقررہ تعداد کی حاجت نہیں ذوق و حضور درکار ہے۔ چونکہ دعا کا راز عدد میں ہے۔ اس لئے جب تک جناب شارع سے کوئی عدد معین معلوم نہ ہو اس کے ٹکڑے کرنا اس پر حکم لگانا مناسب نہیں یہ اجتہادی امر نہیں ہے کہ حکم لگائیں۔ (بیسواں مکتوب)

مکتوب (۲۵)

پروردگار کی عظمت کا تصوّر

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

اَللّٰهُمَّ صغر الدنیا باعیننا وعظم جلالك فی قلوبنا۔ (اے ہمارے پروردگار دنیا کو ہماری آنکھوں میں بہت ہی چھوٹی (کمتر۔ بے مقدار) بنادے۔ (ناقابل التفات) کردے اور تو اپنے جلال کو بے انتہا بڑا (معظم مکرم انتہائی لائقِ توجہ) ہمارے دل میں بنادے، (قابل عظمت کردے)

اے فرزندِ دل بند تمہیں پروردگار کی عظمت اس کی کبریائی کا تصور نصیب ہوجائے کہ یہی سب سے اہم اور بہترین چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی صفت د هُوَالْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (وہ بلند و بالا، بزرگ ترین) ہے۔ جب آدمی اس کی امکانی حقیقت یعنی اس کے ممکن ہونے کی صورت پر نظر ڈالتا ہے تو وہ اپنے آپ میں اتنی کی اتنی نیستی (کچھ نہ ہونا) دیکھتا اور پاتا ہے تو نظر کو اس کے پانے میں متلاشی (یعنی لاشئی۔ کچھ نہیں) پاکر پریشان و معدوم ہوجاتا ہے۔ اپنے آپ کو ہیچ (ناچیز) پاتا ہے۔ ہیچ ہونے کا نام دینا یہ نشان اس پر لگانا اس کے ہونے وجود پانے کی تہمت ہوجائے گی۔ ایسا کہنا اس پر تہمت لگانا ہے اپنے وقت کی صفائی کے زمانے، نظر کی باریکی کے اوقات میں جب اس فقیر کی نظر اپنے وجود کے تعین پر پڑجاتی تو ایک جھپک سی سامنے آجاتی ایک لمحہ بھی نہ گزرتا کہ وہ نظر سے معدوم و فانی ہوجاتی تھی۔ تم نے ابر کا ٹکڑا آسمان پر دیکھا

ہوگا، کہ کیسے چلتا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ چلتا ہے پتلا پڑتا جاتا ہے اور ہوتے ہوتے آخر ش نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ نظر کی تیزی اور وقتیہ صفائی زمانی نظر کم ہوتی ہے تو ایک چھلکہ کی طرح جو پرانا کمزور سوراخ دار پڑا ہوا بالکل ہی ہیچ دکھلائی دیتا ہے۔ کبھی سیب شفتالو کے پوست کی طرح بہت ہی پتلا جھلجھلا۔ کبھی خشخاش کے دانہ کے جیسا یا اس سے بھی زیادہ بمقدار اور کم دکھائی دیتا ہے۔ وجود امکانی کے پردے اور چھلکے سے جب نظر مجرد و صاف (الگ ستھری) اپنی اصلیت کے لحاظ سے ہو جاتی ہے تو وہ حقیقت نظر میں آجاتی اور یہ معدوم مطلق ہو جاتا ہے کسی قسم کا پتا یا اپنی ہستی کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہ وہ مرتبہ ہے کہ جس کی فضائے نورانی میں سلسلہ نقشبندیہ کے مشغولین نور اللہ ارواحہم توجہ کے دوران میں جا پہنچتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو فضائے نورانی میں پایا۔ خود کو پایا یعنی ان کا نور ادراک (پانے کی روشنی و نور) ایسا بسیط و لطیف ہو گیا کہ یہ حالت ان پر رونما ہو گئی اور ان سے وجود کے تعین کی روک جاتی رہی مثلاً اگر کوئی چیز جو کثیف ہو کسی چیز پر سایہ ڈالی ہوئی روشنی کی مانع ہو، چاہے وہ آفتاب کی ہو یا چراغ کی، وہ چیز جو سایہ ڈالی ہوئی یا روک تھی جب دونوں کے درمیان سے اٹھ جاتی یا دور ہو جاتی ہے تو روشنی ظاہر ہو کر نورانیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے آپ کو پایا کہتے ہیں جس کا مطلب اپنے آپ کو گم کر دیا ہوتا ہے۔ سبحان اللہ کہاں پہنچ گیا کیا منہ دکھلایا اور پیش آگیا میرا قطعاً ارادہ اس کے بیان کرنے کا نہ تھا۔ مقصود یہ تھا کہ اوقات کی نگہبانی، اس کی حفاظت ان کی برقراری، "باطن کی معموری" "دل کی غنا" "وجود کا معمور" (بھر جانا) ہو جانا ان سب کا اسی طرح ہو جانا "نور حضور"۔ "صفائی حال" "وقت کی فراغتی" کا ہاتھ آنا۔ "عظمت و وجود حق کا تصور" یہ

سب کچھ اس کی قدرت کے غلبہ، اس کے علم کے انبساط (پھیل جانے گھیر لینے) سے ممکن ہے اور اپنی ہستی کو ہیچ سمجھنا، اپنے حال کی ذلت، حقارت، کمتری کا اپنے آپ پر لازم کر لینا۔ یہ اس کا مقدمہ ہے۔ نیستی کا شہود ہی اصل اور نفس الامر ہے۔ لیکن اس میں پھنسے ہوئے رہنا، پستی ہی نہیں بلکہ خود پرستی ہے، تو پھر نظر بلند کیوں نہ رکھیں، اور بلندی کی طرف کیوں نہ جائیں اور اپنی نظر کو نورِ حق وجودِ مطلق، عظمت کبریائی پر کیوں نہ گاڑ دیں تاکہ تمام علوی، سفلی، عقلی حسی ہستیاں اس کے پہلو میں ایسے معدوم و نیست (ایسے لاپتہ) ہو جائیں کہ ڈھونڈنے سے بھی ان کا پتہ و نشان نہ ملے۔

تصورِ عظمت سے "جلالِ حق"۔ انبساطِ نورانیت سے "پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کمال، دیکھو اور مشاہدہ کرو۔ کہ کیسی بادشاہی غریب نوازی، دین دنیا کی کیا بخشش ہے۔ آپ کے خادم آپ کی درگاہ کے غلام آپ کے دین کے زندہ کرنے والے جن و انس کے فریاد رس ہیں۔ زمین و آسمان کے بادشاہ ہیں ملک و ملکوت میں تصرف کرتے ہیں جب یہ نظر میں آجائے تو انوار ولایت و سیادت میں نظر کرو۔ ان خاص حضرات پر نظر رکھ کر سب لوگوں سے مستغنی (لاپروا) ہو جاؤ۔ پھر میں مقصود پر آ گیا۔ ابتدائی مکتوب میں یہی ملحوظ تھا کہ تم کو مجھ سے۔ مجھ میں تم میں دوئی نہیں تو میں میں تو بلکہ وقت کی جمعیت سینہ کے کھل جانے، طالب کو جمع میں لے آنے کی خاطر، ہمدردی ہمکاری۔ ہم پیشگی، دوئی نہیں یہ نصیحت ہم اس لئے کرتے ہیں تاکہ زمانے کے دنیا کے دنیا دار لوگوں سے خوف اس کے غیروں سے گھبراہٹ۔ ڈر، خلجان، وسواس، دل کا تعلق و پریشانی فتورِ حال وقتیہ تشویش۔ پیدا نہ ہو جائے سنو۔ جب دل، عظمت حق، عزت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

بھرپور (معمور) ہو جاتا ہے تو اس میں وسواس اور غیر کے آنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی ہے۔ مقامِ شہود کبریا سے اگر تنزل کر کے اپنے عالمِ بشریت میں آجائیں، مطلب کی آرزو، مقصد کے حاصل ہونے کی امید پیدا ہو جائے تو امیدوار رہو۔ یہاں مطلب ومقاصد حاصل ہوتے ہیں بمطلب ومقصد حاصل ہونے کی جگہ یہی ہے۔ یہ ملک خدا ہی کا ملک ہے اس پر وہی متصرف اس کا وہی مدبّر ہے اس کی نیابت، وکالت، سفارت، رسالت پیغمبران علیہم السّلام خاص حضرات درگاہ قدس سرہم وقت بوقت حاضر ہونے والے حضرات رحمہم اللہ علیہم کبھی کبھی حاضر ہونے والے بزرگ رحمتہ اللہ علیہم کام کرتے ہیں۔ ان کے سوائے کسی کے لئے نہ تو عزت ہے نہ کسی کو مل سکتی ہے سچ ہے عزت اللہ ہی کے لئے۔ اس کے رسول کے لئے مومنین کے لئے ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔ وہ لوگ جو زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتے ہیں، دل میں ظلمت شرک اور روگوں پر نظر رکھتے ہیں آداب شریعت کا لحاظ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ "منافق تو نہیں ہیں لیکن منافق کے صفات وعادات رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے، ان کی اور ہماری توبہ کا قبول کرنے والا وہی ہے۔

شیخ قدس سرّہٗ العزیز درود شریف کا شغل بتلا کر اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ کا مراقبہ کرنے کی تعلیم فرماتے ہوئے یہ فرمائے کہ دیکھو کہ تم کیسے کیسے دریاؤں میں غوطہ لگاتے ہو اَللّٰهُمَّ کہہ کر حق سبحانہ تعالیٰ کے جامع کمال دریا میں گر گئے صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ کہکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضل آپ کی جود وسخا کے دریا میں غوطہ کھا گئے۔ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ کہکر ان کے کمالات میں تیرنا شروع کر دیا ان دریاؤں سے

بے نصیب رہنے خالی ہاتھ آنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔

اے فرزند یہ سمجھ لو کہ دنیا والے زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنے والے چند قسم کے ہوتے ہیں ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے۔ جو کچھ نہ کچھ درد ضرور رکھتی ہے۔ انصاف کی خوبی سے عاری (خالی) نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اِسۡتَوۡقَدَ نَارًا کی طرح نورِ معرفت ان کے دل پر چمک جاتا اور وہ غفلت سے ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ ان سے خاطر جمع رہو۔ بلکہ ان سے نیکی و دوستی انصاف ہی کی توقع رکھو۔ یعنی ان کی طرف سے کسی قسم کی تشویش کو دل میں آنے نہ دو۔ لیکن ان کی صحبت دوستی میں پھنس نہ جاؤ۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ انصاف پر نہیں رہتے ہمیشہ لڑائی جھگڑے بہانے نکالتے رہتے ہیں۔ صرف باتوں سے ڈراتے خواہ مخواہ پریشانی میں ڈالتے ہیں۔ ہر کسی کو برا کہتے' برائی سے یاد کرتے ہیں۔ چونکہ یہ زبانی نقصان ہوائی باتیں ہوا کرتی ہیں اس لئے ان سے کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ اپنے نفس کی تعریف میں مبتلا ہیں اپنی تعریف چاہتے ہیں ان کے پاس عزت و سرفرازی یہی ہے' وہ اسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا۔ (اور صبر کرو اس پر جو کچھ وہ کہتے ہیں انھیں خوبی کے ساتھ چھوڑ دو عمدگی سے ان سے علیٰحدہ ہو جاؤ)۔ اگر نقصان پہنچانا چاہیں' جانی تکلیف دینے پر اتر آتے ہیں' ان سے بچنے اور اپنے بچاؤ کا طریقہ ہجرت کرنا۔ کعبۃ اللہ یا مدینہ منورہ کو جانا وہاں قیام کرنا ہے۔ ہجرت انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ وَهُوَ الحفیظ العلیم۔ (وہ حافظ و نگہبان جاننے والا ہے) دیکھو۔ وقت کو

غارت جانے نہ دو جمعیت کو ہاتھ سے نہ دو۔ فرصت کو غنیمت جانو۔ خاطر جمع رکھو۔ امیدوار رہو یہ دعا پڑھتے رہو جو سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدنا حسن بن علی کرم اللہ وجہہ و رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بتلائی تھی۔ آپ اس امت کے پہلے قطب ہیں اور خلافت کبریٰ کے ختم کرنے والے ہیں۔ آپ نے معاملہ میں یہ سیکھا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِقذِف فی قلبی رجاءک واقطع رجائی عمّن سواک حتّٰی لا ارجوا احدًا غیرک۔ بے اختیار، سوچے سمجھے بغیر، یہ کلمات ذہن میں آ گئے، قلم سے نکل گئے شاید اس میں کوئی نہ کوئی بہتری ضرور ہوگی۔ باللہ التوفیق والعاقبۃ بالخیر۔ (انچاسیواں مکتوب)

مکتوب (۲۶)

شکر، محبّت، توحید

اَللّٰہُ وَرَسُولُہٗ

حضرت ذوالجلال کی نعمتوں اس کے احسانوں اور ان کے ذریعے اور وسیلے کے شکر میں زبان گونگی ہے نعمت دینے والے، احسان کرنے والے کے احسانات و انعامات کا شکر ادا کرنا، نعمت کے زیادہ ہونے کا سبب بن جاتا ہے، رحمت کو کھینچ لینے کی وجہ ہو جاتا ہے۔ جس کا فائدہ شکر کرنے والے ہی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ نعمت دینے والے، احسان کرنے والے کی ذات اس سے مستغنی (لاپروا) ہے۔ وَمَن یَّشکُر فَاِنَّمَا یَشکُرُ لِنَفسِہٖ وَمَن کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیدٌ۔

(جو شکر کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی شکر کرتا ہے' اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے اس سے تعریف کیا گیا ہوا اس سے اللہ غنیؔ حمید (لا پرواہ ہے) یہ بھی اس کی انتہائی رحمت اور رافت (بخشش مہربانی) اپنے بندوں پر ہے کہ اس نے انھیں شکر ادا کرنے کا حکم فرمایا. تاکہ نعمت و رحمت کے زیادہ ہو جانے کا سبب ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ شکر کو واسطہ بنائے بغیر بھی یہ بات کر سکتا ہے لیکن رحمت بہانے ڈھونڈھتی رہتی ہے۔ سب اسی سے اور اسی کی طرف سے ہیں خواہ وہ نعمت ہو یا شکر یا نعمت کا زیادہ ہونا اس کا انعام و اکرام ہے کہ اس نے اس کو وجود دیا اس میں افعال رکھے' افعال کا اس کو بدلہ دیتا ہے تاکہ قصور میں گرفتار اور شرمندگی میں ڈوبا ہوا نہ رہے۔ "لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ" کی آیت کی تفسیر میں بعض حضرات نے یہی کہا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں غیر ممنون یعنی غیر مقطوع (کبھی جدا نہ ہونے والا) کے معنی میں ہے ممنون منّت سے ہے یعنی بندوں کے لئے بدلہ بندے کے کردار اور اس کے کام کا اجر (مزدوری) جو کچھ ہے وہ کسی منّت کے بغیر ہے۔ یعنی جیسا کیا ویسا پایا۔ یہ معتزلیوں کے مذہب کا ایک راستہ ہے۔ بخلاف اس کے اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ بدلہ ملتا ہے وہ مولیٰ تعالیٰ کا فضل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لکھو کھا احسانات بندوں پر ہیں۔ بندہ احسان و منت کا گرویدہ کرم کا ممنون ہر حال میں ہے ۔ ایسی صورت میں "غیر ممنون" کے کیا معنی ہوئے۔ سنو. مولیٰ تعالیٰ نے بندہ کو وجود بخشا اس کی ہستی کا قرار داد کیا۔ اس کو فاعل مختار پیدا کر کے عمل کا اس کو ذمہ دار کیا۔ عمل کی جزا ٹھہرایا۔ بدلہ کا مستحق بنایا۔ یہ فرمایا کہ "شکر تم سے اور زیادہ دینا ہم سے متعلق ہے. عمل تم سے جزا ہم سے" یعنی شکر کرنا تمہارا کام نعمت کا زیادہ کر دینا ہمارا کام عمل

کرنا تمہارا کام، بدلہ دینا ہمارا کام۔ یہ اس کا کرم اس کی بزرگی سرافرازی بندہ نوازی ہے اس سے اپنے کمال اپنے جاہ جلال کا اظہار مقصود ہے یہ اس کی قدرت ہے کہ اس نے بندہ کو خاک سے اٹھا کر قدرت کا سارا کارخانہ اس کے حوالہ کر دیا۔ بادشاہوں کی طرح رکھتا ہے۔ وَلِلّٰہِ المَثَلُ الاَعلٰی (اللہ کے لئے بہترین مثالیں ہیں) بندہ کو نوازتا ہے، کام پر لگایا جاتا ہے اور نتیجہ بھی دیتا ہے۔ مدعی و مستحق عنایت بنا کر مشمول دولت و نعمت کر دیتا ہے۔ بندہ اگر اپنی ہستی کا دعویٰ کرے اپنے آپ کو مستحق بتلائے عمل کا بدلہ مانگے تو برا ہی نہیں بلکہ مردود بارگاہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مولیٰ تعالیٰ کے فعل اور عمل کی مند اسی کی طرف لوٹا دی جائے۔ بدلہ کا اثبات اس کے حکم کی بنا پر کیا جائے تو یہ قابلِ تعریف بہترین بات ہونے سے اس کے انعام و اکرام کا حیلہ ہو جاتا ہے یہ وہ مرتبہ ہے جس میں امر و نہی (کرنے نہ کرنے) کا راز، بدلہ و ثواب کے متعلق کرنے کا حال کھل جاتا ہے۔ یہ بات بہت نازک ہے اگرچہ ظاہری نظر میں یہ بلحاظ مجاز ہے لیکن مجاز بھی تو اسی کی علت غائی اور حقیقت بلکہ حقیقت کی حقیقت راز کا راز ہے مقصود اور کام کی یہی انتہا ہے اس لئے کسی نے کہدیا ؎

ہر حقیقت کہ کنہ آن خواہی　　ظاہر اندر مجاز خواہد بود

(ہر حقیقت جس کی تہہ تو چاہتا ہے　　وہ مجاز ہی میں ظاہر ہوگی)

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ یہ بات عقل میں نہیں تلتی سمجھ میں نہیں آتی ہے — مطلب یہ کہ عقل اس کو سمجھ نہیں سکتی یہ کیا ہے کیسی ہے کہ تجویز کر سکتی نہ پا سکتی ہے کہ کیونکر ہے ہاں اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت تک صرف ذوق و وجدان سے پہنچ سکتے ہیں کہ یہ کہاں سے آئی اور کس لئے آئی۔ بیان کرنے کا

ارادہ یہ تھا کہ بندہ کو شکر ادا کرنے کا حکم دینے میں کیا بھید اور کیا حکمت تھی اور نعمت کے زیادہ ہونے کی وجہ قرار دینے کا سبب کیا ہے۔ ہاں جو کچھ تھا وہ گذر گیا اب یہاں گفتگو اور ہی ہے جو عام سمجھ اور فہم کے مطابق کہی جا رہی ہے جب بندہ حق کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے تو اللہ سبحانہٗ بھی شکر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ خود فرماتا ہے وَاللّٰہُ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ (اللہ شکر کرنے والا صاحب علم ہے) وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ (اللہ معاف کرنے والا اور قدردان ہے)
اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام شکور بھی ہے۔ مَنْ کَانَ اللّٰہُ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ۔ (جو اللہ کا ہو جائے۔ اللہ اس کا ہو جاتا ہے) شکر کی توفیق اس کی عطا جزا سے جو کچھ سرفرازی نصیب ہوتی ہے وہی حقیقتاً یہاں مراد ہے یہ ایک راز ہے بندہ کا شکر مالک کی نعمت کے زیادہ ہونے کا سبب فرمایا گیا ہے بندہ کے لئے اسی طرح کا شکر کرنا اللہ تعالیٰ کی محبت و عبادت وطاعت کے زیادہ ہو جانے کا حیلہ و سبب ہو جاتا ہے۔ "شکر" نعمت میں "نعمت" محبت۔ عبادت وطاعت میں لے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت وطاعت و عبادت زیادہ ہو جاتی ہے تو یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (یہ چاہتے ہیں اس کو وہ چاہتا ہے ان کو) کا بھید کھل جاتا ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے۔ جب تک محبت دوستی، یگانگی کے مرتبہ کو نہ پہنچ جائے ٹھہرتی ہی نہیں۔ یگانگی سے ہر وقت دست بگریباں ہوتی رہتی اور آخرش چھٹکارا پا جاتی ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ بندہ شکر کے مرتبہ سے ترقی کر کے یگانگی کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو خدا کی وحدانیت (یکتائی) توحید (ایک ماننا ایک ٹھہرانا) ظاہر ہو جاتی ہے ؎

یحبہم و یحبونہٗ چہ گفت است راست ۔ بزیر پردہ مگر خویش را خریدار است

(وہ چاہتا ہے آپ کو یہ چاہتے ہیں اس کو عجیب قول ہے۔ پردہ کے نیچے خود اپنا

خریدار آپ ہے۔)

اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ "محبت کا غلبہ"۔ "یگانگی۔ یکتائی کے ظہور کا نتیجہ توحید ہے۔ توحید میں آجانے سے محبت و یگانگی کے راز کھل جاتے ہیں۔ محبوب کی یگانگی یکتائی پر نظر لگی رہتی ہے۔ نظر شہود میں محبوب کے سوائے کچھ نہیں رہتا۔ غیر او رغیریت کے پردہ علیٰ حالہ ضرور رہتے ہیں لیکن محبوب کے سوائے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ غیر ہوتا ہے۔ لیکن غیر نما نہیں رہتا۔ اَلْفَقْرُ اِذَا تَمَّ هُوَ اللّٰه (جب فقر پورا ہوجاتا ہے۔ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ ہی اللہ ہوتا ہے) کے معنی یہی ہیں۔ بعض عرفا جو اہل تمکین سے تھے انھوں نے کہا ہے کہ التوحید شہودی لا وجودی (توحید شہودی ہے وجودی نہیں) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ روح انسانی میں یہ خاصیت رکھی گئی ہے کہ وہ جس چیز کو دوست رکھتی ہے جب اس چیز کی دوستی اس پر غلبہ کرتی ہے تو وہ اس کی عین ہوجاتی ہے۔ اس طرح ہوجانے سے محبوب کے سوائے جو کچھ ہے وہ اس کی نظر شہودی سے ساقط ہوجاتا ہے۔ اَنَا لیلیٰ اَنَا لیلیٰ (میں لیلیٰ۔ میں لیلیٰ) کا یہی مقام و مرتبہ ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ "وجود ایک" "موجود ایک"۔ ایک ہی ایک ہے۔" ایک کے سوائے کوئی اور نہیں" ؎

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر　　سوی اللہ واللہ ما فی الوجود

(کہاں غیر کون غیر۔ غیر کا نقش کونسا۔ قسم اللہ کی۔ اللہ کے سوائے کوئی وجود نہیں)

یہ اور ہی حکایت ہے۔ اتحاد و یگانگی مجازی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت حال یہی ہو۔ لیکن پہلا طریقہ احتیاط و پرہیزگاری کا ہے تحفظ کے قریب ہے اللہ اعلم (اللہ ہی بہتر جانتا ہے) بات محبت کے محل و موقع تک آگئی۔ یہاں تک آنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سے ہمیں کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ قلم کی جولانی

یہاں تک نے آئی۔ اب خاموشی ہی بہتر ہے دم نہ مارنا ہی اچھا ہے۔ پہلی بات جو دل میں آئی تھی اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ نعمت کا شکر نعمت کے زیادہ ہونے کا سبب ہے۔ بندہ کے لئے یہ ضروری ہے وہ یہ بات ذہن میں نہ رکھے کہ شکر اس لئے کر رہا ہوں کہ نعمت زیادہ ہو اگرچہ کہ یہ ظاہری ایمان و شریعت میں جائز ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ شکر کرنے میں نعمت کے زیادہ ہونے پر نظر رکھنا تو کجا خود ہی نہ رہے۔ اگر کوئی کسی کے حکم کی بنا پر کوئی کام کرے۔ پیچھے وعدہ کی وجہ سے بدلہ و مزدوری پر نظر رکھے تو یہ معاملہ نہ ہوا مزدوری ہوئی حساب و کتاب لین دین ہوا۔ یہ بات اہل صفا صاحبانِ معرفت سے کے نزدیک کوتاہ بینی ہی نہیں بلکہ خاصا نقص انتہائی کمزوری کی بات ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ شخص نعمت ہی پر مرا مٹا ہوا ہے۔ اسی کا عاشق وطالب ہے منعم (نعمت دینے والے) کا عاشق وطلبگار نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے نفس کا عاشق ہے۔ ؎

شک نیست عاشق اند ولے عاشق خود اند　　انہا کہ کام دل طلبند از شکر لباں

(وہ جو دل کا مطلب معشوقوں سے چاہتے ہیں وہ عاشق تو ضرور ہیں لیکن اپنے مطلب کے)

اس طریقہ سے چلنا بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ نعمت زیادہ ہوجائے مگر وہ ہوتی بھی ہے۔ تو ہمت وعمل کے اندازہ سے ہوتی ہے بشکر شکر کرنے والے سے نظر اٹھ جائے تو شکر، نعمت منعم ہی کے لئے ہوجائے گا۔ خدا تعالیٰ کی نعمت اندازہ سے زیادہ ہوجائے گی۔ حقیقت وہی ہے جو منعم کی ذات کے ساتھ محبت کی وجہ سے ادا ہو، اور نعمت پر نظر نہ ہو۔ منعم ہی منعم اور اس کی محبت ہو وہی وہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ نعمت ہو تو شکر ادا ہوتا ہے۔ لیکن

جب نعمت نظر میں نہ رہے اور فی الحال جو نعمت رکھتا ہے اس کے مقابلہ میں اس نعمت پر جو آئندہ زمانے میں ملنے والی ہو طمع کی نظر رکھنا کوتاہ نظری بے فائدہ کام ہے۔ جب شکرِ نعمت نعمت دینے والے کے لئے کیا جاتا ہے تو یہ ہاتھ آجاتا اور کام بن جاتے ہیں۔ مطلب حاصل ہو جاتا ہے مَنْ لَهُ مَوْلٰى فَلَهُ الْكُلُّ (جس کا مولیٰ اس کا دولہ۔ مولیٰ جس کا ہوگا سب کچھ اسی کی ہوگی۔)

علمائے ظاہر جو تفسیر کرتے ہیں وہ شکر کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ :-
هو التعظيم المنعم (وہ نعمت دینے والے کی تعظیم ہے) شکر کو اپنی معنوں میں ہی سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ لذات المنعم لا نعامه (منعم سے لذت پانا اس کے انعام سے) پس سمجھ جاؤ اسی کے ہو رہو۔ اسی پر رہو۔ جب عارف میں یہ حال پیدا ہو جاتا ہے۔ تو وہ ہمیشہ ہر دم شکر میں رہتا ہے۔ پہلا شخص کبھی رہتا ہے کبھی نہیں رہتا۔ جب کوئی باطنی نعمتوں اللہ کی چھپی ہوئی مہربانیوں پر نظر لگائے رہتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے۔ کبھی منقطع نہیں ہوتی کٹ نہیں جاتی۔ یہ سب کچھ صحیح لیکن نعمت کا طالب اور نعمت دینے والے کی طلب رکھنے والا اور ہوتا ہے نعمت کے زیادہ ہونے کی خوشی، خرمی۔ ضرور ہوتی ہے لیکن منعم کے ساتھ نسبت قائم ہو جانا، نہایت بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام ہے۔ خوشی و فرحت و لذت جو منعم کی ذات سے حاصل ہوتی ہے وہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قل بفضل الله و برحمته فليفرحوا (کہد یجئے اللہ کے فضل و رحمت سے شاداں و فرحاں ہو جاؤ) سالکوں اور طالبوں کے عام حال کا بیان ہے لیکن محبوبوں کے سرور کا حال اور محبوں کے سلطان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو حال اور ہی ہے

اسی لئے فلیفرحوا فرمایا فلیفرح نہیں فرمایا یعنی فرمانا یہ ہے کہ اگر کسی کی خوشی ہماری نعمت رحمت اور ہمارے فضل سے ہے تو اے میرے خاص محب اے میرے محبوب خاص آپ کی خوشی نعمت وفضل کی مجھ سے ہونی چاہیئے نہ کہ میری نعمت سے کہ میں میں ہوں۔ نعمت نعمت ہے۔ نعمت مجھ سے ہے۔ جب میں تمہارا ہوں تو تمہارے لئے نعمت بے گنتی ہے بے شمار ہے جہاں اور جس مرتبہ میں میں ہوں وہاں عدد و شمار کی گنجائش ہی نہیں ساری گنتی اور اعداد اس میں مندرج ہیں۔ خدا تعالیٰ بے مثل اور بے مانند ہے ایک ہے ہم کو گنتی عدد، پراگندہ شماری، پریشان کرداری سے جدا کر دے۔ یکتا بنا دے۔ جلوہ جمال وحدت سے یک دل و یک روح ایک کر دے۔

وصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (بیالیسواں مکتوب)

مکتوب (۴۷)

دعا۔ قال۔ حال۔ استعداد

اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

سعادت و برکات کے حصول کے لئے تمام حالات میں آپ کے لئے دعا کی جاتی ہے خصوصاً فتح و نصرت اور اپنے وطن کو لوٹ آنے کی اور وہ خیر و برکت جو آجکل آپ کی مطمح نظر اور آپ کے ارادہ کی شامل ہے اس کی لئے رات دن کے اوقات و احوال میں دعا کی جارہی ہے۔ اس کے فوری قبول نہ ہونے سے شرمندگی ہورہی ہے۔ جلد قبول نہ ہونے کا شاید یہ سبب ہو کہ پروردگار نے ہر چیز کا وقت مقرر و معین مقدر کر دیا ہے جب تک

وہ نہ آجائے ہر کام کی جو نوبت ہے وہ پوری نہ ہو جائے' دعا کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ کسی دوست کی مدد کام نہیں دیتی۔ اس سے کہیں یہ بات ذہن میں نہ آجائے کہ جب تقدیر ہے تو پھر دعا کس کام کی اور کس لئے کی جائے۔ اگر تقدیر میں ہونا ہے تو ہو کر ہی رہے گا' دعا کریں یا نہ کریں۔ اگر تقدیر میں یہ ہو کہ اگر دعا کرے تو یہ کام ہوگا اور اگر دعا سے کام نکلنا ہے تو دعا ہو ہی جائے گی۔ کام نکل ہی جائیگا۔ اس میں آدمی کا کیا دخل۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کام کا نکلنا دعا پر منحصر رکھا گیا ہو تقدیر میں یہ ہو کہ اگر آدمی دعا کرے گا تو ہم قبول کریں گے وہ چیز اس کو دیں گے دعا کو سبب اجابت فرمایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تقدیر عالم اسباب کی منافی نہیں (ضد و نقیض نہیں) اس کی نفی کرنے والی نہیں۔ عالم میں جس قدر اسباب وجود میں آتے' مسببات پیدا ہوتے ہیں' یہ سب تقدیر الٰہی ہی ہے۔ اسی سے ہوتے رہتے ہیں۔ آگ جو جلاتی ہے۔ وہ اس کی تقدیر کے بغیر نہیں جلاتی۔ اللہ تعالیٰ نے آگ کو جلانے کا سبب بنایا تقدیر سب کو شامل ہے کی "تحقیق" بندہ کے اختیار کے ثابت ہونے پر ہے جس سے اس کی مطابقت تقدیر کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ اس میں گفتگو بہت ہوئی ہے بے انتہا بحثیں پیدا کی گئی ہیں حوصلۂ ایمان کو یہ دھواں دھار اور تاریک بنا دیتی ہیں۔ بعض رسالوں میں ہم نے اس کو لکھا ہے اس کے سمجھانے کی ممکنہ کوشش کی ہے ہمارا کہنا اب اسی قدر ہے کہ ہمیں ان باتوں سے کیا کام۔ ہمیں تو ایمان لانا لازم ہے جو کچھ کرنے کے لئے کہا گیا وہ کرنا جس کی خبر دی گئی ہے اس کو سچ ماننا ہے کہ وہ ایسا ہی ہوگا۔ اگر ایمان کو اسی پر موقوف رکھیں کہ جو ہماری سمجھ (فہم) میں آجائے' ہماری معقول (عقل کا علم) میں برابر اتر جائے ہم اس پر ایمان لائیں گے تو واہ رے ایمان واہ ری عقل۔ ایمان لے آ۔ سب کچھ تیری

سمجھ میں تیری معقولات میں آجائے گا اور تیرے دل میں پورا نقش ایسا بیٹھ جائے گا کہ پھر نہ مٹ سکے گا کسی کا مقولہ ہے کہ وہ میرے اندر سے باہر نہیں جاتا کیونکہ میرے دروں (اندر) و بروں (باہر) کو لے لیا ہے۔

سچ پوچھو تو ایمان تصدیق و اقرار ہے۔ بحث و مباحثہ نہیں اگر فرمایا جائے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے پیدا کرنے سے ہماری تقدیر پر ہمارے ٹھہرا دینے سے ہوتا ہے تو ہم عرض کریں گے۔ بجا درست۔ ہم ایمان لائے ہم نے سچ جانا۔ اگر فرمائیں جو کچھ ہے وہ تمہارے بُرے کرتوت سے ہے سب کچھ تمہارے اچھے کردار پر منحصر ہے تو ہم عرض کریں گے کہ ہم نے مان لیا سچ ہے۔ یہ سب ہم ہی کرتے ہیں اور ہم سے ہیں۔ اگر یہ فرمائیں کہ نیکی ہم سے بدی تم سے، ہم عرض کریں گے ٹھیک ہے سب نیکیاں تیرے ہی لئے تیرے ہی اختیار میں ہیں بُرائی تیری طرف نہیں لوٹتی۔ بندگی یہی ہے اسی کو بندگی کہتے ہیں۔ اصلی ایمان یہی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ نادانی و جہالت و جنون ہے ؎

مزن ز چون و چرا دم کہ بندہ مقبل　　قبول کرد بجان ہر سخن کہ جاناں گفت

(کیسا۔ کیوں نہ کہہ کیونکہ قبول کیا گیا ہوا بندہ۔ جو بات جاناں کہے اس کو جان سے قبول کرتا ہے)

اگر کسی کو یہ بات سمجھا دیں۔ اس راز کی حقیقت سے مطلع کردیں تو وہ فضل اور وہ مرتبہ دوسرا ہی ہے کہ خود بدولت فرماتے ہیں کہ یہ راز اس دنیا میں کسی پر نہیں کھلتا۔ پردے جب اٹھ جائیں گے سب کچھ دیکھنے میں آجائے گا۔ حقیقت کھل جائے گی معلوم ہو جائے گا کہ معاملہ کیا ہے۔ بات کیا ہے ؎

ہست از پس پردہ گفتگوے من و تو　　چون پردہ برافتد تو مانی و نہ من۔

(پردے کے پیچھے سے یہ ساری۔ میں اور تو کی گفتگو ہے۔ جب پردہ اُٹھ جائے تو نہ تو رہے گا نہ میں رہوں گا۔)

لمن الملک الیوم للّٰہ الواحد القہار (آج کے دن کس کی حکومت ہے۔ اللہ ہی کی ہے۔ جو ایک ہے باضابطہ حاکم ہے) اس دنیا میں اسی قدر فہم اور اتنی ہی عقل کافی ہے۔ احکام شرع امر نہی (کرنے نہ کرنے) کو سمجھ جائیں۔ حسبہٗ کام کریں۔ خاموش بیٹھے رہیں۔ دعا کرنی چاہیئے اور اس کے قبول ہونے کی امید رکھنی چاہیئے۔ کہ یہ اس کا حکم ہے اس کے سچے وعدہ پر امید رکھنی ضروری ہے کہ وہ فرماتا ہے۔ اسئلوا اللّٰہ مِنْ فَضْلِہٖ وَادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرُوْنَ (اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو۔ اور مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ جو لوگ ہماری عبادت سے ضد کرتے ہیں۔ عنقریب ہم ان کو جہنم میں داخل کریں گے۔ ذلیل و رسوا کریں گے) یہاں عبادت سے مراد دعا ہے۔ ایسا طالب جس کو عبادت میں انہماک شغف نصیب ہو گیا ہے اس پر تعجب آتا ہے کہ اس سے نعمت دینے والا مولیٰ وکریم اتنی تاکید سے ایسے مبالغہ سے کہہ رہا ہے کہ مانگ، طلب کر۔ چاہ جو کچھ تو طلب کرے گا، چاہے گا، وہ میں دوں گا اس کے باوجود بھی وہ صبر کرے کچھ نہ مانگے، بحث و گفتگو کرنے لگ جائے بے بلائے بھیک مانگنے والے کریموں کے دروازہ پر بھیڑ لگا دیتے ہیں دھوم مچا دیتے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بلانے اور حکم کرنے کے بعد کوئی کیسے صبر کر سکتا ہے ؎

چیست ادعونی کدام است اسئلوا   گر نمی خواھد گدایان را غلو

(مجھ سے دعا کرو اور مجھ سے مانگو کیا ہے۔ کیا مانگنے والوں کی اودھم نہیں چاہتا)

آہ و نالہ بر درش چنداں کنم   تا بخود آں غنچہ را خنداں کنم

(اس کے دروازہ پر اتنا روؤں چلاؤں کہ اس کو خود بخود ہنسا دوں)

از دعا نبود مراد عاشقاں   جز سخن گفتن باں شیریں دہاں

(عاشقوں کی مراد دعا کرنے سے صرف یہ ہوتی ہو اس میٹھے منہ سے باتیں کرلینا)

گر اجابت کرد شاں فہو المراد   ورنہ با دیدار نقد آیند شاد

(اگر وہ اس نے قبول کرلیا تو مراد مل گئی۔ ورنہ اسکی صورت ہی کو دیکھکر خوش واپس آتے ہیں۔)

ور کند رد لذت آں بیشتر   بہر تقریب سخن بار دگر

(اگر واپس کردے تو یہ لذت اور بھی ہے۔ کہ دوسری دفعہ بات کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔)

انبیاء علیہم السلام۔ اولیا رحمتہ اللہ علیہ اور جتنے بڑے بڑے بزرگ گذرے ہیں، سبھوں نے دعا کی ہے اور ان کے پیروی کرنے والوں کا بھی یہی طریقہ رہا۔ وہ دعا کرتے دعا ہی میں رہتے ہیں۔ حضرت سرور انبیاء و اولیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہر وقت ہر حال میں، کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے، اُٹھتے، بیٹھتے سفر، حضر، غم، خوشی میں دعائیں کیا کرتے تھے۔ ہر کام کے لئے خاص دعا کرتے تھے۔ محدثین جو دین کی وضع اور طریقہ کے نگہبان آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے افعال و اقوال کے منضبط کرنے والے ہیں انھوں نے ایک اصول کے تحت ان سب کو جمع اور منضبط (ایک جا با قاعدہ طور سے جمع) کرلیا ہے۔ اس میں اس کو دیکھنا چاہیئے۔

ہاں یہ بات اور ہے، کسی پر ذکر چھا جائے غلبہ پا جائے غلبہ کی وجہ سے

دعا کرنے کا موقعہ ہاتھ نہ آئے۔ اس طرح کی فرصت ہی اس کو نہ ہو تو وہ حالت اور ہے اس کی حقیقت پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی دعا ہی ہے۔ مانگنا اور طلب کرنا ہی ہے۔ لیکن سوال و دعا سے بالاتر ضرور ہے مقصد کے حاصل ہونے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ مانگنا نہیں تو اور کیا ہے ہاں اور ہی طرح کا ضرور ہے۔ نرالا ہے۔ مَنْ شغله ذكري عن مسئلتي اعطيته افضل ما اعطي السائلين ۵ (جنھیں میرے ذکر نے مجھ سے مانگنے سے باز رکھا ہیں اُنھیں مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں) قرآن عظیم سب سے بالاتر اور سب سے بلند تر ہے۔ قرآن جس کو ذکر سے روک رکھے میں اس کو ذکر کرنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں۔ ذکر خود قرآن کا جزو انوار کی روشنی ہے۔ مشائخین کا ایک ہی ذکر کو اختیار کر لینا مریدوں کو ایک ہی ذکر کے کرنے کا حکم دینا اس پر کاربند رکھنے کا سبب یہ ہے کہ توحید کا ایک راز جو آدمی کے دل میں چھپا ہوا ہے ذکر جس کو اُبھار کر باہر لے آتا ہے چقماق روئی اور پتھر سے جتنی جلد آگ پیدا ہوتی ہے اتنی ہی جلد ناپید بھی ہو جاتی ہے۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس اللہ روحہٗ فرماتے ہیں کہ ذکر سے توحید کا نقش دل میں جلد آجاتا اور جلد چلا جاتا ہے۔ جو کچھ دل میں تلاوت قرآن کی کثرت سے بیٹھ جاتا ہے وہ اگرچہ کہ دیر سے وجود میں آتا ہے لیکن دیرپا نہایت با اثر اور بہت ہی بڑے مرتبہ کا ہوتا ہے جب یہ حال میسر ہو جاتا ہے تو خاموشی زبان حال ہو جاتی ہے۔ حضرت کریم وہاب عم نوالہٗ کے سامنے اس کی بارگاہ میں عاجزی خاکساری فقر و نامرادی کے اظہار کے ساتھ کھڑے ہو جانا، زبان سے ادا کیا جانے سے بہت بلند ہے۔ کیا معلوم بندہ کی ناقص زبان سے کیا نکلے بندہ کیا کیا عرض کر سکتا۔

کیا کیا مانگنا اس سے ہو سکتا ہے۔ وہ وہی پائے گا جو اس کی ہمت و حوصلہ میں سمائے۔ بخلاف اس کے سکوت کی صورت میں ہر کام علم الٰہی کے سپرد ہو جاتا ہے چونکہ اس کا وجود نامتناہی علم لانہایت ہے۔ علم الٰہی بندہ کی حقیقت کا محیط ہو کر اس کو اپنے میں ایک ایسی جگہ پہنچا دیتا ہے جہاں ہزاروں دعائیں نہیں پہنچا سکتیں۔ بندے کے چار صفات۔ مفلسی، لاچاری، خواری ضعف اور پروردگار کے بھی چار صفات۔ غنا، قدرت، عزت، قوت۔ اہل معرفت کے نزدیک بندے کے صفات خدا کے صفات کے آئینے ہیں۔ یعنی جب بندہ صفات حق سے ثابت و متحقق ہو جاتا ہے تو صفاتِ الٰہی کے انوار و آثار بندے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب بندہ ان چار آئینوں کو چار طرف سے لگا کر جنابِ کبریا کے سامنے کھڑا ہو جائے تو صفات حق کے انوار کا عکس و پرتو اس میں چمک جانے سے وہ اندھیرا روشنی سے طبدل ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی ایسی نہیں ہوتی کہ خدا کے صفات بندہ کے صفات کے بجائے ہو جاتے ہوں۔ بلکہ بات یہ ہوتی ہے بندہ صفاتِ حق سے متصف ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کے صفات اس کی ذاتِ مقدس سے ہرگز جدا یا منتقل نہیں ہوتے۔ دوسری جگہ حلول نہیں کرتے بلکہ ان کا سایہ اور پرتو اس پر پڑتا ہے باطن سے سیاہی دُھل جاتی ہے، زنگ دور ہو جاتا، گھس گھسا کر اڑا جاتا ہے۔ زبان استعداد سے جو دعا کی جاتی ہے وہاں بندے کی زبان قال تو کجا زبان حال کا بھی دخل نہیں۔ اس دعا اور سوال کو زبان حال کہیں یا ٹھہرائیں تو ہو سکتا ہے۔ مگر ہم تو زبان حال اس کو سمجھتے ہیں کہ بندہ زبان کو بند کرے۔ بارگاہِ جود و سخا میں بخشنے والی عطا کرنے والی ہے اپنے عجز اور فقیری کا حال دکھلاتا رہے، زبان حال

سے وہی کہتا رہے، جو زبان قال سے کہنے کے لائق ہو تو یہ بھی ٹھیک و مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ استعداد کا مرتبہ اس سے بالاتر ہے۔ حال اور استعداد بندہ کے صفات نہیں۔ ایسے مرتبہ میں سوال و طلب جس کا بندہ کے اختیار سے تعلق ہے وہ قطعاً یہاں نہیں۔ استعداد جس کو اصطلاحات حکمت میں رجوع ہونے، نیک کام کرنے کی صلاحیت قابلیت کہتے ہیں، لوگ جس کو عام طور سے نصیبہ طالع، اور شرع کی زبان میں اس کو قسمت یعنی جو کچھ کسی کے نصیبہ میں رکھدیے ہیں اس استعداد سے بندہ کمال حاصل کرتا اور خاص مقامات تک رسائی کرتا ہے، جس دعا کو متحتم الاجابت (قبول ہونے والی دعا) کہتے ہیں وہ بھی تو دعا ہی ہے کہ استعداد کی زبان سے ادا ہوتی اور کی جاتی ہے کیونکہ تقدیر اسی طرح جاری ہے کہ جس کو جو نصیبہ دیا گیا وہ اس کو وہیں پہنچایا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم کفالت و ضمانت کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ چاہے نہ چاہے، مانگے یا نہ مانگے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں ہے جس کے رزق کا ضامن و کفیل اللہ نہ ہو) فرمایا۔ اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ درگاہِ صمدیت حق میں آدمی خود سراپا طلب و سوال ہے۔ طلب نہ کرے تو کیا کرے۔ کہاں جائے کس سے طلب کرے۔ وھو ربّ العٰلمین (اور وہ دونوں جہاں کا پروردگار پالنے والا ہے) اس سے مانگیں تو کیا مانگیں۔ ہاں اس قدر سمجھ میں ضرور آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاس ساری چیزوں میں سے جو چیز زیادہ عزیز ہو، بہت پیاری ہو، وہی مانگنا چاہیئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ سارے رسولوں کے سردار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا عباس

بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے کہا اے چچا کیا تم وہ چیز نہیں چاہتے جو خدا تعالیٰ چاہتا ہے سُنیئے اللہ کو یہ بات بہت عزیز اور پسند ہے کہ بندہ اس سے عافیت مانگا کرے مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ سے عافیت مانگنی بہترین چیز ہے۔ وہی اس سے مانگا کریں۔ خدا کی پسندیدہ اور اس کی محبوب کی فرمائی چیز کا اس سے مانگنا ضروری ہے۔ عافیت کا مانگنا ظاہرا عام طور سے معمولی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ عافیت کے معنی تندرستی اور اعضا و قویٰ میں طاقت کا برقرار رہنا سمجھتے ہیں۔ لیکن خاص حضرات مخصوص خصوصیت رکھنے والوں کے نزدیک اس کا مفہوم بہت ہی بڑا اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ظاہری باطنی ساری نعمتوں کو لئے ہوئے ہے۔ اور حقیقت میں یہ حدیث مخصوص کلام عالی ہے اور انتہائی بلیغ اور معجزہ محمدیہ ہے علیہ من الصلوٰۃ افضلها و من التحیات اکملها۔ خاص حضرات اور اہل خصوصیت رکھنے والوں کے نزدیک عافیت کے معنی تمام آفات سے سلامتی۔ دنیا اور آخرت کی کوتاہیوں نقصانات سے بچاؤ کا نام ہے۔ آپ ہی کہیئے کہ اس سے زیادہ کارآمد اور بہترین چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ اہل اللہ کے نزدیک عافیت سے مراد دل کا سکون اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو جانا ہے۔ دل جس بات سے خدا کے ساتھ آرام پا جائے جمع ہو جائے وہی بہتر ہے۔ عافیت سے سکون دل، جمعیت خاطر میسر آ جاتی ہے۔ عافیت ہی سرچشمہ ہے۔ عام لوگوں کے لئے دل کا آرام جمعیت خاطر، تندرستی، مال دولت، بال بچے، لذت، خواہش کے پورے ہونے میں ہوا کرتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ یہ چیزیں یہ باتیں انھیں ملیں یا نہ ملیں ان کا حال یکساں رہتا ہے۔ ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تغیر ان کے حال میں پیدا نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ سے جو نسبت انھیں ہوتی

ہے یا وہ رکھتے ہیں اس میں کوئی خلل یا فتور نہیں آتا۔حق وحقانیت کے دائرے سے باہر نہیں ہوتے۔ ان حضرات کا ایک طرح اور ایک حال پر رہنے کا مذکور ہم نے بعض مکتوب میں بعنوان صبر و رضا کافی طور سے کردیا ہے یہ بات جو ہم نے لکھی ہے کہ ان کی نسبت میں خلل و فتور نہیں آتا' حق ان کے ہاتھ سے نہیں جاتا' اس کا بھی بیان اختصار و تفصیل کے ساتھ بعض مکتوب میں کیا جاچکا ہے۔ خدائےتعالیٰ مہربان بخشنے والا ہے۔ وہی سارے احوال میں' ظاہر و باطن میں' اور سارے اوقات میں ہمیں عافیت نصیب کرے اور حسیّ اور عقلی نعمتوں کو اور زیادہ عطا فرمائے اور ساری مشکلیں آسان کردے اور سب کاموں کا انجام خیر کے ساتھ ہوجائے۔ آمین۔

(تینتالیسواں مکتوب)

مکتوب (۲۸)

راحت قِدم میں یا عدم میں

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

احوال کیا لکھیں۔ اس ضعیف جان کے لئے غم و رنج ایسے لگا دئے کہ خوشی خرمی اس کے آس پاس پھٹک تک نہیں سکتی' مجال ہی نہیں رکھتی۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کو کس طرح حاصل کروں۔ کیا علاج کروں بات ایسی نہیں۔ اس کا علاج سمجھ گیا اس کا نسخہ اس کی ترکیب ہاتھ آگئی' لیکن اس کے بنانے' کام میں لانے سے عاجز آگیا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے لئے دنیا میں محنت و گرفتاری ہے اس کے لئے خوشی اور آزادی کہاں۔ یہ جگہ

ایسی چیزوں کی نہیں ہاں خوشی آزادی اگر ہوگی تو نیستی و نامرادی میں ہوگی کہ جس مرتبہ میں کوئی ارادہ، کوئی آرزو نہیں ہوتی۔ یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک بندہ میں ارادہ باقی ہے وہ اپنے آپ میں پھنسا ہوا۔ رنج و غم میں گرفتار ہمیشہ تکلیف میں ہے۔ ایک مستقل آزار اس کو لگا ہوا ہے جب تک وہ ارادہ مراد سے متعلق ہے یہی پیچ و تاب ہے۔ مراد کا ہاتھ آنا محال ہے۔ حقیقتاً مبالغہ ہی مبالغہ ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ پانے کا ارادہ، وصال و قرب کی آرزو تک نہیں رہتی۔ نیستی و نامرادی کہ جس کو ترک و نفی بھی کہتے ہیں، جس میں سب کی نفی کردی جاتی ہے، جہاں کوئی مراد نہیں رہتی وہاں ارادہ کا کیا پتہ۔ یہ جو کہا گیا کہ "میں یہ چاہتا ہوں کہ میری چاہت ہی نہ ہو"۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ جس نے یہ بات نہ سمجھی اس نے یہ کہا کہ چاہت ارادہ نہ ہونے کا ارادہ کرنا، بھی تو ارادہ ہی ہے جس کو ہم نے اپنے مکتوب ترک تدبیر و اختیار میں نہایت تفصیل کے ساتھ واضح مثالوں سے سمجھا دیا ہے وہاں دیکھ لیں۔

مختصر یہ کہ بندہ بنے رہنا بندگی میں آجانا کسی کی مرضی و خوشی پر زندگی بسر کرنا، اپنے آپ کو بالکل خالی کر دینا، کچھ نہ رہنا، بہت مشکل سخت و شوار کام ہونے ہی سے لا راحۃ الا فی القدم او بعدم (کہیں راحت نہیں مگر قدم یا عدم میں) کہا گیا ہے۔ عدم سے مراد وہ حالت ہے جو وجود میں آنے سے پہلے رکھتا تھا۔ دائرہ وجود میں آنے کے بعد اس وجود کی بندشوں، اس کی روش، اس کے احکام و آثار کا پابند ہونا پڑا اس دنیا میں یا آنے والے عالم میں کیا عدم کی صورت دیکھ نہ پائے گا۔ اور اپنے وطن اصلی کو جو پچھلا عدم ہے لوٹ کر نہیں جائے گا۔ ؏

بصحرائے عدم خوش خفتہ بودم   مرا با نیستیٔ خویش خوش بود

(عدم کے جنگل میں مزے سے سو رہا تھا۔ میں اپنی نیستی میں مگن تھا۔)

ازاں خواب خوشم بیدار کردی   ندانم تا ترا زیں چیست مقصود

(اس اچھے خواب سے مجھکو جگا دیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس سے تیرا مقصود کیا ہے)۔

اے میرے عزیز۔ وجود کے احکام کا زور غلبہ، قدرت کے سلطان کی سطوت ایسی اور اس حد تک ہے کہ اعدام (نیست نفی۔ منع) کرنے والے فقیروں کو بھی آرام نہیں۔ وہ ہمیشہ جوش وخروش میں ہیں۔ وقت کے منتظر ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہوئے ہیں کہ کب حکم پہنچتا ہے کہ وہ حضرت وجود میں حاضر آجائیں۔ یہ ساری بلائیں عالم امکان (دنیا۔ ہوسکنے۔ ممکن ہونے) کے بھید راز ہیں حقیقی راحت ٹھیک آرام، مرتبہ امتناع (ہونے نہ ہونے) میں بھی نہیں کہ یہ خود ممتنع۔ ہے ممتنع الوجود وہ ہے کہ وجود کی آرزو ہی نہیں رکھتا۔ وجود کی آفت کا وہاں دخل ہی نہیں۔ اس کے پہنچنے کا وہاں کوئی راستہ ہی نہیں جو وجود کا منہ تک نہیں دیکھتا، وہ یہی ہے یہ جو کہا گیا ہے کہ عدم کو ایسا غلبہ دیں کہ کوئی وجود ہی نہ رہے یہ عدم کی طلب ہے نفی کی طلب ناممکن آرزو محال خواہش ہے ایسی آرزو جو محال ہے اسی کی مجھ کو خواہش وآرزو ہے آرزو رکھنا خواہش کرنا عیب نہیں کہ نا امیدی کے بعد اس آرزو اس مرتبہ میں آیا نا مبارک ہے۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے ؎

خالقا تا ایں شکم در باطن است   راہ جانم سوئے تو نا ایمن است

(اے پروردگار جب تک یہ پیٹ پیچھے لگا ہوا ہے۔ میری جان کا راستہ تیری طرف خوف سے خالی نہیں۔)

یا بحکم شرع در کارش فگن یا بکلی در نمک سارش فگن
(یا شرع کے حکم کے لحاظ سے اس کو کام میں لگا ۔ یا پورے طور سے اس کو نمک کی کان میں ڈال دے۔)

یہ عدم اور فنا کا اشارہ، جس کا پتہ درویش بتلاتے اور اس کا دارومدار تین فنا پر رکھتے ہیں یوں ہیں ۔ (۱) فنائے مخلوق یعنی ان کا وجود وعدم، مدح و ذم، دینا نہ دینا، سب برابر ہو جائے ۔ (۲) فنائے نفس یعنی نفس کی آرزو و خواہش سے نکل جانا ظاہر و باطن میں امر و نہی کا تابع ہو جانا، اسی لئے یہ کہا گیا کہ لا یومن احدکم حتی تکون ھواہ تبعا لما جئت بہ (۳) فنائے ارادہ یعنی کوئی ارادہ کوئی آرزو باطن میں نہ رہے حق کے فعل اور اس کے ارادہ کے شہود کے سوائے کچھ نہ رہے حقیقت میں فنا سے مراد احکام بشریت کی فنا اور نفسانیت کے شعلہ کا بجھ جانا ہے ۔ جس کے لئے ابتدا ہی سے شرع کے حکم پر کاربند رہنا ضروری ہے ۔ جب تک شرع کے حکم کے پابند اس پر کاربند نہ ہو جائیں اپنا ارادہ اپنی آرزو نہیں جاتی ۔ بشریت کے لوازم اس کے احکام فنا نہیں ہوتے ہمارا ایمان ہے کہ بہت ساروں کو یہ فنا ملی اور بہت سارے یہ حال رکھتے ہیں ۔ ہم حیران ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس تک پہنچنے کا راستہ کیونکر کیسے پہچانا جا سکتا ہے ۔ اس کے مل جانے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کو ہم سمجھے، اس کے لئے جس قدر کوشش ممکن تھی کی گئی آخرش ہمیں اس نسبت کا مل جانا اس کا مکمل ہو جانا ناممکنات و محالات سے معلوم ہوا ۔ نا امیدی غالب ہو گئی ۔ لیکن اس نا امیدی کے غلبہ میں بھی ہم نا اُمید بیٹھے نہ رہے اس امید میں کام کرتے رہے کہ حق تعالیٰ کا فضل ہی خود کوئی کام کرلے گا ۔ آج

نہیں کل تو ضرور کرے گا۔ اگر کل نہ ہوا تو پرسوں تو ضرور ہوگا۔ کل سے مراد قیامت۔ پرسوں سے اَبد یعنی منتہائے زمانے میں تو امید ہے۔ حیات میں ممات میں۔ قیامت، حشر نشر میں۔ جنت میں داخل ہونے تک جس کی کوئی نہایت نہ ہو اس کو اَبد کہتے ہیں۔ اس نے طالب ہمیشہ امید داری اور امید ہی میں رہتا ہے۔ اس میں ناامیدی کہاں۔ "ہمارا درد ازلی ابدی ہے" جو کہتے ہیں وہ یہی ہے۔ امید کا دامن پکڑے ہوئے ڈرے سہمے ہوئے رہنا چاہیئے کہ کہیں یہ ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہ کر اس میں انتہائی کوشش کرنی چاہیئے رونا پلانا۔ عاجزی انکساری آہ واہ کے نعرے ہی لگانا ضروری ہے۔ دیکھیں کہ آخر میں کیا رونما اور کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ عاقبت بخیر ہے۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ (چوالیسواں مکتوب)

مکتوب ۲۹

مبدا و معاد۔ اصلاحِ نفس

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

دور پڑے ہوئے بندہ کا حسرت بھرا خط ہے جو دوری عین نیستی دفنا میں ہوتے ہوئے بھی ہستی میں گرفتار وجود میں گھرا ہوا ہے۔ تفرقہ تردد کے نقوش و نتائج سے ادھے راستہ ہی میں پریشان و حیران ہے۔ اس میں نہ تو اتنی قوت ہے کہ اپنی ہمت جوانمردی کے ساتھ اعلیٰ کی طرف اُڑ سکے عالم نور کی فضاء میں پہنچ جائے قید و بند کے عالم بلکہ ہستی کے قید سے چھوٹ کر وحدت وجمعیت کی خلوت میں آرام پا جائے یہ حوصلہ یہ صورت بھی نہیں کہ

پورے طور سے اسفل (نچلی) ہی کی طرف آجائے۔ دنیا کے جھگڑوں میں پھنس جائے۔ بھول و غفلت ہی میں گزران کرکے آسائش پا جائے۔ اس عالم کی لذّتوں سے فائدہ اٹھائے کہ اس غم و فکر، رنج، تکلیف تذبذب و تردد سے چھٹکارا مل جائے۔

نہ با تو دست ہوس در کمر تواں کردن ۔۔۔ نہ آرزوئے تو از دل بدر تواں کردن

(نہ تو ہوس کا ہاتھ تیری کمر میں ڈال سکتے ہیں۔ نہ تیری آرزو ہی کو دل سے نکال سکتے ہیں)

اے میرے عزیز۔ کارخانہ وجود کی توڑ پھوڑ دماغ کا ضعف بشریت کے حوصلہ کی تنگی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ تعلق کا تصور، ملنا جلنا، نفس کی ساتھ اور لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے اٹھنے بیٹھنے سے جی گھبراتا اور یہ کام بار معلوم ہوتا ہے۔ بشریت کے تقاضے فنا کی ناتمامی اور مقام تمکین تک نہ پہنچے۔ قضا و قدر کے غلبہ و زور و دباؤ کی وجہ سے تعلقات سے بچ بھی نہیں سکتے۔ حال یہ ہے کہ لا یموت ولا یحییٰ (نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے) ادھ موا پڑا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی مشکل نہیں۔ کیا معلوم کیونکر اور کیسے آسان ہو اور اس کھینچ تان سے کب نکل سکے۔

زیں گونہ کز قضا و قدر در کشاکشم ۔۔۔ در حیرتم کہ کار من آخر کجا کشد

(قضا و قدر سے اس قدر کھینچ تان میں ہوں۔ حیرت میں ہوں کہ میرے کام کا نتیجہ کیا اور کہاں پہنچے گا۔)

ایک سابقہ (وہ امر جو پہلے سے کسی کام کے سرانجام کا وسیلہ ہو) ہے جس کی شاخ خاتمہ (انتہا۔ انجام) ہے اسی پر نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ ابد کا رنج ابد کی خوشی، دونوں یہیں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر رنج کی طرف جائیں تو خوشی کی صورت کبھی نہیں دیکھتے۔ اگر خوشی کی طرف آئیں بے فکر ہو کر بیٹھ جائیں تو ہر قسم کے رنج سے چھوٹ جاتے ہیں۔ درآنحالیکہ رنج و خوشی۔ امید

وخوف ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ آخر میں کون ٹک جائے گا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ سعادت کی نشانی یہ ہے کہ جیتے جی رنج و خوف رہے جب آخری وقت آجائے تو خوشی اور امید منہ دکھلائے۔ آدمی کے نفس وطبیعت کے کارخانہ میں یہ بات یہ خاصیت ہے کہ وہ علم، سمجھ، ایمان ایقان کے ہوتے ہوئے بھی جب عمل کی نوبت آجاتی ہے تو وہ اس کام کے کرنے اس میں لگ جانے سے رہ جاتا ہے۔ نفس کی خواہش کے دباؤ میں جانے ہوئے کو نہ جانا ہوا کر دیتا ہے۔ جو کچھ یاد تھا وہ سب بھول ہی نہیں جاتا بلکہ بُھلا دیتا ہے ؎

چشم باز و گوش باز و ایں ذکا خیرہ ام در چشم بندی خدا

(دیکھتا ہے، سنتا ہے یہ عقلمند۔ حیران ہکا بکا ہوں خدا کے آنکھ بند کر دینے میں)

اے عجب چوں می نہ بیند روئے شاہ عالمے پُر ز آفتاب چاشت گاہ

(تعجب ہے کہ کیوں بادشاہ کا منہ نہیں دیکھتا۔ دنیا آفتاب سے روشن ہے چاشت کا وقت آگیا۔)

یہ فرض کریں کہ اگر کوئی دائرہ عمل میں بھی آگیا پھر بھی صدق واخلاص کی تحقیق اس کے اثبات میں رہ جاتا ہے۔ اگر اخلاص وصدق بھی ہاتھ آجائے تو دوسرے سیکڑوں خطرے راستے میں ہیں کہ المخلصون علیٰ خطر عظیم۔ (مخلص (بے کھوٹ) انتہائی خطرہ میں ہیں) بڑا پُرخطر راستہ سامنے ہے اس کو کیسے طے کریں کیونکر ختم کریں۔ اس راستہ کی سختی، اس کی برداشت کی سکت نہ ہونے کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

زراہ میکدہ یاران عنان بگردانید چراکہ حافظ ازیں راہ رفت و مفلس شد

(شراب خانہ کے راستہ سے اے دوستو پلٹ جاؤ۔ کیونکہ حافظ اس راستہ سے گیا اور مفلس ہو گیا)

یہ تکلیف و سختی، راستہ کی دشواری اس کے مشکلات جو کچھ ہیں وہ اگر آسان کردے تو اتنا دور دراز کا راستہ ایک ہی قدم میں طے ہو سکتا ہے

یک قدم بر نفس خود   آں دگر در کوئے دوست

(ایک پاؤں اپنے نفس پر رکھ اور دوسرا دوست کی گلی میں)

اس راستہ کا طور طریق یہ ہے کہ سختی نرمی، دشواری آسانی پہنچنے نہ پہنچنے، دیکھنے نہ دیکھنے، سب سے آنکھ بند کر لینا، کام کرتے رہنا راتوں رات چلنا ہے۔ جب صبح ہو جائے گی تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ کہاں پہنچے۔ لیکن اپنی روش و رفتار اپنے اختیار کئے ہوئے کے بل بوتے یہ راستہ طے ہونا اس درگاہ میں پہنچنا بہت دشوار ہے کیونکہ جو تیری گلی میں جاتا ہے وہ اپنے پاؤں سے نہیں بلکہ تیرے پاؤں سے چلتا ہے۔ توفیق تیسر (ہمت بخشی و دستگیری) پر نظر کرتے ہیں تو بات کہیں اور پہنچ جاتی ہے اگر جبر و اختیار کے سوچ بچار کی بھنور میں آجاتے ہیں تو کہیں اور بہہ جاتے، چکر کھاتے بھٹکتے رہتے ہیں جب بات کی ہیر پھیر میں آجاتے ہیں تو ایسے ہو جاتے ہیں ——— جیسے کہ ربط و ضبط سے باہر آئے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی سے وہ مقصد سے زیادہ دور ہوتے جاتے ہیں اس لئے اس مسئلہ سے انجان اور لاپرواہ ہو جانا ہی زیادہ مناسب اور زبان کا بند کر لینا ہی بہتر ہے۔ بہرحال امر و نہی کے پابند ہو جانا لازمی ضروری اور بندہ بنا رہنا اپنے کام میں لگے رہنا چاہئے اس میں کچھ شک نہیں کہ "شریعت" کچھ کرنا کچھ نہ کرنا ہے۔ دینداری یہ ہے کہ جو کچھ کرنے کے لئے کہا گیا وہ کرنا اور نہ کرنے کے لئے جو کچھ کہا گیا ہے وہ نہ کرنا آدمی کو سمجھ دی گئی ہے۔ کام میں کام بات میں بات نکالنے کی قوت عطا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور حالت بھی اس میں پائی جاتی ہے جس

سے وہ ایک کام کر سکتا ہے اور ایک کام چھوڑ سکتا ہے اپنے آپ میں کرنے نہ کرنے کی صلاحیت کیفیت و حالت رکھتا ہے۔ ایک کام پر دوسرے کام کو ترجیح دے سکتا ہے ایک بات نکال سکتا ہے جب ایسا ہے تو پھر توقف کیوں اور بحث و حجت کس بات کی۔ جب کہ وہ کام ان باتوں کے کھلنے نہ کھلنے پر موقوف نہیں، خود بدولت یہ فرما چکے ہیں کہ اس ابھار اس نشو و نما میں اس کا کھلنا ممکن نہیں نہ مصلحت بھی نہیں۔ جبتک اس رات کی صبح نہ ہو جائے کچھ نہیں ہوتا جمالِ الٰہی بے پردہ نظر نہیں آتا جب صبح آجائیگی تو ہر چیز کھل جائیگی کسی پردہ و روک کے بغیر جمالِ الٰہی دکھنے میں آجائیگا کہ جو کچھ بھی ہے وہ اس کے پرتو سے روشن ہے۔ روشن ہوتا ہے

آں مہ چو نقاب از رخ خود بکشاید   بے پردہ بہ بام خانہ بالا آید

(وہ چاند جب برقعہ سے منہ نکالتا ہے تو بغیر کسی پردہ کے بالاخانہ پر آتا ہے)

ہر سر کہ بہ تاریکی شب پنہاں بود   در پرتوِ روئے تو عیاں بنماید

(وہ سب چھپی ہوئی باتیں جو رات کی اندھیری ہی میں ڈھکی چھپی تھیں۔ تیرے چہرے کے سایہ سے وہ کھلی دکھنے لگ جائیں گی)

اگر کچھ کرنا مقصود ہے تو اس سے زیادہ سیدھا کوئی اور راستہ نہیں اگر حیلے حوالے کرنا بہانے بنانا زبردستی کی حجتیں کرنا ہے تو وہ اور بات ہے
للّٰهُ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطَ الْمُسْتَقِیْمِ (اللہ میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا اور سچا راستہ ہے) آج بہت سارے ایسے ہیں کہ غفلت کا پردہ انھوں نے اپنے سامنے چھوڑ رکھے ہیں۔ اس میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نفس، دنیا، خلق میں گرفتار ہیں انھیں کچھ خبر نہیں۔ وہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ جب غبار چھٹ جائے گا تو معلوم ہوگا کہ سواری [illegible] گدھا ہے۔

اس کام میں اس وقت تک تو ٹھہرے رہیں کہ سامنے سے پردہ اُٹھ جائے وہ نظر آجائے۔ یا دو ہے کہ آج جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ کل سب پر کھل جائے گا۔

سلوک کے جملہ کارخانہ کی بنیاد فنا پر رکھی گئی ہے پہلی فنا لوگوں سے، وہ یہ کہ نفع نقصان، تعریف برائی ہونا نہ ہونا، ایک ہی دفعہ نظر سے گر جائے۔ دوسری نفس کی فنا یہ کہ ظاہر و باطن کے ساتھ فرمانبردار بندہ ہو جائے۔ شریعت کے بتائے ہوئے امور کا پابند رہے۔ تیسری فنا آرزو و خواہش کی وہ یہ کہ حق کی آرزو اس کی رضامندی کی طلب رہے اس کے دیدار کے شوق کے سوائے کوئی اور آرزو نہ رہے اس کی تفصیل اسی قدر ہے اور یہی فرمایا گیا ہے۔ اس کا اجمال و خلاصہ یہ کہ نفس کی فنا سب سے اہم کام ہے، نفس کی فنا جب ہاتھ آجاتی ہے تو ہر طرح کی فنا خود بخود مل جاتی ہے۔

سلطان العارفین بایزید بسطامی قدس سرہ العزیز جب بارگاہ میں پہنچے۔ سامنے کھڑے ہو گئے۔ نعرہ لگائے۔ رونے لگ گئے فریاد کی کہ کَیْفَ الطَّرِیْقُ اِلَیْكَ یارب (اے پروردگار تیری طرف آنے کا راستہ کیا ہے) تو جواب ملا۔ دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالْ (تو اپنے نفس کو چھوڑ اور آجا) یعنی نفس کو باہر چھوڑ دے اندر آجا۔ کوئی ایسا ہے بھی کہ وہ نفس کو چھوڑ دے چھوڑ سکے باہر سے اندر آسکے۔ نہیں نہیں۔ ہاں ہاں جب اس کی توفیق ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے ؎

نفس را ہفت صد سر است و ہر سرے　　　از فراز عرش تا تحت الثریٰ

(نفس کے سات سو سر ہیں اور ہر ایک سر۔ عرش کے اوپر سے زمین کے نچلے حصہ تک)

یہ سن لو کہ نفس کے چھوڑنے کے معنی اس کے صفات کا چھوڑنا ہے نفس کے صفات عجب (خود بینی) ریا (ظاہر داری دکھاوا) بغض حسد

کینہ، عداوت۔ ناز (بے دماغی۔ فخر) نخوت (تکبر، غرور) ہیں۔ یہ سب تاریکیاں ہیں جب تاریکی نکل جاتی ہے تو روشنی آجاتی ہے۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ (اللہ والی ہے ان کا جو ایمان لے آئے ان کو وہ اندھیریوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے) اس زمانے کے بگڑے ہوئے ناکارہ لوگ کہتے ہیں کہ "ہم نہیں ہیں وہی سب کچھ ہے"۔ حیرت کہ وہ سب کچھ کو توحید کہکر اس بہانہ سے حکم شرعی (امر و نہی۔ کرنے نہ کرنے) سے باہر نکل جاتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں طرہ یہ کہ خود کو درویش کہتے اور صوفی بتاتے ہیں ع

بدنام کنندہ نیکونامی چند

(رسوا کرنے والے چند نیک ناموں کے) سہ

سخن وحدت آنگہہ از عامی زاں چہ خیزد بغیر بدنامی

(وحدت کی باتیں وہ بھی عام آدمی کی۔ اس سے بدنامی کے سوائے اور کیا ہوسکتی)

اعاذنا اللہ عن ذالک (پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ سے ایسی باتوں اور ایسے کاموں سے) نفس کی فنا اگر ہاتھ نہ آئے تو کم از کم نفس سے راضی و خوش تو نہ رہیں کیونکہ ساری بدیوں کی جڑ بنیاد نفس کی مرضی اس کی خوشی پر چلنا ہے یہ کوئی سمجھداری نہیں اور فائدہ مندی نہیں بلکہ کوئی بے وقوفی اس سے بڑھکر نہیں۔ اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (ہر شخص ایک خیال اور ایک گمان میں ہے نفس کے فریب سے اپنے آپ سے۔ اچھی و مغرور ہے) عالم اپنے علم و عمل اور دولت مند اپنے مال و دولت اور درویش اپنے حقائق و معارف اور

زاھد اپنے زہد و ریاضت اور عابد اپنی عبادت وطاعت اور مالدار اپنی جود وسخا اور فقیر اپنے صبر و قناعت پر ۔ یہ سب باتیں اچھی اور پسندیدہ ہیں بشرطیکہ نفس کی آلایش (میل گندگی) سے پاک ہوں اگر یہ نہیں تو وہ دھندلے اندھیرے میں ہیں جو ایسی گندگی میں ہوں ان کے لئے قبولیت میں آجانا مشکل اور رسائی پانا ناممکن ہے ۔ یہ سب صحیح ۔ ہم اس کو مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی نیک عمل سے ہاتھ روکنا بیکار بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔ نفس کے اندھیرے کو عمل کی نورانیت سے خالی نہ رکھنا چاہیئے ۔ ممکن ہے کہ نور و ظلمت کے ملنے ایک دوسرے کے ہم مزاج ہونے سے ایک سایہ اور دو یہ نور ہو جائے یا کوئی اور درمیانی حالت وصورت وجود میں آجائے۔ بہرحال کام کرتے رہنا چاہیئے ۔ کیونکہ اگر نور کو غلبہ ہوگیا تو کام آسانی سے ہوجاتا ہے اگر عجب اور ریا سر نکالیں تو استغفار کرنا اور ان کے دور کرنے کی کوشش کرنا نفس سے مجاہدہ کرنا چاہیئے ۔ عمل کی مداومت اس میں استقامت آجانے سے ایک نور پیدا ہوتا ہے جس سے عمل کرنے والا صدق اخلاص میں آجاتا اور مخلص و مصدّق ہوکر کام میں لگ جاتا ہے ظلمت (اندھیرا) نور (روشنی) سے اور غیبت (دوری) حضور (سامنے) سے مبدل ہوجاتی ہے ۔ ؎

نفس رام تست ہرگہ نور بالا بر تو تافت — سایہ زیر پا بود ہر گہ کہ بر تارک خور است

(نفس تیرے قابو میں ہے جبکہ نور تجھ پر چمک گیا ۔ سایہ پاؤں کے نیچے ہوتا ہے جب آفتاب سر پر چمکتا ہے)۔

شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس اللہ روحہ سے سوال ہوا کہ ہم کیا کریں جب ہم عمل کرتے ہیں تو ریا (ظاہرداری) پیدا ہوجاتی ہے اگر کچھ نہیں کرتے ہیں تو بیکار بیٹھے رہنا پڑتا ہے اس کا آپ نے یہ جواب دیا کہ اعملوا استغفروا

(کام کرو۔ استغفار کرو) یعنی ریا کے دور ہونے کی دعا کیا کرو۔ عمل میں لگے رہو فرض اور واجب میں ریا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر نفس دخل پا جائے کوئی گھمنڈ یا ظاہرداری پیدا ہو جائے اپنی کرنی پر نظر ٹھہر جائے تو اس کے دور ہونے کے لئے توبہ استغفار لازمی چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ فرض و واجب امر کے تحت بجا لائے جاتے ہیں۔ فرض میں فرضیت اور واجب میں واجبیت ہے ایسی چیزوں سے ان میں کوئی تفاوت نہیں (ہوتا) جو کہا گیا وہی بات ہے۔ سچ ہے فرض اور واجب میں ریا کا دخل ہی نہیں۔ کرنا فرض ہے واجب ہے کر لیتے ہیں ؎

کارکن کار بگذر از گفتار — کاندریں راہ کار دارد کار

(کام کیا کرو۔ کام کیا کرو باتیں بنانا چھوڑ دو۔ اس راستہ میں کام ہی کام آتا ہے)

ع مزد آں گرفت جان برادر کہ کار کرد

(اے بھائی مزدوری اسی نے پائی جس نے کام کیا)

اس کارخانہ میں آدمی کو کام کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے کہا گیا ہے ——— کہ اس کا بدلہ دوسرے کارخانہ میں دیا جائے گا۔ جو یہاں بوئے گا وہ وہاں کاٹے گا۔ الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) ؎

از مذاہب مذہب دہقاں خوش است اے مولوی

مذہب دہقان چہ باشد ہرچہ کاری بدروی

(اے مولوی مذہبوں میں دہقان کا مذہب اچھا ہے۔ دہقان کا مذہب کیا ہے جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے)

دنیا میں ہر عمل کی ایک جزا ضرور ملتی ہے۔ آدمی میں برائی بھلائی اچھا

برا، خوشی رنج، تنگی کشادگی، جو کچھ بھی پائی جاتی ہے وہ اسی کے کردار کی پاداشں ہے۔ لیکن یہ لازمی نہیں کہ بدلہ یہیں مل جائے، دے دیا جائے۔ بدلہ پا بھی سکتے ہیں، نہیں بھی پا سکتے، دیکھ بھی سکتے ہیں، اور نہیں بھی دیکھ سکتے ہیں لیکن یقینی طور سے بدلہ وہاں ضرور پائیں گے اور دیکھیں گے۔ بہترین طلب صادقین کی مطلوب، عمل کا اور زیادہ ہونا، توفیق کے ملنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ حضرات سینہ کی کشادگی، سچی طلب، وقت میں گنجائش، باطن کی نورانیت، دل کی بیداری، شوق کی زیادتی، نیکیوں اور بھلائیوں کی بہتات ہردم ہر وقت حق جلّ وعلیٰ سے مانگتے رہتے ہیں۔ ان پر ان دروازوں کے کھلے رہنے کی درخواست کیا کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیشہ کھلے رہیں۔ اور ان کاموں کے کرنے کی توفیق جو ہمیشہ کی دولت وسعادت کے اسباب ہیں عطا کرنے کی دعائیں اور دن بدن کمالات حسی و روحانی کے زیادہ ہونے کی التجا درخواست کرتے رہتے ہیں۔ والعاقبۃ بالخیر۔ (بنیالیسواں مکتوب)

مکتوب (۴۰)

ایمان کی حفاظت

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

اگر محول حال جہانیاں نہ قضا است   چرا مجازی احوال برخلاف قضا است

(دنیا والوں کے حال کی پھر آنے والی قضا اگر نہیں ہے تو پھر احوال کا جاری ہونا قضا کے خلاف کیوں ہے۔)

ہاں ہاں سہ

بزیر گنبد خضرا چناں تواں بودن کہ آقضائے قضا ہائے گنبد خضرا ست

(اس سبز آسمان کے نیچے ایسا رہنا چاہیئے۔ کہ یہ سب سبز گنبد والے ہی کے ارادوں کا منشاء ہے۔)

بیچارہ آدمی حوادث کے تیروں کا نشانہ ہے۔ قضا و قدر کی گیند بلّے کی زد میں ہے علم و قدرت کے باوجود جاہل و عاجز قوت و غنا کے ہوتے ہوئے ضعیف و نادار رہے یہ کیسی قدرت اور کیسا علم کیسی قوت کیا دولتمندی ہے کہ وہ اپنا اگلا پچھلا اپنی ابتدا اور انتہا نہیں جانتا۔ کیا تھا کیا ہوا۔ کہاں جائے گا اس کی قسمت و نصیبہ میں کیا ہے اس کے کام کی انتہا کہاں تک ہے اتنا بھی اس کو معلوم نہیں۔ پھر یہ علم کا دعویٰ کس برتے پر کرتا ہے۔ جو بالکل محتاج ہو نیازمند ہو ایک گھاس کی کاڑی تک پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک مکھی تک نہیں بنا سکتا۔ تو پھر یہ جھوٹا دعویٰ دولتمندی، بے نیازی، قوت، قدرت، بڑے پن کی کیوں اور کیسے کرتا ہے۔

خدائے راست بزرگی و ملک بے انباز وگر بہر کہ ببینی بعاریت داد است

(خدا ہی کے لئے بڑا پن و عزت اور بے انتہا ملک ہے۔ دوسرے کے پاس جو تو دیکھ رہا ہے وہ چند دن کے لئے اسی کا دیا ہوا ہے)

یہ جانتا ہوں کہ صورت اختیاری آدمی میں رکھی گئی ہے۔ ظاہری اختیار آدمی کو دیا گیا ہے اگر اس کی حقیقت اور اس کے معنی میں غور کریں تو یہ بالکلیہ مجبور و لاچار ہے۔ سچ ہے جس کو کسی نے پیدا کیا اور صفات دئے۔ اس کے لئے اپنے افعال میں قدرت و اختیار کا دعویٰ کہ وہ ذات و صفات کے اثر کا نتیجہ ہے کیسے اور کیونکر درست ہو سکتا ہے

چیزے کہ وجود او زخود نیست ہستیش نہادن از خرد نیست

(ایسی چیز جس کا وجود اپنے آپ سے نہ ہو۔ اس کی ہستی کا ٹھہرانا اس کی ہستی ہے کہنا عقلمندی نہیں)

اتنا ضرور ہے کہ آدمی کے جوہر کو ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ جس پر حق کے صفات، زندگی، سننا، دیکھنا، جاننا، کہنا، طاقت و قوت، ارادہ خواہش کے انوار کا پرتو چمکا ہوا ہے یہ اس کے صفات کا محل قبول ہونے سے زمین کے سارے بسنے والوں میں ایک خاص امتیاز پایا ہوا ہے۔

پروردگار تعالیٰ کے بنائے ہوئے کئی عالم ہیں۔ ہر عالم میں ایک مخلوق ہے۔ ان کے کام ہیں۔ اس عالم میں جس میں کہ انسان ہے جس کو عالم انسانی کہتے ہیں اس کو ایسا اس طرح پیدا کیا گیا ہے جس سے اس میں سبب کی تحریک خواہش کا ابھرنا خود بخود پیدا ہو جایا کرتا ہے یہی اس کو ان کاموں میں لگا دیتا ہے اسی سے سب کام ہونے لگتے ہیں۔ ؎

ما راز قضا ہمیں قدر بنمایند پیمانہ توئی بادہ بتو پیمایند

(ہمیں قضا سے اتنا ہی بتلاتے ہیں کہ تو پیالہ ہے۔ شراب تجھ سے پلاتے ہیں)

اس سے زیادہ بندہ کی قدرت و اختیار کا ثابت کرنا تکلف ہی تکلف ہے (وہ بات دکھلانی ہے جو اپنے میں نہ ہو۔) آدمی میں فعل اختیاری کا مبداء تین چیزیں ہیں۔ (۱) ادراک (عقل۔ پانا۔ دریافت کرنا) (۲) باعث (سبب تحریک ابھارنے والا (۳) خواست (خواہش۔ چاہنا۔ ارادہ) دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں پر اس کو کوئی اختیار بھی ہے یا نہیں۔ آدمی کی آنکھ اگر کھلی رہے تو اس میں صورت نظر آتی ہے۔ دیکھنا نہ چاہے تو نہیں دیکھتا اگر دیکھنا چاہیئے تو دیکھ لیتا ہے دیکھنے کے بعد وہ صورت اگر طبیعت کے مناسب و موافق ہو تو ایک رغبت خواہش پیدا ہو جاتی ہے یہی وجہ تحریک

ہو جانے سے وہ اس کی طرف متوجہ و متحرک ہو جاتا ہے۔ وجہ تحریک اختیاری
اشیاء کے پیدا ہو جانے کے بعد ایک ارادہ ایک چاہت اس میں پیدا ہوتی
ہے جس سے وہ حرکت میں آتا اس کو کر گزرتا ہے۔ اس اختیار سے جب
بے اختیاری اس کی ذات میں پیدا ہوتی ہے تو وہ اس طرف رخ کرتا جان
بوجھکر مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے بندہ اپنے افعال میں
مختار بھی اور مجبور بھی ہے۔ اپنے اختیار سے کر بھی سکتا ہے اور نہیں بھی
کر سکتا وہ یہی صورت ہے ؎

اے کاش نمی دیدم آن زلف سمن را تا دیدہ و دانستہ در دام غم افتادم
(کیا اچھا ہوتا اگر اس معشوق کی صورت اس کے گیسو نہ دیکھتا۔ میں اس کو دیکھکر
جان بوجھکر غم میں گھر گیا)

دوسری کائنات بھی آدمی کی طرح قدرت الٰہی کی مسخر و محکوم ہے لیکن
جو پریشانی۔ سرگردانی حیرانی آدمی کو ہے وہ کسی کو نہیں۔ جمادات، نباتات
چونکہ حیات کی بالیدگی نہیں رکھتے اس لئے علم و عقل کے مظہر نہ ہوئے آرام
و چین سے ہیں۔ اس حقیقت سے کہ وہ بھی اپنے پروردگار کے حکم سے وجود
پائے ہوئے ہیں اسی کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑے ہیں۔ حیوانات اگرچہ
حس و حرکت رکھتے ہیں جسمانی تکلیف درد دکھ جو جو خواہش کے ذریعہ
سے آتا رہتا ہے اس میں گرفتار ہیں لیکن وہ آدمی کی طرح اس سوچ اس فکر
اس خیال میں کہ کیا ہوا، کیا ہوگا، کیوں ہوا، کیسے ہوا، کس لئے ہوا، کیونکر
ہوا، نہیں رہتے اس لئے وہ روحانی تکلیف جو عقل میں پھنس جانے سے
پیدا ہوتی ہے فارغ ہیں۔ فرشتے بھی علم و عقل پورے طور سے رکھتے ہیں مگر
عقل مجرد (عقل ہی عقل) ہیں جسمانی تعلقات میں گرفتار نہیں۔ شہوت۔

زنہار بکوے مے فروشاں مگزر　　کانجا سر و دستار گرو خواہی کرد

(دیکھ کبھی شراب بیچنے والوں کی گلی میں نہ جانا۔ وہاں تو اپنا سر اور اپنی پگڑی گرو رکھدے گا)

حدیث شریف میں ہے کہ الدنیا خضرۃ وحلوۃ (دنیا سبز و شیریں ہے) یعنی تروتازہ ہے۔ دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ شہوت کی آنکھوں میں زیبا رنگین دکھائی دیتی ہے ایسی میٹھی ہے کہ جس کے چکھنے میں لذت ہے۔ طبیعت کو بھلی لگ جاتی ہے۔ جس میں ایسی دل لبھانے فریب دینے والی باتیں ہوں اس سے بچاؤ اور صبر کیسے ہوسکتا ہے کہ خود خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ (ہم نے اس گھر کو اس لئے نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ زیبا و رنگین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ کون اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ جی چراتا ہے اس کے دیکھنے میں نہیں رہتا۔) ؎

ہمہ انداز من بتو اینست　　کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

(میرا قیاس تیری نسبت یہ ہے کہ۔ تو بچہ ہے اور گھر بہت آراستہ ہے)

دنیا کے ناز نخرے نفس کے فریب ایسے ہیں کہ اگر اس میں گفتگو آئے اور ساری عمر رکھتے ہیں پھر بھی ختم نہ ہوں۔ اس کی حکایت پوری نہ ہو۔ اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عاجزی بیچارگی کا اظہار اس کے سامنے پیش کردیں دعا کے لئے، کریم بندہ نواز کے آگے ہاتھ پھیلا کر عرض کریں کہ اے پروردگار۔ اے خداوند ہمیں ہم پر نہ چھوڑ۔ ہمیں ہمارا نگہبان نہ بنا۔ ہمارے شر سے ہمیں بچا۔ ہم پر ہمیں فتح و نصرت دے ہماری مدد یاوری کر عقل کو نفس پر۔ دین کو خواہشات پر حاکم بنا۔ ہمارا ناصر (مددگار) والی (متولی)

رہ ۔ لے توانا ۔ ہماری ناتوانی پر رحم کر۔ لے دانا بینا جاننے دیکھنے والے غفلت کے بھنور میں نادانی کے چکر میں ہمیں یوں ہی چھوڑ نہ دے معصیت وغفلت (گنہگاری ۔ بھول) کے وقت اس سے پہلے ہی اپنے رحم میں شامل کرلے جیساکہ تو اپنا فضل وکرم طاعت و ہوشیاری میں کیا کرتا ہے ویساہی دوری اور گمراہی میں بھی کرتا رہ اس سے زیادہ مدد دے جو نزدیکی و ہدایت میں دیا کرتا ہے ؎

یارب مددے کز دوئی خود برہم — از بد برہیم واز بدی خود برہسم

(لے میرے پروردگار مدد کر کہ اپنی دوئی سے چھوٹ جاؤں. برائی چھوٹ جائے اپنی بدی سے چھوٹ جاؤں ۔

درہستی خود مارا ازخود بیخود کن — تاازخودی و بیخودئی خود برہسم

(اپنی ہستی میں ہم سے ہم کو اپنے آپ سے بیخود کردے ۔ تاکہ اپنی خودی بیخودی سے چھوٹ جاؤں)

کام کی بنیاد تین فنا پر رکھی گئی ہے۔ (۱) لوگوں سے یعنی ان کے وجود وعدم (ہونے نہونے) مدح وذم (تعریف و ہجو) دینا نہ دینا۔ نظر سے ساقط ہوجائے یعنی گرجائے) (۲) اپنے نفس کی خواہش سے۔ یعنی اس وقت تک کہ وہ حق کا بالکلیہ تابع ہوجائے خدا اور رسول کے فرمائے ہوئے پر چلنے لگ جائے سیدھی راہ اختیار کرے۔ (۳) اپنی خواہش اپنے ارادہ سے یعنی کوئی خواہش کسی قسم کا ارادہ۔ نفع ونقصان ۔ خیر وشر کے متعلق دل میں نہ رہے۔ حق کی طلب وخواہش ہی پر رہے اس کے فعل کے سوائے نہ دیکھے۔ اس کے علم کے سوا نہ جانے ۔ کوئی ارادہ اس کے ارادہ کے سوائے نہ رکھے ؎

تادر تو زپندار تو ہستی باقیست — می دان بیقین کہ بت پرستی باقیست

(جبتک تجھ میں تیری سمجھ میں تیری ہستی باقی ہے۔ یقین سے جان کہ ابھی بُت پرستی باقی ہے)

اس سے بھی اونچی ایک اور بات سُن لو ؎

گفتی بت پندار شکستم رستم   ایں بت کہ تو پندار شکستی باقیست

(یہ کہا کہ میں نے سمجھ بوجھ کے بُت کو توڑ دیا چھٹکارا پالیا۔ یہ بُت کہ تو نے سمجھ بوجھ کو توڑا ابھی باقی ہے۔)

استغفر اللہ۔ واتوب الی اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ (مغفرت مانگتا ہوں اللہ سے۔ رجوع ہوتا ہوں اللہ ہی کی طرف اور توبہ کرتا ہوں اللہ کی بارگاہ میں جانتا مانتا ہوں کہ حول وقوت اللہ کے سوا کسی میں نہیں۔ وہی توانا اور قوت والا ہے۔) کہنے کا ارادہ کچھ اور تھا۔ کسی اور جانب توجہ تھی بے اختیار ادھر توجہ ہوگئی ہمارا مقصود اس واقعہ کا تحریر کرنا تھا جس میں وہ نوجوان اور اس کا بھائی مارا گیا بیشک وہ مقبول نوجوان اچھی سیرت وصورت کا تھا۔ فقرا کو دوست رکھتا تھا۔ فقیروں کا دوست تھا۔ اللہ اس پر رحم کرے۔ عفو ودرگزر کرے کتنی بہتر نیک بختی ہے کہ مجاہدہ میں تلواروں کی ضرب میں موت اختیاری سے جہاد میں جان دے دی اور امانتِ زندگی کو بغیر کسی کمی و زیادتی کے جان کے مالک کو اپنی جان سپرد کردی ؎

جان بجانان دہ وگرنہ از تو بستاند اجل   خود بدہ انصاف کاخر آن نکو۔یا۔ ایں نکو

(جان جاناں کو دے دے وگرنہ مقررہ وقت پر موت تیری جان لے لیگی۔ خود تم ہی انصاف کرو کہ وہ اچھی یا یہ اچھی)

خدا کی قسم یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس واقعہ سے آپ کو جو ملال ہوا اور

آپ کے وقت کو اس سے جو نقصان و رنج ہوا وہ آپ کے دوستوں مخلصوں کے لئے انتہائی سانحہ (درد بھرا واقعہ) ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو کسی رنج و ملال میں مبتلا نہ کرے آپ کی دولت آپ کے اقبال پر کوئی دھبہ نہ آئے۔ آپ کی سعادتمندی یہاں اور وہاں رکھے۔ ہمیشہ خوش وقت اور اپنی مرضی پر خوش حال اور خرم و شاداں رکھے۔ صبر کرنا ضروری ہے۔ تحمل و برداشت کے سوائے علاج بھی نہیں۔ حضرت حق کی طرف متوجہ ہو کر اس کی حفاظت و عصمت میں آجانا چاہئے اپنے سارے کام اس کے سپرد کر دینا بہتر ہے۔ غریبوں کے دلوں کی توجہ آپ کی طرف ہے ؎

سایہ لطف تو لے سرو رواں دائم باد کہ گزارے بسر خاک نشیناں دارد

(تیرے لطف کا سایہ لے سرو رواں ہمیشہ رہے۔ کہ تو خاک پر بیٹھنے والوں کے پاس آتا جاتا ہے) ؎

آں مہ کہ حسن و خوبی عالم بروئے اوست از ہر کرانہ دیدہ دلہا بسوئے تست

(وہ چاند کہ ساری دنیا کی خوبی اور حسن اس کے چہرہ میں ہے۔ ہر طرف سے دل کی کوری نظر تیرے ہی طرف ہے)

اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت کرے کہ وہی حفاظت اور جاننے والا ہے۔

لے میرے عزیز۔ ایسی صورتوں ایسے حادثات میں فقیروں کی سوجھ بوجھ اور ہی طرف جاتی ہے وہ یہ کہ آدمی اپنی جان سے دشمنی کرنے والوں سے جو اس کو ہلاک کرنے کی تاک میں لگے ہوئے اور اس کی حیات فانی کے ختم کرنے کی پیٹے میں ہوتے ہیں کتنا ڈرا ہوا، سہما ہوا رہتا ہے۔ کیسی کیسی تدبیریں کرتا ہے۔ اپنے اوقات کو کس قدر ہوشیاری کے ساتھ رکھتا ہے۔ لیکن اپنے ایمان کے دشمنوں سے جو نفس، خواہشات، ہوا و ہوس شہوات ہیں۔ سخت

بداندیش ساتھی، بُری خصلت والے مصاحبین ان سے چوکنا یا ذرا بھی آگاہ باخبر نہیں رہتا۔ ان سے اس کو کوئی ڈر و فکر نہیں۔ یہ بھی کبھی نہیں سوچتا کہ اس کے یہ کیسے اور کتنے دشمن ہیں۔ کن کن ہتیاروں سے آراستہ ہیں۔ کیا کیا ان کے ذرائع ہیں ایمان کی متاع کو لوٹ لینے تباہ برباد کرنے پر تلے ہوئے اس کے روحانی معشوق کو قتل کرنے پر آمادہ ہیں۔ پہلی صورت میں اس کے تو صرف دو ایک دشمن اور رکے ایک اس کی مدد واعانت کرنے والے ضرور ہوں گے۔ جو بیچ بچاو اور مقاومت و مدافعت کرسکتے ہیں دوسری صورت میں ایمان اکیلا ہے۔ غربت میں ہے ایمان کی نسبت یہ فرمایا گیا ہے کہ ایمان غریب شروع ہوا غریب ہے اور انتہا میں غریب ہوگا۔ اتنے دشمن بُرائی چیتنے والے عداوت رکھنے والے اندر باہر ہیں اس قدر ہیں کہ جن کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ان سے جان کیسے بچائیں کیسے بچ کر نکل جائیں کس چیز سے ایمان کی حفاظت و نگہبانی کی جائے۔ سنیئے فرمان ہوتا ہے کہ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ حصنی۔ فمن دخل حصنی امن من عذابی (نہیں ہے کوئی بندگی کے لائق مگر اللہ۔ میرا قلعہ۔ میری پناہ میں آنے کی جگہ ہے جو کوئی میرے قلعہ میری پناہ کی جگہ میں داخل ہوگیا۔ وہ میرے عذاب سے اماں پاگیا) جو اس پناہ گاہ میں آگیا اس میں پناہ لی، وہ ایمان سلامت لے گیا۔ وہ ہر قسم کے ڈر اور خوف ۔۔۔ بے فکر بخت ہوگیا، امن پاگیا۔ فراغت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے باوجود ۔۔۔ احتیاط دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ نگہبانی قلعہ داری و قلعہ بندی کا سا ۔۔۔ سامان مہیا کیا جائے۔ کیونکہ دشمن اس قلعہ کے لئے اس میں گھس آنے کی ۔۔۔ میں ہیں۔

حضرت قدوۃ الاولیاء شیخ صدرالدین فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام بہاوالدین

ذکریا قدس اللہ اسرارہم کے ملفوظات میں ہے آپ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے کہ دیکھو ایک قلعہ ہوتا ہے۔ جس کے اطراف حصار ہوا کرتا ہے ایک فصیل ہوتی ہے جس کی کبھی نگہبانی کی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی پناہ کی جگہ کو بیچ میں لے لیتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه میں تین قسم کی پناہ ہے۔ ظاہر۔ باطن۔ حقیقت کی۔ ظاہر کی پناہ خدائے عزوجل کا خوف اُٹھ نہ جائے اس سے امید جاتی نہ رہے اللہ تعالیٰ کے سوائے سب سے ڈرنا، امید رکھنا نکل جائے۔ اگر ساری دنیا دشمن ہوجائے یا دوست ہوجائے تو اس کے حکم بغیر نفع نقصان برائی بھلائی نہیں کرسکتی۔ اس کو سمجھتے رہئیے۔ قولہٗ تعالیٰ: وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ ضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (اگر اللہ ضرر پہنچائے تو اس کے سوائے کوئی اور اس کو دور نہیں کرسکتا۔ اگر نفع پہنچائے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا) باطن کی پناہ یہ کہ جب یہ تحقیق کرلی اور ثابت ہوگیا کہ جو کچھ مرنے سے پہلے اس زندگی میں اس فنا ہونے والی دنیا میں پہنچتا اور ملتا ہے وہ ہمیشہ کا نہیں، اس پر مٹنے اور فنا ہونے کا قلم چل چکا ہے، یہ رہ نہیں سکتی، قولہٗ تعالیٰ: كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (ہر چیز مٹنے والی ہے) اس کے ہونے نہ ہونے رہنے نہ رہنے پر التفات و توجہ نہ کریں۔ جب یہ بات حاصل ہوجاتی ہے تو کلمہ باطن میں آجاتا ہے — حقیقت کی پناہ یہ کہ جنت کی آرزو و دوزخ کا ڈر دل میں نہ لائے۔ حق کے سوائے کسی سے قرار نہ لے۔ فِىْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (سچائی کی بیٹھک میں با اقتدار بادشاہ کے پاس) جب یہاں پہنچ گیا۔ جنت خود بخود اس کے تابع ہوجائے گی۔ دوزخ اس سے بھاگ کھڑی ہوجائے گی (شیخ کا کلام ختم ہوا) اللہ تعالیٰ ان کے برکات ہم تک پہنچائے۔ ان کے

فتوحات سے ہمیں بھی سرفراز فرمائے۔ آمین۔

ہمارے شیخ کے شیخ، عالم عارف متقی نوراللہ ضریحہ ونفعنا برکاتہ وبرکات علومہ۔ اپنے بعض رسالوں میں تحریر فرماتے ہیں کہ دین اور دنیا کی محبت ایک کی دوسرے پر ترجیح کے جو مراتب ہیں، ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں دنیا کی محبت ان پر ایسی غالب ہوتی ہے کہ وہ دنیا اور دنیا داروں کی خاطر دین کے فرائض واجبات کو ترک کر کے دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں۔ جو لوگ ایمان سے نکل گئے ان سے ہمیں کوئی بحث ہی نہیں۔ گفتگو مومنوں کے بارے میں ہو رہی ہے۔ جو کلمہ پڑھتے تصدیق کرتے ہیں۔ سچ مانتے اور رجانتے ہیں اوامر و نواہی کی پابندی کرتے ہیں لیکن اعمال میں کوتاہی ضرور کرتے ہیں۔ ان سے کم وہ ہیں جو فرائض و واجبات ترک نہیں کرتے۔ سنت اور نوافل کے ترک پر راضی رہتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں اگر اس کو کریں تو دنیا اور دنیا کی دولت و شوکت جاتی رہیگی۔ بعض وہ ہیں جو دین کے آداب مستحبات کو دنیا کی محبت میں چھوڑ دیتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان میں رہیں اور کرتے رہیں تو دنیا ہاتھ سے چلی جاتی ہے بعض ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ فرائض، واجبات سنن، آداب مستحبات سب ادا کرتے ہیں۔ لیکن استقامت و ثبات کے ساتھ ادا نہیں کرتے۔ اگر کبھی دنیا کے کاموں میں سے یکایک کوئی کام آپڑے۔ تو پریشان ہو کر وہ ساری چیزیں جو کیا کرتے تھے بالائے طاق ہو جاتی ہیں۔ یہ دنیاوی چیزان کے اوقات کی عارض ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ متغیر و متزلزل ہو کر اپنی جگہ سے ہل جاتے ہیں۔ سب کام بھول بھال کر اس دنیا دی کام کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اسی دنیا میں ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ قائم و برقرار رہتی ہے جو کچھ بھی پیش آجائے، جو کچھ بھی ہو جائے، کیسی ہی بات ہو جائے، اپنی جگہ

سے نہیں ہلتے۔ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں ذرا بھی جنبش نہیں ہوتی، یہ بڑی بزرگ ہستیاں دنیا میں نایاب نادر ہیں۔ سُرخ گندھک سے بھی بڑھکر کمیاب ہیں ؎

تا ز ہر بادی نجنبی یا بدامن کش چو کوہ ۔۔۔ کاو می مشت غبار و عمر باد صرصر است

(ہر ہوا سے نہ ہلنا چاہیے تو پاؤں سمیٹ لے پہاڑ کی طرح ہو جا کیونکہ آدمی گرد کی ایک مٹھی ہے اور اس کی عمر تیز ہوا ہے)

ایمان کے مراتب، دین کی محبت انہی کے لئے ہیں۔ انھیں کو سزاوار ہیں۔ اب ہمیں اپنے آپ کو دیکھنا اپنے آپ غور کرنا چاہیئے کہ ہم ان مراتب میں سے کس مرتبہ میں داخل ہیں۔ آج یہ حال ہے تو پھر قیامت میں حساب و کتاب ہونے تک کیا ہوگا ؎

باش تا پردہ براندازد جہاں از روئے کار ۔۔۔ انچہ امشب کردۂ فردات گردد آشکار

(ٹھہرے رہ اس وقت تک کہ دنیا سے پردہ اُٹھ نہ جائے، آج رات جو کیا وہ کل تجھ پر ظاہر ہو جاتا ہے)

عاقبت بالخیر۔ دین و دنیا کے کاموں کا نتیجہ خیر ہو۔ (اڑتالیسواں مکتوب)

مکتوب (۳۱)

دنیا والوں کا ظلم فقیر کا صبر

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے) والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ وآلہ واصحابہ وسلّم (درود سلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی آل آپ کے اصحاب، آپ کی پیروی کرنے والوں) پر کہ یہ

سب حق کا راستہ بتلانے اس پر چلانے، دین کے علوم کے زندہ کرنے اور پھیلانے والے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی تعریف محمد رسول اللہ کی توصیف کے بعد عرض ہے آپ کی محبت سے بھری ہوئی دلپسند تحریر سینہ سے لگا لینے کی تحریر پہنچی۔ تسلی خاطر (دل کی ڈھارس) انشراح صدر (سینہ کی کشائش کھل جانا) نورانیت قلب (دل کی روشنی) خوش وقتی (ایک بحالی) کا باعث ہوئی جس سے محبت کے آثار دوستی کے موجبات کا قیام وحشت و بیگانگی کے چلے جانے کی صورت ظاہر ہوگئی۔ شیخ مصطفےٰ صاحب کے ذریعہ جو خط میں نے بھیجا تھا، اس میں وقت اور حال کی پابندی کے متعلق جو اشارہ و تنبیہ کی گئی تھی، وہ برادرانہ محبت سے تھی۔ ہمیں یہ علم ہے کہ آپ ہمیشہ احوال و آداب کے پابند اور اس سے بخوبی واقف اپنے کام میں ہوشیار چالاک ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ نصیحت وصیت تنبیہ، اخلاص خیر خواہی محبت و مودت کے لوازم ہیں۔ آپ میں اور اس فقیر میں جو محبت اور آپس میں جو مودت۔ اتحاد ایک دوسرے سے ہے اس میں خدا نخواستہ کسی نفرت یا کدورت کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں یہ آپ پر اور مجھ پر ظاہر ہے جس کو ہم دونوں خوب جانتے ہیں۔ اس فقیر کی صحبت و ملاقات ہی کے لئے آپ کا دہلی آنا ہوتا رہا ملنے جلنے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کے سوائے کوئی اور غرض نہ تھی اللہ کے لئے محبت و دوستی رکھنا اس کی مرضی اس کے نافذ کئے ہوئے قواعد کے تحت رہنا حسبہٗ کام کرنا فقیر کا فریضہ ہے اس کے ساتھ ساتھ سلامتی حال اور فقیری کی روش اور وضع کے ساتھ رہنا بھی ضروری ہے جب آپ اس شہر میں رہتے تھے اہل شہر سے تکلیفیں اٹھاتے برداشت کرتے تھے، اس کے سوائے چارہ ہی کیا ہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا

جَمِیْلًا۔ (صبر کرجو وہ کہتے ہیں اور اُنھیں نہایت خوبی کے ساتھ چھوڑ) کا حکم ہے۔ لوگوں کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی نیک ہے سیدھے راستہ پر ہے اگر اس کو لوگ بُرا کہیں بُرا سمجھیں گمراہی سے نسبت دیں گمراہ کہیں تو کوئی نقصان نہیں خدانخواستہ اگر کوئی بُرا ہے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے لوگ اس کو نیک سمجھیں اچھا جانیں اور نیک کہیں تو کوئی فائدہ نہیں ہمیں اپنے حال کو اپنے کام میں ٹھیک ٹھاک رہ کر درستی و راستی کا راستہ اختیار کر لینا نہایت ضروری ہے۔ لوگوں کے کہنے پر دھیان نہ دینا چاہیئے وہ جیسا بھی جانیں کوئی مضائقہ نہیں۔ حضرت شاہ ابو المعالی اس شعر کو اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

کار جامی عشق خوبانست دہر سو عالمے ۔ میکنند انکار او۔ او ہمچناں در کار خویش

(جامی کا کام معشوقوں کا عشق ہے اور دنیا کے سب لوگ اس سے انکار کرتے ہیں اور وہ اسی طرح اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔)

درویش کا حقیقی کام لوگوں کا ظلم وستم سہنا جھڑکیاں پڑنا بُرا کہنے کا سُننا ہے۔ جو کوئی اس راستہ میں قدم رکھتا ہے وہ لوگوں کی سختیاں تکالیف اُٹھائے بغیر نہیں رہتا۔ اعوذ باللہ من ھذا (ایسی باتوں سے اللہ کی پناہ) عشق کا آرام اس کی آسودگی اور ہی ہے۔ محققین نے نظر تحقیق سے یہ جان لیا کہ ساری تکلیفیں اذیتیں اپنے نفس ہی کی وجہ سے ملتی اور ہوتی ہیں نفس اور خواہشاتِ نفس نہ ہوں تو کوئی جھگڑا کسی قسم کی تشویش ہی نہیں ہوتی۔ رب لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین ولا ادنیٰ من ذالک (اے پروردگار مجھکو میرے نفس کے حوالے پلک جھپکنے تک یا اس سے کم مدت میں بھی نہ رکھ) اے اللہ ہمیں ہم پر نہ چھوڑ ہمیں ہمارے شر سے بچا یہ شعر بھی شاہ ابو المعالی کا ہے ؎

از کار جہاں گر بصفا۔ دست بشوئی ۔ بر من اگرت ہیچ کسے رنج رساند

(دنیا کے کام سے اگر بالکل ہاتھ دھو دیا۔ میں ذمہ دار ہوں اگر تجھکو کوئی رنج پہنچ جائے)
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظلم ہونے لگتے ہیں تو ایسی صورت میں اسی کی
طرف سے سب کچھ ہو رہا ہے سمجھکر برداشت کرنا اوس کی قضا پر راضی رہنا
صبر کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ "صبر کر اس پر جو وہ کہتے ہیں"
کا مطلب یہ ہے کہ بے سوچے سمجھے بے صبری سے دل تھوڑا نہ کیا کریں۔ دل و
زبان کو بدخواہی بدگوئی سے محفوظ رکھیں۔ کسی کو بد دعا نہ دیں۔ خود ظالم نہ ہو جائیں
کیونکہ آیت کریمہ مذکورہ کے یہی معنی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے حال
کی شکایت کریم جبّار کے سامنے کر سکتے ہیں۔ اپنے گناہوں کی اس سے عذر خواہی
کر سکتے اس سے معافی مانگ سکتے ہیں۔ ہر اپنی مدعا کا زبان۔ دل۔ حال اور
وقت کے لحاظ سے تفصیلی طور سے اظہار کیا جا سکتا ہے اسی کو مناجات کہتے
ہیں۔ لیکن بد دعا دے کر تکلیف پہنچانا لوگوں کی غیبت کرنا فقر و غنا کا طریقہ
نہیں۔ اس روش سے ایسی باتیں بہت دور ہیں۔ اہلِ دعوت (چلہ کش اسمأ
کا ورد کرنے والے) کا عیب و نقصان یہ ہے کہ وہ وظیفہ پڑھکر دوسروں کو
تکلیف دیا کرتے ہیں ان کے لئے بد دعائیں کرتے ہیں ان کو جو کوئی تکلیف
دیتا یا ضرر و نقصان پہنچاتا ہے یا مخالفت کرتا ہے تو اس کے تباہ کرنے مار
ڈالنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اعوذ باللہ من ھٰذا (اللہ کی پناہ
میں آتا ہوں ایسے حرکات سے)

حضرت قطب وقت شیخ عبدالوہاب متقی قدس اللہ روحہ نے اس فقیر
کو نعمت اذکار، دعوات، احصار سے جو مشائخ میں مروج ہیں جس وقت
اجازت دی تو فقیر نے عرض کیا کہ یہ دعوات اذکار وصول حق میں کارآمد ہوتے
ہیں تو فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ اللہ کے ناموں کو سند و دلیل بنانا بڑا کام ہے۔

اہل دعوات اکثر بدخلق ہوتے ہیں۔ درویشی تو غربت' نیستی' خاکساری' بردباری' ذوق وشوق ہے لڑائی جھگڑا کرنا ہستی' خود پرستی دکھلانا نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ درویش پر جو بلائیں آئیں اس پر جو ظلم وستم ہوں اس کے لئے صبر ہی کرنا ہے اس کے سوائے اس کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ جتّار کریم کے چھپے ہوئے الطاف حسن تدبیر پر اگر نظر ہو تو شکر کرنا پڑتا ہے کسی محقق کا کہنا یہ ہے کہ بلا میں لطف خفی نعمت باطنی کی بنا پر شکر ادا کیا جانا چاہیئے۔ چونکہ بشریت کا حوصلہ بہت کمزور ہے اس لئے صبر ہی پر ٹھہرے رہنے کو کافی و مناسب خیال کیا گیا اور کہا گیا کہ اگر شکر نہ کر پائیں تو کم از کم صبر کو تو ہاتھ سے نہ دیں۔ چنانچہ جب حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ سے سوال ہوا کہ غنی شاکر (دولتمند شکر گزار) بڑھا ہوا ہے یا فقیر صابر (فقیر مفلس صبر کرنے والا) تو آپ نے فرمایا کہ فقیر شاکر دونوں سے افضل تر ہے یہ حکایت بہت آگے بڑھ جاتی ہے آپ عارف وعقلمند ہیں اس معاملہ کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں اس لئے اس سے زیادہ بیان کرنے کی وجہ نہیں پائی گئی۔

سنیئے۔ اس مرتبہ کے صرف دو طریقے ہیں۔ لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کرنا شرط ہے' حرکت میں آنا' وطن چھوڑ دینا' ہجرت کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ اصبر علیٰ مایقولون کا اشارہ اسی طرف ہے۔ جب جان پر بن جائے لوگ جان لینے کے پیچھے پڑ جائیں تو ہجرت انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اگر توجہ تفویض التجا صحیح طرح سے میسر ہے تو کہیں بھی ہیں برابر ہے۔ رنج وغم ہر جگہ ہے۔ رنج وغم کھانا ہی نہ چاہیئے۔ انتتوا لا عون ان کنتم مؤمنین۔ و ان جندنا لهم الغالبون۔ ومن یتوکل علی اللہ فهو حسبه دل کو مضبوط رکھنا اور کسی قسم کی فکر کو آنے نہ دینا چاہیئے ؎ ۔

غبار غم برود حال بہ شود حافظ　　تو آب دیدہ ازیں رہ گذر دریغ مدار

(دل کا غبار جاتا رہتا ہے اور حال اچھا ہو جاتا ہے اے حافظ۔ تو رونے آنسو بہانے سے اس راستہ میں کوتاہی نہ کر)

آپ اس فقیر کو اپنا مخلص دوست سمجھیں۔ آپ کے احوال سے غافل نہ جانیں۔ ہم فقیروں کی جائے پناہ مرکز قرار و قیام لوٹنے کی جگہ سید کائنات خلاصہ موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ و اکمل التحیات ہیں اور ہمارا وسیلہ حضرت پیر دستگیر، غریب نواز، شکستہ پرور، غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ و ارضاہ عنہ ہیں۔ اس کام میں آپ ہی جوانمردوں میں فرد ہیں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ آپ سے محبت و اخلاص ہے فقیر کی توجہ آپ کی طرف بہت زیادہ ہے۔ اظہار انوار، اسرار آثار، دوستی و خیر خواہی میں اپنی طرف سے کسی قسم کی کمی و کوتاہی نہ کریں ایک اور بات آپ سے کہنی ضروری ہے کہ آپ اس فقیر کے لئے کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کریں، کسی کے منہ نہ آئیں۔ ہم فقیر ہیں کوئی دعویٰ ہم میں نہیں ہم کسی بات کے دعویدار نہیں۔ کوئی ادعا ہم نہیں رکھتے ہم کو دردمند رہنا چاہیئے نہ کہ خودپسند۔ خودی کے بارے میں میں نے ایک نظم لکھی تھی اس میں سے یہ لکھ رہا ہوں۔

عجب از طور خودپسندانست　　طور ما طور دردمندانست

(خودپسندوں کے طریقہ پر مجھکو تعجب ہوتا ہے۔ کوئی ہمارا طریقہ دردمندوں کا طریقہ ہے)

ہیچ چیزے چو دردمندی نیست　　کہ در او بوئے خودپسندی نیست

(کوئی بھی چیز دردمندی کے جیسی نہیں کہ جسمیں خودپسندی کی بو تک نہیں)

(نوشتواں مکتوب)

مکتوب (۳۲)

زبانی گفتگو جُدائی کی شکایت

اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

آن شوخ کہ درد م ہمہ درمانُ انست (۱) دشوارِ من غم زدہ آسان دانست
گفتم صنما ز وصل تو میر سشدم (۲) گفتا کہ مشو۔ ہنوز نتواں دانست

(۱) (وہ معشوق کہ جس نے میرے درد کو علاج سمجھا مجھ غمزدہ کی دشواری کو آسان سمجھا)
۲۔ (میں نے کہا کہ اے معشوق میں تیرے وصل سے ناامید ہوگیا۔ جواب دیا کہ ناامید نہ ہو کہ ابھی تو سمجھ نہ سکا۔)

ایک طرف اپنے اعمال کے نظر کرتے نا امیدی ہی نا امیدی ہے سبب و علت کی تہمت اس پر لگاتا ہے کہ اس نے اپنے لائق اور اپنی درگاہ میں قبول ہونے پہنچنے کے قابل مجھ کو نہ جانا۔ دوسری طرف کریم کے کرم پر نظر اس کے فضل پر بھروسہ ہونے سے کہ وہ بڑا ہی فضل کرنے والا ہے امید ہی اُمید بندھ جاتی ہے۔ دل یہ کہنے لگتا ہے کہ اگر اس کا فضل ہو جائے تو ایک پل میں تمام اسباب سارے سبب مہیا ہو جائیں تمام دروازوں کے قفلوں کی چابیاں ہاتھ میں آجائیں۔ امید کی پھر ناامیدی کی پیٹ حقیقت میں تقدیر ہی کی اُلٹ پھیر سے آتی رہتی ہے۔ تقدیر میں جو ہونا ہے اسی کے ارد گرد گھوم جاتی ہے۔ تقدیر میں غم ہو تو غم سامنے آتا ہے۔ خوشی ہو تو خوشی منہ دکھلاتی ہے۔ جب اس کے قہر و غضب پر نظر جاتی ہے تو فکر و رنج کے ظاہر ہونے سے خوشی کی صورت دیکھ نہیں سکتے۔ لطف و کرم مہربانی پر جب نظر جاتی ہے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رحمت کے سایہ میں آجانے سے ایسے خوش ہو جاتے ہیں

اور ایسی خوشی ہاتھ آجاتی ہے کہ غم و رنج فکر و تشویش کا اس میں گذر تک نہیں ہوسکتا جو کچھ ہونے والا ہے، جس سے معاملہ پڑنے والا ہے، وہ مبہم و مجمل پوشیدہ صاف طور سے معلوم نہیں ہوتا۔ اچھی طرح سے نہیں کھلا ہے اس میں اس کی یہ حکمت ہے کہ پروردگاری کا رعب و داب بندگی کا ادب باقی رہے ایک رنج و غم ہی میں گھلتا رہتا، گھلتا جاتا ہے ایک خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ خوش مگن رہا کرتا ہے۔

ایمان کا قاعدہ ضابطہ یہ ہے کہ وہ خوف و رجا (ڈر اور امید) کے درمیان ہے۔ اسی پر ٹھہرے رہنا ضروری ہوجاتا ہے سارے حادثے، زمانہ کے چکر رات دن کے پھیر اسی قاعدہ کی نگہبانی ضابطہ کی حفاظت کے لئے ہیں۔

حق تعالیٰ کے اسمائے تجلیات (اللہ کے ناموں کے کام و ظہور) اور اس کے صفات (تصرفات و خوبیاں) ایک دوسرے سے جداگانہ مختلف متضاد ہونے سے عالم میں نشیب و فراز ہے اور ہوتا رہتا ہے لطف و قہر کے دائرے میں لایا جاکر حیران و پریشان کیا جاتا ہے وہ یُحیی یُمیت (جلاتا ہے مارتا ہے) یعز یذل (عزت دیتا ہے یعنی امیر بناتا ہے۔ ذلت دیتا ہے یعنی فقیر کرتا ہے) یضحک یبکی (ہنساتا ہے رولاتا ہے) یعطی ویمنع (دیتا، نہیں دیتا) یرفع ویحفظ (اٹھاتا دور کرتا۔ حفاظت کرتا ہے) یہ سب اسی کی بادشاہی کے فرمان ہیں اسی کے حکم کی اجرائیاں ہیں۔ اگلے زمانوں میں بھی تغیر و تبدل ہوتا تھا۔ دنیا میں پریشانی سرگردانی آیا کرتی تھی۔ فنا و زوال کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ہر موجود، وجود و عدم (ہونے نہ ہونے) میں ہلاک ہوتا رہا ہے۔ یہ صورتیں کبھی تو غفلت، غرور یا آرام طلبی، عیش و عشرت میں ڈوب جانے یا دین و ملت کی پابندی میں خلل آجانے سے تھوڑی سی گڑبڑ ہوتی ٹوٹ پھوٹ ہوجایا کرتی تھی

پھر لوگ اپنی پہلی حالت و وضع پر آجایا کرتے تھے کام اچھی طرح سے چلتا تھا۔ راحت و آرام کی صورتیں پیدا ہوجانے سے زمانہ سنبھل جاتا تھا اس زمانے میں عالم اور ہی ہے۔ لوگ قسم قسم کے رنج و غم و فکر و تشویش میں ہیں۔ دل میں آرام کا تصور زبان پر آسائش کا نام تک نہیں آتا (جب شیخ کے زمانے میں یہ حال تھا تو ہمارے زمانے کے بارہ میں کیا کہا جائے۔ مترجم) اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس زمانے میں محبت کا ناز و کرشمہ کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ لیے ہوئے۔ دباؤ کا ظہور، قدرت کی گرفت کچھ اور ہی زور و غلبہ لئے ہوئی ہے توڑ پھوڑ اٹھا پٹک قہر و عتاب خوب زوروں پر ہے۔ عزت کبریائی، اقتضائے خداوندی کچھ اور ہی طور و طریق سے امتحان و آزمائش کرتی جارہی ہے۔ سب کا سکون و آرام جاتا رہا۔ ایک اندھیرا چھایا ہوا ہے، اس کا چھوٹ جانا جمعیت دل اور سکون حال کا نصیب ہونا ناممکن کیا محال دکھائی دے رہا ہے۔ بہت سے لوگ برداشت کی طاقت نہ ہونے سے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوگئے انھوں نے چند دن کی زندگی کا بچا لینا ہی بہتر سمجھا اور ہمیشہ کی ہلاکت میں آگئے۔ ایک گروہ وہ ہے جو مقام صبر میں مضبوطی سے پاؤں جمائے ہوئے، استقامت کے ساتھ رضائے حق پر ہے۔ مرکز حق میں قرار لے کر بہت ساروں نے جام شہادت نوش کیا جو بچ رہے وہ ساتھیوں کی موت کے رنج و مصیبت کے علاوہ دوسرے مشکلات میں بھی گھر گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ حال کب تک رہے گا لوگ کب تک اس کشمکش میں رہیں گے۔ کہاں جاکر یہ بات ختم ہوگی۔

اے خدا تعالیٰ۔ یہ عاد و ثمود نہیں کہ جنھیں تو سخت طوفان و ہوا سے ہلاک کررہا اور جڑ پیڑ سے اکھیڑ کر پھینک دے رہا ہے۔ یہ امت محمدیہ ؐ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے جس کے ساتھ تو فضل وکرم، مہربانی، آسانی کا وعدہ کر چکا ہے۔ ہماری سمجھ سے یہ بات باہر ہے۔ یہ سختی اس طرح تنگ پکڑنے میں تیری حکمت و مصلحت کیا ہے یہ تو ہی بہتر جانتا ہے یہ ہمارا ایمان ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ تو رحیم۔ لطیف ہے تیرا رحم تیری رحمتیں، مہربانیاں تیرے الطاف وعنایات کھلے اور چھپے ہیں۔ سب رحم کرنے والوں میں تو ایسا رحم کرنے والا ہے جس کے رحم کی انتہا نہیں۔ بات بہت آگے بڑھ گئی۔ مقصود اپنی ناتوانی وحشت وحیرانی لاچاری کا ظاہر کرنا تھا۔ ضعیفی خود ایک ایسی تکلیف دہ چیز، مستقل آزار ایسی علت ہے کہ جس کا کوئی علاج ہی نہیں اس پر طرہ وہ بیماریاں ہیں جو عجیب عجیب قسم کی عجیب عجیب طرح سے پیدا ہوتی جارہی ہیں تن بدن پر چھائی ہوئی اور ہر وقت اس گرے ہوئے کے ساتھ لپٹی رہتی ہیں۔ جن کے زور وغلبہ پا جانے سے بدن کی حرکت، دل کا سکون، وقت کی فراغت، حال کی سلامتی رفو چکر ہی نہیں بلکہ عدم کا راستہ لے چکی ہے یہ صحیح ہے کہ اس حقیر کی جسمانی صحت و قویٰ و اعضا ابتدا ہی سے کمزور ہیں۔ عمر بھر محنت مشقت ریاضت میں گذری، بڑھاپا آتے ہی بیماریوں نے گھیر لیا۔ ان کے علاوہ اور بھی سختیاں شدتیں ہیں ایسی صورت میں جو حال ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ (اللہ کا شکر ہر حال میں واجب ہے) صبر کے سوا چارہ نہیں۔ رضا وتسلیم سے بھاگ نہیں سکتے منہ نہیں موڑ سکتے بدن کی قوت، اعضا کی سکت، انحطاط (گھٹاؤ) کی طرف مائل ہے پورے طور سے گرا کر رکھدیا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی دل کی ہمت روحانی غذا حق تعالیٰ کا ذکر اس کی بارگاہ میں التجا، حضرت الوہیت میں توجہ علیٰ حالیہ ہے۔ اگر یہ مدد نہ کرتی تو

اتنی بھی قوت مجھ میں نہ رہتی محو مطلق اور گم ہوکر وجود کے دائرے سے عالم عدم میں کب سے چلا گیا ہوتا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھکو تیرے وصال کی اُمید زندہ رکھی ہوئی ہے یہ نہ ہوتی تو میں کب کا ہلاک وتباہ ہوجاتا۔ اس ضعیف کے حال کو تین صورتوں پر منحصر کردیں (۱) اس ضعف سے نکال کر قوت عطا کریں۔ اپنے حال پر لے آئیں (۲) چند دن اسی ضعف وناتوانی میں رکھو چھوڑیں بقا بخشیں (۳) اٹھالیں اور اس عالم میں لے جائیں جو حق ہی حق ہے۔ ہماری آرزو تو یہ ہے۔ حق تعالیٰ کی حکمت وقدرت کا جو اقتضا ہے وہی ہو جائے تو وہی بہتر ہے۔ ہم اس سے راضی ہیں اظہار حقیقت یہ کہ میں راضی ہوں اس سے جس میں اس نے مجھکو رکھا ہے اور جو کچھ باقی ہے اس کو بھی اپنی مرضی سے اچھا اور ٹھیک کردے۔ ہم راضی ہیں اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی اور خوشی سے اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ع

مابدست دوست دادیم اختیار خویش را

(ہم نے اپنے دوست کے ہاتھ میں اپنا اختیار دیدیا ہے)

اب تک ہم دل کو تسلی دیتے رہے کہ اگر توفیق ہوجائے تو اس ملک کی تنگی سے نکل کر سیروا فی الارض (زمین میں سیر کرو) کے حکم کے تحت اخلاص وصدق کے ساتھ مقام شریعت۔ موطن ارواح (جان کا وطن) مستقر قلوب (دل کا مقام) اہلِ فلاح (بہتری والے) کی طرف کوچ کریں گے پھر پھرا کر وہاں پہنچ جائیں تو وہاں سے پھر لوٹ کر نہ آئیں گے۔ باقی عمر وہیں گزار دیں۔ اب صبر کے سوائے اور کیا کرسکتے ہیں۔ ہجر (جدائی دوری) میں رہنے کے سوائے چارہ ہی کیا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کی انتہا

کیا ہوگی وہ اللہ ہے جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ چل کھڑے ہونے کی بگل کی آواز کانوں میں آرہی ہے غفلت کا موقع باقی نہ رہا۔ طبیعت کے لحاظ سے اگر احیاناً غفلت ہو جائے تو وہ اور بات ہے دعا توجہ میں برابر مشغول اور ہر وقت اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ اس بارگاہ کی ذرّہ نوازی پر نظر ہے۔ حقیقت میں دنیا والوں کی غفلت و ہوشیاری ایسی ہی ہے۔ جیسے کہ لشکر کا پڑاؤ کہ جب وہاں سے روانہ ہونے کے لئے شاہی حکم سے بگل بجایا جاتا ہے تو سب سفر کی تیاری میں لگ جاتے ہیں جہاں ٹھہرے تھے وہاں سے دل اٹھا کر چل چلاؤ میں رہتے ہیں اگر تھوڑی دیر کے لئے وہ آواز بند ہو جائے تو خاموش بیٹھ جاتے۔ غفلت میں آکر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بادشاہ کا حکم کچھ اور مدت کے لئے ٹھیرنے کا ہو گیا۔ جب پھر آواز آتی ہے تو چونک پڑتے ہیں آواز بند ہو جاتی ہے تو پھر غافل ہو جاتے ہیں۔ اسی میں عمر گذر جاتی ہے۔ ہوش میں آتے، غافل ہوتے جاتے ہیں۔ آخر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ چل دینا ہی پڑتا ہے۔ سفر کا سامان باندھنا اس کے ذریعے مہیا کرنا توشہ فراہم کرنا ضروری ہے۔ توشہ فراہم کریں یا نہ کریں اس سفر پر چلے جانا لازمی ہے۔ وہاں جانے کے بعد کیا صورت پیش آئے گی کیا معاملہ ہوگا وہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ وہاں بقا ہی بقا ہے۔ عیش ہی عیش ہے ذوق ہی ذوق ہے سرور ہی سرور ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (وہ ہر چیز پر قادر ہے قدرت رکھتا ہے)۔

(اکسٹھواں مکتوب)

مکتوب (۳۳)

مجاز حقیقت کا زینہ ہے

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

بعض فاضل حضرات میں سے ایک نے یہ رباعی لکھی۔ اپنے دوستوں سے اس کی شرح کی خواہش کی ہر ایک نے کچھ نہ کچھ لکھا۔ فقیر نے بھی اپنے طور و طریق سے اس کی شرح لکھی ہے وہ رباعی یہ ہے :۔

گفتم کہ دو بوسہ۔ زلب گفتا نے گفتم کہ بروز نے بشب۔ گفتا نے
گفتم کہ بجز۔ نے۔ تو نمی دانی ہیچ رو کرد بسویم زطرب گفتا نے

"گفتم کہ دو بوسہ دہ۔ زلب گفتا نے" (میں نے کہا کہ ہونٹوں کے دو بوسے دے کہا نہیں) یہ سالک کا سوال ہے جو محبت کے راستہ میں چل رہا ہے۔ دو مقام یعنی قرب (نزدیکی) اور وصل (ملنے) کا طالب ہے۔ بالمشافہ (آمنے سامنے ہوکر) آنکھوں سے حقیقت کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔ اور مشاہدہ کو مکالمہ (دیکھنے کو باتیں کرنے) کے ساتھ ایک کرنا چاہتا ہے، ہونٹوں کا بوسہ یعنی جب دو ہونٹ ملتے ہیں تو باتیں سننے میں آتی ہیں، بات یہیں سے نکلتی ہے صحو اور تمکین کا یہی مقام ہے۔ قوم (صوفیہ) اس میں مختلف ہے کہ مکالمہ مشاہدہ ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ یعنی وقت واحد میں یہ دونوں ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ دیکھتے ہوئے سن سکتے ہیں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے بعض کہتے ہیں کہ نہیں ہو سکتا۔ کتاب عوارف میں اس کے حق اور ثابت ہونے، اسی نسبت کے قائم رہنے میں گفتگو فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ دل کی بھی آنکھیں اور کان کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں

آنکھوں سے دیکھتا کانوں سے سنتا ہے آدمیوں کے لئے دیکھنا سننے کا مانع اور سننا دیکھنے کے مانع نہیں ہے۔ قطب الوقت شیخ ابو الحسن شاذلی قدس سرہ نے حزب کبیر میں کہا ہے کہ نسئلك مشاهدة تصحبا مكالمه۔ (ہم چاہتے تجھکو دیکھنا، اس طرح کہ تیری صحبت میں بات چیت ہو تجھ کو دیکھتے رہیں) سید کائنات علیہ افضل الصلوٰۃ اکمل التحیات کی معراج بھی اسی کو ثابت کرتی ہے۔ معراج کی مدعا غرض وغایت بھی یہی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ مشاہدہ وجہ اصطلام (جڑ سے اکھیڑ پھینکنا) استہلاک (طلب۔ ہلاک ہو جانا۔ ہلاکت) اضمحلال (نیست ہونا) ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ دیکھنے میں اپنے آپ سے جاتا ہی نہیں رہتا بلکہ ہلاک و نیست ہو جاتا ہے۔ حواس بجا نہیں رہتے' ان کے لئے سننے کہنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا۔ ندا کے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ بوسہ اشارہ ہے حصول ذوق کا شوق کے بعد بقا پانا ہے فنا کے بعد۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایک رمز (اشارہ کنایہ) ہو۔ کائن بائن صحو و تمکین کا۔ دوسری بات یہ کہ بوسہ موقعہ محل اپنے میں نہ ہونے کے بغیر نہیں ملتا۔

گفتہ نے (کہا نہیں) یہ محبوب کا ناز اس کی لاپروائی اپنے حسن کا غرور و گھمنڈ اور اس کی اپنی خوبی ہے۔ استحقاق و استحال کی نفی (حق ثابت کرنے۔ جائز ٹھہرانے کی منع) اور ایسی استعداد نہ ہونے اس سے بہت دور ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حرص دلانے' شوق میں لے آنے محبت کی آگ کو بھڑکانے کا یہ ایک بہانہ ہے۔ کوشش و سعی اسی کی تکرار میں رکھنے سے امیدوار بنانا' مقصود کے پانے مدعا کے حصول میں پہلے سے زیادہ کام میں لگا دیا جانا منظور ہے۔ تاکہ مطلوب تک انتہائی رغبت کے ساتھ آجائے اور اس میں انہماک پاکر مقصود کو حاصل کرلے۔ یہ ضرب المثل بھی ہے کہ ا

مَنۡ جَدَّ وَجَدَ (جس نے کوشش کی اس نے پایا) یہ بھی کہا گیا ہے کہ رد (روک) اور منع (مزاحم) حکیم و کریم کی عین اجابت وعطا ہے (قبول ہی قبول دینا ہی دینا ہے) حضرت سید شیخ ابوالعباس مرسی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ عام لوگ جب ڈرائے جاتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں ۔ امید دلائی جاتی ہے تو امید وار ہو جاتے ہیں بخلاف اس کے عارف جب ڈرائے جاتے ہیں تو امید وار ہو جاتے اور امید دلائی جاتی ہے تو ڈر جاتے ہیں۔ "گفتم کہ بروز۔نے ۔بشب گفتا نے" (میں نے کہا دن میں جواب دیا نہیں ، میں نے کہا رات میں جواب دیا نہیں) کمال کے مراتب کی طلب قرب و وصول کے درجات کی خواہش ، جب یہ توہم پیدا ہو جائے تو سمجھ لو ابھی سالک کے باطن میں خواہش نفس ۔مرتبہ و منزلت کی کچھ محبت رہ گئی ہے یہی وہ چیز ہے جو مقام تک پہنچنے کی روک ہو جاتی ہے کیونکہ اخلاص اور صدق کے بغیر وصول اور قبول ہاتھ نہیں آتا ۔بعض عارفوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک خواہشِ وصول جاتی نہ رہے کوئی ولی نہیں ہوتا ہے ۔ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ صدیقوں کے بہت سب سے آخر میں جو بات نکلتی ہے وہ مرتبہ کی چاہت یعنی اللہ کے پاس مرتبہ پانے کی خواہش ہے ۔جب یہ بات نکل جاتی ہے تو عذر خواہی میں آکر اس سے بخشش طلب کرتا اور عرض کرتا ہے کہ اس نعمت کی طلب اس مرتبہ پانے کی خواہش مجھ میں اس لئے نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو اظہار میں لے آؤں ۔شہرت دولت انوار و آثار کے ظہور اور خوارق ، کرامات دکھاؤں ، عالم کو نزدیک کھینچ لوں ، دونوں جہان کے شامل ہو جاؤں ، بلکہ اس لئے کہ جیسے اقطاب ارکان ولایت ملک و ملت کے بڑوں کے لئے کھلی اور آشکارا ہوئی ہے مجھ پر بھی ہو جائے ۔ مقام اولیاء

ایسی عشرت ہے جو اغیار کی آنکھوں سے چھپی ہوئی اور اندھیری رات کی خلوت ہے۔ بالکلیہ نیست و نابود چھپی ہوئی سے بھی چھپی ہوئی ہے۔ یہاں رازوں کا چھپانا ہے اسی طرح سے مجھ کو بھی مجلس قرب و وصول کا مشرف و مخلص بنا ڈال۔ جب کسی میں خلوص پاتا ہے تو اخلاص میں آکر اس کو خالص کر ڈالتا ہے اس کی عنایت ہو جائے تو ولایت خاص سے بھی اس کو مخصوص اور عزت کی قبا پہنائی جاکر وحدت کا مظہر کر دیا جاتا ہے۔ اس کو ایسا بنائے رکھتے ہیں۔ کہ کوئی اس کو نہ تو دیکھے نہ جانے۔ آخر یہ سب کیوں اس کا سبب کیا ہے۔ ہم کیا جانیں اس کو وہی جانے یا اس کا دوست جانے یا وہ جانے جو اس کا محرم (راز دار) ہو۔ بعض عارف جو درحقیقت اہلِ دانش سے تھے انھوں نے یہ کہا کہ اولیای تحت قبائی لایعرفھم غیری — میں نے اس عزیت کو جو غیری میں ہے صیغہ نسبت سے پڑھا ہے۔ تاکہ بیگانے نامحرم باہر ہو جائیں۔ یگانے اور محرم اندر رہ جائیں۔ ہاں ہاں سچ ہے ولی کو ولی ہی پہچانتا ہے۔ ٹھیک بات ہے بعض یہ کہتے ہیں کہ ولی جو یہاں کہا گیا ہے اس کو یہ سمجھو کہ وہ اللہ کے ناموں سے ایک اچھا نام ہے۔ اس سوال کے جواب میں بھی کہ دن میں نہ بھی رات ہی میں۔ بوسہ دینے کے جواب میں اس نے کہا کہ "نہیں" یہ اس کا کہنا یا تو ناز نخرہ گھمنڈ سے یا عاشق کی جان کو گھلانے پست کرنے یا پہلے سے اور زیادہ سعی و کوشش میں لگانے کے منشا سے ہو۔ یا اس کے ڈھا دینے کا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ حالات وہ ہیں جس سے شہود ذات کا مرتبہ جس کو محبتِ ذاتی کہتے ہیں وہ اس سے بہت اونچا مرتبہ ہے۔ جہاں نہ دن ہے نہ رات نہ وقت ہے نہ جہت۔ نہ زمان ہے نہ مکان۔ کوئی حدو قید نہیں۔" لیس عند اللّٰہ

صباح ولا مسا" (اللہ کے پاس نہ صبح ہے نہ شام) یہ شہرت دینا ہے چھپانا نہیں۔ لوگوں کا ہونا نہ ہونا۔ سب کچھ ایک ہی طرح سے ہے اور یہ جمع ہے۔ چنانچہ بعض عارفین نے یہ کہا ہے کہ جس نے ظہور کی خواہش کی وہ ظہور کا بندہ ہے جس نے خفا یعنی بطون کا ارادہ کیا وہ خفی کا بندہ ہے اور اللہ کا بندہ اس سے سوا ہے۔ وہ کچھ اور ہی ہے کہ وہ زیادہ چھپا ہوا اور زیادہ ظاہر ہے۔

"گفتم کہ بجز "نے" تو میدانی ہیچ"۔ (میں نے کہا کہ نہیں کے سوائے تو اور کچھ نہیں جانتا) جب ہر طرح سے مطلوب کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ جس راستہ سے بھی آنا چاہیں آنے نہیں دیا جاتا۔ نہیں کے سوائے کوئی جواب نہیں ملتا منع اور روک کے سوائے کچھ پیش نہیں آتا۔ تو ناز و نخرہ کرنے والے سے تنگ مجبور آکر بے صبری میں بے اختیار شکوہ و شکایت پر اتر آکر محبت کی زبان میں محبت کے انداز سے کہتا ہے کہ تجھ سے ہی تیری شکایت تجھ سے ہی تیرے پاس فریاد ہے۔ یہ اس لیے کہتا ہے کہ وہ مہربان ہو جائے۔ وہ اچھی طرح سے یہ جانتا ہے کہ ان سب صورتوں کے باوجود وہ سراپا مہربانی کرم ہی کرم ہے۔ قبول کرنا۔ قبولیت میں لے لینا لطف و عنایت کرنا اس کی عادت و سنت ہے پھر یہ لاپروائی بے توجہی کیوں، کیا تجھکو "ہاں" کہنا نہیں آتا۔ یہ نہیں نہیں کب تک۔ اس کی آخر انتہا کیا ہوگی تو ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ اور اس نے

"روکرد بسویم از طرب گفتا نے" (میری طرف منہ کرکے موج میں آکر خوشی کے لہجہ میں "نہیں" کہا) ناز کی ظاہرداری، نیاز کا دباؤ، محبوبی کا اثر، خوشحالی کا ذوق استغنا کی صفت کی اقتضا یہی ہے۔ اور اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ کہ ہاں ہاں تمہیں نہیں کے سوائے کچھ کہنا نہیں آتا۔ تو کہا کہ ہم یہی کہتے آئے

ہیں اور ہی کہتے رہیں گے۔ ہماری غناءِ ذاتی بھی اسی کی مقتضی ہے۔ ہمیں اسی پر ٹھہرائے ہوئے ہے۔ تیری کیا مجال کہ تو کچھ پا سکے یا تلاش کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیچ میں آجائے۔ مہربانی پر مائل ہو جائے۔ شاید یہ بھی بتانا مقصود ہو کہ تم جو سمجھ رہے ہو، ویسی بات نہیں۔ دکھانے کی باتیں اور ہیں کرنے کی باتیں اور ہیں، ہوتا کچھ اور ہے۔ دکھائی دیتا کچھ اور ہے۔ یہ ہماری مصلحتیں، ظاہرداریاں ہیں۔ باطن میں ہم سراسر محبت و لطف و کرم ہیں۔ جو تم چاہتے ہو اس سے بھی ہمارا کرم اور زیادہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن محبوبیت کا دبدبۂ حسن کا دباؤ معاملہ کی خوبی ہمیں یہ کرنے نہیں دیتی۔ اپنے ہمارے مقررہ آداب ہیں جس کے ہم اپنے آپ کو پابند بنا چکے ہیں وہ ہم کو اس سے نیچے آنے نہیں دیتے محبت ایک ہی ہے وہ اگر دو جگہ سے سر نکالے تو کیا۔ وہی محبت تم میں، وہی محبت ہم میں ہے۔ ہم میں غیریت کا محل اور تم میں دو ہونے کا تصور دونوں جانب میں کچھ اور ہی کیفیت کچھ اور ہی ظہور کے ساتھ ہے۔ تمہاری جانب سے عاجزی۔ نیازمندی اور ہماری جانب سے غنا اور تمار۔ باطن سے اگر دیکھیں تو دونوں بھی ایک دوسرے کے نیازمند ہی ہیں۔ ؎

نیازے ہست خوباں را بعاشق ۔۔۔ ولیکن محتجب در پردہ ناز

(معشوقوں کو عاشقوں کے ساتھ ایک نیاز ہوتا ہے۔ مگر وہ ناز کے پردہ میں چھپا ہوا رہتا ہے)

میل معشوقاں نہانست و ستیر ۔۔۔ میل عاشق با دو صد طبل و نفیر

(معشوقوں کا رُخ چھپا ہوا اور ستر میں ہے۔ عاشقوں کا رخ دو سو ڈھول اور بانسری کے ساتھ)

حقیقتاً ذوق و لذت اسی میں ہے۔ اگر نازہی ناز ہوتا تو عاشق کا وجود

ہی وجود میں نہ آتا. اگر نیاز ہی نیاز ہوتا تو معشوق کا وجود ہی وجود میں نہ آتا. نیاز سے عاشق ناز سے معشوق رونما ہے ؎

اے عاشق ناز ارجمنداں   معشوق نیاز مستمنداں
(عاشق نیک بختوں کا ناز ہے. معشوق عاجزوں کا نیاز ہے)

؎ چشم کرم تو عین ناز است   نازیکہ درو دو صد نیاز است
(تیری چشم کرم عین ناز ہے ۔ ایسا ناز کہ جس میں دو سو نیاز ہیں)

واللہ یدعوا الی دار السلام (اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف) نیاز ہے. ویھدی من یشاء الی صراط المستقیم (اور راہ دکھاتا ہے جس کو چاہتا ہے. سیدھے راستہ کی طرف) ناز ہے.

یہ چند باتیں تھیں جو فوراً ہی پیش نظر آگئیں ان باتوں کی شرح جو عقلمند لوگوں نے لکھی تھی اس طرح سے کر دی گئی. اسی رباعی کے دیکھنے کے بعد یہ خیال آیا کہ ہمارے دوست اصطلاحات صوفیہ' اہل وجود کے شیفتہ و فریفتہ ہیں. وہ سمجھ جائیں کہ کہنے والے کا منشا اور ارادہ کیا ہے وہ کیا سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے ۔ اور کس کس طرح سے اپنے ذوق اور محبت کے کرشموں کو بیان میں لانے کی کوشش کرکے مجازی کو حقیقی کی صورت میں لاکر حقیقت محبت کا بیان کر رہا ہے. یہ رباعی جو حقیقی معنی میں ہے لذیذ تر و شیریں ہے اس کے کہنے والے کے انفاس کو اللہ طیب کردے کہ یہ مجاز حقیقت کا سرمایہ اور حقیقت مجاز کی انتہا ہے. حقیقت ہی سے مجاز کا ظہور ہوا ہے اتمام و اکمال کی صورت پیدا ہوئی ہے. کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر حقیقت کہ کُنہ او خواہی   ظاہر اندر مجاز خواہد بود
(ہر حقیقت جس کی تو بہنہ چاہتا ہے وہ کھُلے طور پر مجازی ہے)

اسی قدر گفتگو کافی ہے۔ بات یہاں پہنچ گئی ہے اور سر اٹھاتی ہے کہ مجھے یہ ڈر ہو رہا ہے کہ کہیں باہر نہ آپڑے۔ واللہ اعلم۔ (پینٹھواں مکتوب)

مکتوب ۳۴

طلب مطلوب تڑپ بیچینی

اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

اَللّٰھُمَّ (اے میرے اللہ) میں ضعیف کمزور و کم قوت ہوں تو اپنی رضامندی وخوشنودی سے مجھے قوت دے دے۔ اپنی مرضی خوشی پر رکھ اپنی رضامندی کو میری غذا بنا دے، اس کو میرا روزینہ کر دے اسی سے مجھکو تقویت دے کمزوری کئی قسم کی ہوتی ہے جسم کی دل کی، یقین کی، عقل کی، نصیب کی۔ کمزوری خواہ کسی قسم کی ہو اور کوتاہیاں کسی طرح کی کیوں نہ ہوں، سب کی سب پھیلی اور رچی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے سے زیادہ تاریک ہوتی ہیں، توفیق کے انوار، دل کی ہمت و قرار قدم کی استواری کو ڈھانک لے کر ان پر چھا جاتی ہیں جس سے تھوڑی سی دیر کے لئے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ عقلمند و بزرگ اور دنیا کو چھوڑے ہوئے حضرات بھی باوجود ترک متغیر و متاثر ہو جاتے ہیں۔ ایمان و معرفت والوں پر بھی تھوڑی سی دہشت اور ذرا سے خوف کا وہم ہو جانے سے اپنی جگہ سے ہل جاتے، کچھ اور ہو جاتے ہیں عموماً حال دگرگوں ہو جاتا ہے، وعدہ و قرار کو بھول جاتے اور جس حال میں پہنچے تھے اس میں نہیں رہتے یقین کہ ابتدائی مرحلہ میں جو حال ہوتا ہے یہ اس لحاظ سے گمان ہی کے درجہ میں ہوتے

ہیں۔ لیکن ان کا علم اور اعتقاد ضرور باقی رہتا ہے یہ بہت بڑا نقص اور انتہائی عیب ہے انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا' اس لئے دعائیں کرتے ہیں اس مرتبہ میں مناسب حال دعاؤں عقل کے لحاظ سے صورتیں پیدا کرنے اور تکلف کے ساتھ اپنے آپ کو قائم و برقرار رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا' اس کا علاج صرف خوشخبریوں کی تائید غیب اور غیبی کے اشارات سے تقویت دینا ہے ؎

تو مرا دل دہ و دلیری بین   روبہ خویشتن خوان وشیری بیں

(مجھکو دل دے میری دلیری بہادری دیکھ۔ مجھکو اپنی لومڑی کہہ اور میری بہادری اور شیر ہو جانے کو دیکھ۔)

بدترین قسم کی بے صبری' قدم کی لغزش اور ثابت قدمی سے ہٹ جانا ہے۔ قدم میں فرق آجانا۔ خلل کے تصورات میں گھر جانا' یہ دنیا داروں کے زمانہ سازوں کا طریقہ ان کی رسم وعادت ہے اس لئے کہ وہ رعب داب کے ساتھ بادشاہی اور زور و غلبہ سے حکومت کرنے والے ہیں۔

میں اپنے آپ سے اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ اس پچیس سال کی مدت میں جو سفر مجاز کی دا سپی پر تونے اس شہر میں' اسی وضع پر یا اس کے قریب گزارا ہے' اور جب اتنے عرصے میں تونے کسی سے کوئی تکلیف یا آزار نہ دیکھا' کسی آزمائش میں مبتلا نہ ہوا تو پھر اب خوف کس بات کا ہے۔ خدا سے نیک گمان رکھ اور نڈر رہ ؎

محال است چوں دوست دارد ترا   کہ در دست دشمن گزارد ترا

(محال ہے جب کہ وہ تجھ کو دوست رکھے اور تجھ کو دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ دے)

اسی شرط اور اسی تعلق کے واسطہ سے کہا کہ جب وہ تجھکو دوست

رکھتا ہے جب کہ دوستی اور یقین کی حقیقت مبہم ہے معلوم ہی نہیں تو یہ اللہ ہی بہتر جانے کہ بات کیا ہے اکثر یہ وسوسہ شیطانی وہم کے تصرف اس کے صورت بنانے سے ہوتا ہے کہ معدوم کو موجود کے حکم میں لا لیتا معدوم کو موجود جانتا۔ موہوم کو معقول کی صورت دے دیتا ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ھَادٍ (کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے لئے کافی نہیں اس کے سوائے جو ہیں ان سے تجھے ڈراتے ہیں جس کو اللہ۔ گمراہ کیا اس کا کوئی ہادی راستہ بتلانے والا نہیں) چنانچہ اس درد اسی کمزوری کا علاج یہ کہا گیا ہے

ہمتم بدرقہ راہ کن اے طائرِ قدس ۔۔۔ کہ دراز است رہ مقصد و من نوسفرم

(میری ہمت کا ساتھی پاک اُڑنے والوں کو کردے۔ راستہ دور کا ہے اور میں ابھی ابھی پہلے سفر کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔)

جب تنگ دلی، بے حوصلگی۔ وحشت۔ نفرت اس مرتبہ تک پہنچ جاتی ہے تو بارہا سفر کا خیال آنے لگ جاتا ہے تاکہ اس محنت کے تنگ میدان سے نکل کر سینہ کی کشادگی حاصل کرے۔ عمر کا باقی حصہ ان مقامات میں کہ امن و سلامتی آرام کی جگہ، ایمان و امانت کے وطن ہیں حرماً امناً یتخطف الناس من حولھم۔ والذین تبوّاء الدّار و الایمان (حرم امن کی جگہ ہے اطراف سے لوگ جھپٹے پڑتے ہیں جو ایمان میں ثابت قدم ہیں وہ اسی طرف لوٹتے ہیں) جن کی شان میں وارد ہے ان مقامات اور ان میں رہنے والوں کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ وہیں گزاردوں اور اپنی فطرت کے اثاثہ اور اپنے حال کے نقد کو غیروں کے ڈر سے اور دنیا والوں کے جھپٹ لینے سے بچالوں۔ حکم پر بھروسہ اس کا مطابق کرنا۔ تنہائی دخلوت کا خیال اس سفر کا بنیادی تصور

ہے۔ اسی کا خطرہ آتا ہے تو حرکت میں لاتا ہے۔ دوست و اغیار کی صحبت کا ترک دوستوں اور ملک کی محبت سے تعلق کا ختم کرنا تدبیر و اختیار کی پابندی سے چھوٹ جانا اس سفر اور اس کام کے مانع آتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ انہی چیزوں سے الگ ہونے کے لئے یہ سفر کیا جاتا ہے اس سفر کا مطلب و مقصد یہی ہوا کرتا ہے ؎

سوئے صحرا نہ ازپئے سیر و تماشا میروم　　　شہر بر من بے تو تنگ آمد بصحرا میروم

(جنگل کی طرف سیر و تماشہ کے لئے نہیں جاتا۔ تیرے بغیر شہر میرے لئے اجاڑ ہے اس لئے جنگل میں جاتا ہوں)

وہ بھی اس کے لئے راضی ہو جائیں گے۔ امیدوار ہوں کہ یکایک یہ صورت حال اور یہ خیال تدبیر کے موافق ہو جائے گا اور یہ بات اس درگاہ کی خوشنودی و مرضی کے قریب ہو جائے گی اور امر کے خلاف کرنے کی بھی کوئی صورت نہ ہوگی۔ حال کی پیشانی پہ بھگوڑے، بے صبر کا داغ نہ لگا دیا جائے گا۔ اگر یہیں ہاتھ پکڑ کر بٹھا رکھیں اور فرمائیں کہ یہیں رہ کہیں اور نہ جا تو ایسی صورت میں بھی مقصود حاصل ہے یہیں رہوں گا۔ یہاں سے نہ ہلوں گا۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ و نتیجہ صرف ایک بات ہے وہ یہ ہے اس طرف کا اشارہ درکار ہے۔ ؎

اگر دست گیری بجائے رسم　　　اگر بفگنی بر نگیرد کسم

(اگر میرا ہاتھ تھام لے تو کسی جگہ پہنچ جاؤں۔ اگر پٹک دے تو کوئی مجھے نہ اٹھائے)

میرا حال اسی قدر ہے جس کو میں نے کہدیا۔ دوسری بات تو آپ جانتے ہیں وہ یہ کہ ساری پریشانی سرگردانی بے چینی، تڑپ دو باتوں سے ہو رہی ہے۔ پہلی بات یہ کہ جوہر استعداد، جو محبت ذاتی کے لئے درکار ہے وہ مجھ میں

بالکل نہیں۔ اس سے بالکل خالی و بے نصیب ہوں۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ
کمال کا طالب ہوتے ہوئے بھی نفس میں گرفتار ہے سب کچھ اپنے لئے حاصل
کرنا چاہتا ہے۔ جو کچھ کاملوں نے کہا اس کو سچ سمجھ کہ جناب عزت مطلوب
بالذات و محبوب مطلق ہے وہی اس کا سزاوار ہے۔ نفس کی خاصیت یہ ہے
کہ وہ جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کے بدلہ پر نظر رکھتا ہے۔ ہر کام کی غرض و
غایت کو سوچتا ہے۔ بڑا بھیک منگا، چور، کمینہ، جلدباز، تھڑ ولہ، بے صبر
واقع ہوا ہے۔ یہاں ایک بات سمجھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ مقصد جو حاصل نہیں ہوتا
اس میں شاید یہ حکمت ہو کہ جو خواہش کہ وہ رکھتا ہے اس کے نتائج اور بدلے
اعمال و افعال کے ذریعہ جب ظہور میں نہیں آتے تو نظر اعمال و افعال پر
سے اٹھ جاتی ہے۔ یہ نظر میں نہیں رہتے۔ جب ان پر سے بھروسہ اٹھ جاتا
ہے تو یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان سے کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فضل کرے تو
سب کچھ ہو جاتا ہے یہ بات جب اس کے دل میں اعمال و افعال کے کرتے
ہوئے خوب جم جاتی ہے تو اس میں ذات کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ بدلے
اور ثواب وغیرہ پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ ذات پر اور اس کے فضل و کرم پر نظر
لگی ہوئی رہتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ سب نفس کی تسلی کے لئے پیدا
ہوتی ہوگی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اسرار و انوار کا ہاتھ نہ آنا، اس کے
نتائج اور مفاد کا نہ ملنا اخلاص نہ ہونے اور شرائط کے ساتھ اعمال پورے
نہ ہونے عمل کرنے والے میں استعداد و قابلیت کے نہ ہونے سے ہوا کرتا ہے
کیونکہ قرب الٰہی اور اس کی درگاہ میں خصوصیت پانے کے عمل اور کام کچھ اور
ہی ہیں اور اس کی قابلیت اور قبول اور ہی کچھ ہے۔ مصرعہ

ہر تیرہ دروں قابل اسرار نباشد

(ہر وہ شخص جس کے باطن میں اندھیرا ہو وہ اسرار کے لائق نہیں ہوتا) ۔
یہ ساری باتیں. اس مسکین کے حال کے مطابق ہیں. یا یہ ہو کہ رنگ کچھ اور ہے جس کی وجہ سے اس کا حال ایسا ہے۔ اگر علیحدہ ہو جائے کنارا کرلے شفاعت، قابلیت، قبولیت جو کچھ رکھتا ہے اس کے لحاظ سے اس کو معذور رکھ ۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ ایک ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح سے واپس نہیں ہوتا ۔کسی گناہ سے فکرمند نہیں ہوتا تو اس کو قبول کرلیا جاتا ہے ۔ اَللّٰھُمَّ اعوذ بك من الرد بعد القبول ومن المقطع بعد الوصول و من الخيبة بعد الرجا و من المنع بعد العطا واعوذبك من الجور بعد الكور۔ (اے میرے پروردگار میں تیری پناہ چاہتا ہوں ردسے قبول کے بعد ۔ جدائی سے ملنے کے بعد۔خوف سے امید کے بعد۔ نہ دینے سے دینے کے بعد وفا کے بعد جفا سے نور کے بعد اندھیرے سے) وحشت تنگ دلی پریشانی کا سبب رفیق کا ہاتھ نہ آنا ہے۔ راستہ کی تکالیف کا اتنا صدمہ و رنج نہیں ہوتا۔ جتنا کہ رفیق کے نہ ہونے کا ہوا کرتا ہے چنانچہ فرمایا گیا کہ جو راستہ سے لوٹ گیا۔ وہ رفیق ساتھ نہ ہونے رفاقت نہ دینے سے لوٹ گیا۔ نعوذ باللہ من الرجوع والادبار (پناہ مانگتا ہوں اللہ کی ۔ ایسے لوٹنے سے جو تباہی (ادبار) میں لے آئے میں ایک بھی ایسا نہیں پاتا جو اس راستہ میں میرے حال کا رفیق بنے میرا ساتھی ہو جائے رفاقت دے سکے ۔ ہر شخص چھوٹے بڑوں میں سے طالب علم و مشائخوں میں سے آپس میں ایک دوسرے کے مصاحب و مزاج دار ہوا کرتے ہیں۔ مطالب و مقاصد کی پے میں لگے ہوئے کوشش و سعی کرتے ہیں یہ سب کو میتسر ہے ۔ اگر نہیں ہے تو اس مسکین کو کہ وہ تنہائی کے کونہ میں دل کو ناکامی و نامرادی سے

لگائے ہوئے پڑا ہے ؎

ہر کس گرفتہ دامن ہمت بلند خویش ــــــ مائیم و گوشہ و دل دردمند خویش

(ہر ایک اپنی بلند ہمت کا دامن تھامے ہوئے ہے۔ اور ہم ہیں کہ ایک کونہ میں اپنے دردمندوں کے ساتھ ہیں۔

اس مرتبہ ایسی صورت میں دو باتیں دل میں آتی ہیں ایک تو حسرت و ناامیدی کہ جب سب لوگ اتفاق کے ساتھ ایک طرف جا رہے ہیں ایک جگہ جمع ہیں ممکن ہے کہ اس میں فضیلت، برکت مخصوص ضرور ہو گی شاید اکیلا چلنے والا محروم و مہجور ہو گا۔ دوسری امیدواری یہ کہ جب سب سے الگ ہو کر کنارہ کر کے جدا ہو گیا جدائی میں آگیا تو انشاء اللہ تعالیٰ ایک مخصوص نعمت سے ممتاز ہو جائے گا۔ جو دوسروں کے لئے نہیں۔ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) ہر چیز اس کی قدرت، اس کے اختیار میں ہے، جو چاہے کرے ہر چیز کے کرنے پر قادر ہے۔

سُبحانَ اللہ (پاک ذات اللہ) ابتدائی حال میں راستہ کی شدت سے آگاہ نہ تھا قسمت اور تقدیر پر نظر نہ رکھتا تھا۔ امیدیں تازہ تھیں۔ اور عمل بے انتہا و بے اندازہ تھے۔ اپنی نادانی اپنے جہل میں جہل و نادانی سے دعا کیا کرتا تھا کہ رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (اے میرے پروردگار عطا کر مجھکو ایسا ملک کہ میرے بعد کسی کو نہ ہو تو دینے والا بخشش کرنے والا ہے) یہ سمجھتا اس تصور میں تھا کہ احدیت، واحدیت قادریت احمدیت کے مراتب کے سوائے سب مراتب مل سکتے ہیں اور جب چلنے سے رہ گیا۔ حال سے دور ہو گیا تو اپنی قدر و قیمت پہچان گیا۔ راستہ کی سختی، دشواری اس کی لاپرواہی کو پایا، تو یہ سمجھ گیا کہ ہر ایک کے لئے ایک معین حد، ایک ٹھہرایا

ہوا نصیبہ ہے۔ اس سے زیادہ کی ہوس و آرزو کرنا فائدہ مند نہیں۔ خود کو ہزاروں آرزوؤں کے ساتھ طالبوں میں رسائی پالئے ہوئے حضرات کے پاس رکھنا ہے تاکہ ان کے ساتھ ان کے طفیلیوں کی طرح کچھ نہ کچھ پائے کسی نہ کسی مرتبہ پر پہنچ جائے۔ اَللّٰھُمَّ مَا وعدت من خیر لاحد من عبادک اذا اعطیتہ فنا ارغبنا الیک اسالک یا ربّ العٰلمین (اے ہمارے اللہ جو تو نے کسی سے خیر کا وعدہ کیا اپنے بندوں میں سے جب تو اس کو دے تو ہم بھی اس کے لئے تیرے طرف راغب ہیں۔ ہم مانگتے ہیں تجھ سے اے دونوں جہانوں کے پروردگار) امید ہے کہ محروم نہ رکھے گا۔ نامید واپس کردیا نہ جائے گا۔ بات بہت دور تک پہنچ گئی جو کہنا تھا وہ رہ گیا اور وہ بہت ہے۔ مختصر یہ کہ حق تعالیٰ کی نعمتیں جو حاصل ہیں وہ بے نہایت ہیں اور جو حاصل نہیں ہوئیں۔ وہ بھی بے نہایت ہیں۔ تمام نعمتوں کا راز سارے مطلب کا نچوڑ یہ کہ استقامت کے راستہ سے قدم کانپ نہ جائے۔ طلب کا جوش اور سرگرمی بیٹھ نہ جائے جو کچھ نصیب میں ہے وہ مل کر رہے گا۔ وَالنَّصِیبُ یُصِیبُ وَاللّٰہُ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ۔ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ھذاۃ الطریق وھو محی علوم الدین۔ (باسٹھواں مکتوب)

مکتوب (۳۵)

خوشبو نرم ہوائیں

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلَہٗ

زنسیم جاں فزا یت دل مردہ زندہ گردد ۔ زکدام باغے اے گل کہ چنیں خوش است بویت

(تیری جان کو بہلانے والی ہوا سے مرے ہوئے دل زندہ ہوجاتے ہیں کس باغ کا تو پھول ہے کہ تیری خوشبو اتنی اچھی ہے۔)

حق جلّ وعلیٰ آپ کے دماغ کے وقت وصال کے شامہ (سونگھنے کی طاقت) کو عنایت کی خوشبودار لپیٹ اور کرم کی ٹھنڈی خوشبودار ہواؤں سے تازہ معطر رکھے۔ کتاب فتوح الغیب کے مطالعہ سے کہ کلام کرامت نظام حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ ہے جس کی یہ حقیر شرح کرچکا ہے' توفیق پایا ہوا ہے۔ ایک اچھا وقت رکھتا ہے۔ ایک موقعہ اور محل سے اس کتاب کی شرح میں یہ بیت مذکور ہوئی تھی ؎

عکس روے تو چو در آئینہ جام افتاد ۔ عارف از خندہ مے در طمع خام افتاد

(تیرے چہرہ کا سایہ جب پیالہ کے آئینہ میں پڑا۔ شراب کے ہنس دینے سے عارف ناقص لالچ میں پڑگیا)

اس شعر میں جو مضمون ہے اس کی دریافت اس سے ذوق پانے کے شوق میں تھا کہ شراب اور اس کی ہنسی کا کیا مطلب ہوگا اس سے کیا مراد لی جاسکتی ہے' کانچ کے پیالہ میں محبوب کے چہرہ کا عکس پڑنے' شراب کی ہنسی سے عارف کا بیکار لالچ میں آجانا کیا ہوسکتا ہے اسی سوچ میں تھا کہ آپ کے بھیجے ہوئے پھول پہنچے۔ پھول پھل کا جمع ہوجانا مسرت بڑھانے

مستی میں لانے کی ایک وجہ ہوگیا۔ وقتیہ موج سے خوشوقتی ہاتھ آگئی۔ بہار کا موسم ہے جنون کا سودا زوروں پر ہے۔ اندرونی جوش اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ اپنے گھر کے کونے میں تنہائی و غربت میں ایک سرور حاصل ہے۔ اگر غلبہ پا جائے اور تکلف اٹھ جائے تو شائد کچھ باہر آ پڑے لیکن اب تک تو پردے ہی میں ہے۔ ؎

تا کے غم دل گفتہ ام در خانہ بادیوارہا خواہم زد از بے طاقتی فریاد در بازارہا

(بہت کچھ اپنے دل کا غم اپنے گھر کی دیواروں سے کہتا رہا۔ اب بے طاقتی و بے صبری سے بازاروں میں چلانے فریاد کرنے کا ارادہ ہے۔

ایسا کرنے سے ادب روکے ہوئے ہے عشق معاملہ کرنا چاہتا ہے آخرش لاچاری بے طاقتی بے صبری کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کچھ معلوم نہیں۔ وقت کی موافقت میں یہ باتیں زبان پر آگئیں امید کہ معذور رکھا جائے گا۔ اگر اس معیت کے معنیٰ جو ذوق رکھتے ہیں۔ جیسی کچھ ہیں وہ وقتیہ طور سے آگئی ہیں اس لئے لکھے جاتے ہیں۔ پیالہ سے مراد عارف کا دل ہے جو محل تجلی ذات ہے۔ اس لحاظ سے اس کو آئینہ کہا گیا۔ چہرہ کا عکس یعنی سایہ کا پڑنا تجلی حق کی طرف اشارہ ہے۔ جب یہ تجلی عارف کی روح کی شکل میں ہوئی تو اس کے پھیلنے اور شباہت میں آنے کا سبب بن گئی کہ وہ ایسے وقت میں اپنے آپ کو حق کا عین پانے سے اتحاد کے توہم میں گھر جاتا ہے۔ اس لئے اس کو ناقص پالا کہا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ شراب اور پیالہ ہم رنگ ہو جانے سے نہ تو شراب ہی معلوم ہوتی نہ پیالہ ہی پہچانا جاتا ہے جس کو اس رباعی میں کہا گیا ہے۔ ؎

از صفائے مئے و لطافت جام بہم آمیخت رنگ جام و مدام

(شراب کی صفائی پیالہ کی لطافت سے دونوں کا رنگ آپس میں مل گیا)

ہمہ جام است نیست گوئی مے　　یا خمر است نیست گوئی جام

(پیالہ ہی پیالہ ہے شراب نہیں ہے۔ یا شراب ہے پیالہ نہیں ہے) وہ آپس میں متحد ہو گئے۔ ایک سے دکھلائی دئے۔ تمیز اٹھ گئی فرق باقی نہ رہا یہ سکر و بے تمیزی کی صورت حال ہے۔ معرفت تو یہ ہے کہ یہ جانیں کہ شراب اور ہے پیالہ اور ہے وہ ظاہر ہے اور یہ مظہر۔ توحید شہودی کا یہی مقام ہے۔ محبت کے غلبۂ حال میں ڈوب جانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے توحید وجودی کا مقام یہ ہے کہ وہ سب کو ایک جانتا ہے۔ اللہ ہی حقیقت حال کا جاننے والا ہے۔ بعض علمائے عارف کہتے ہیں کہ توحید شہودی ہوتی ہے وجودی نہیں ہوا کرتی۔ یہی راستہ سلامتی کا راستہ ہے۔　　(سینتیسواں مکتوب)

مکتوب (۳۶)

عارفین اہل صدق یقین کے اقوال

اَللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ

بعض مشائخ قدس اللہ اسرارہم کے اقوال دیکھنے میں آئے جو اس راستہ کے طے کرنے میں نفع بخش ہیں۔ اس حقیر کے لئے ان کو تحریر و عبارت میں لانے کے سوائے کچھ نصیبہ نہیں۔ لیکن لکھنے ہی کے طفیل میں اس سے نصیبہ مل جانے کی امید میں یہ (پیش قدمی) کی ہے اور اکثر میری تالیفات کا یہی حال ہے نگینہ کو جڑ دینے کے سوائے کچھ نہیں جانتا۔ خلق کا فائدہ مقصود اور وقتیہ

ذوق کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لکھنے والا کہنے والا کوئی بھی ہو۔ اس کو نہ دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ وہ کیا لکھ رہا کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی کہی ہوئی دہرائی ہوئی باتوں کو دیکھو، لکھنے کہنے والے کو نہ دیکھو۔

اے عزیز۔ حق کے سوائے کسی پر بھروسہ نہ کر، تاکہ تجھ کو شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ حق سے غافل نہ رہ، تاکہ شیطان تجھ پر قابو نہ پا جائے۔ کسی بات یا چیز سے مغرور نہ ہو جا گھمنڈ میں نہ آ جا کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ہلاک ہو جائے۔ دل کو حق کے سوائے سب سے خالی کر لے تاکہ راحت پائے۔ حق کے کام میں رہ تاکہ تیرا کام بن جائے۔ دنیا کے کاموں میں ضرورت کے موافق اہتمام کر لیا کر تاکہ وہ تیرے لئے کافی ہو جائیں۔ دنیا میں کسی سے دل نہ لگا، تاکہ نقصان و خسارہ سے بچ جائے۔ کسی کا عیب نہ دیکھ ایسا نہ ہو کہ تو خود عیب میں مبتلا ہو جائے۔ تنگی سختی میں صبر کر، تاکہ کشادگی آسانی منہ دکھلائے۔ سب سے نا امید ہو جا۔ تاکہ تیری امید بر آئے۔ ریا (ظاہرداری۔ دکھاوا) مت کر تاکہ تجھ کو اخلاص (سچے دل سے) کرنا ہاتھ آ جائے خلوص کے ساتھ ہر کام کر، تاکہ فوراً بدلہ پا لے۔ دنیا طلب نہ کر ایسا نہ ہو اس سے دل تباہ نہ ہو جائے۔ تھوڑے پر قناعت (بس کر) کر تاکہ تجھ کو محنت اٹھانی نہ پڑے۔ اور محنت سے چھٹکارا پا جائے۔ کسی کی رنجیدگی یا آزردگی کی خواہش نہ کر کہیں ایسا نہ ہو کہ تو رنجیدہ آزردہ ہو جائے۔ کسی پر کینہ کپٹ کا الزام نہ رکھ ایسا نہ ہو کہ تو ذلیل و خوار ہو جائے۔ دنیا کے لئے فکرمند رنجیدہ نہ رہ کہ یہ تیرے لئے پریشانی کا سبب نہ ہو جائے۔ نعمت کی قدر پہچان کہیں ایسا نہ ہو کہ ناقدری کی وجہ سے وہ تجھ سے واپس لے لی جائے۔ سب سے جدا اور الگ ہو جا۔ تاکہ تجھ کو حق سے اُنس (لگاؤ۔ رابطہ) ہو جائے۔ کل کا غم نہ کھا۔ تاکہ تیری امیدیں کم ہوں۔ گھٹ کر

رہ جائیں۔ موت کو اکثر یاد کرتا رہ۔ تاکہ تیرا دل دنیا سے مشغول نہ ہو جائے۔ جلال نعمت کی خواہش ہے تو گناہ کو چھوڑ دے۔ کسی سے توقع نہ رکھ تاکہ عزت پائے عاجزی اختیار کر تاکہ بزرگی نصیب ہو جائے۔ اپنے آپ میں نہ دیکھ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو نیچے آ جائے۔ لوگوں سے علیحدگی تنہائی اختیار کر تاکہ حق سے تجھے اُنس پیدا ہو جائے۔ دین و دنیا کی نعمت چاہتا ہے تو حق تعالیٰ کا شکر بجالا۔ اگر اماں چاہتا ہے تو بے فکر رہ۔ اگر ہمیشہ کا عیش چاہتا ہے تو حق کے ساتھ رہا کر۔ بزرگوں کی خدمت کیا کر تاکہ مخدوم ہو جائے بزرگی پائے۔ بزرگی کو پہنچ جائے اگر عافیت کی طلب ہے تو صبر اختیار کر خود کو حق کے سپرد و حوالہ کر دے تاکہ شرمندہ ہونا نہ پڑے۔ اگر دولت چاہتا ہے تو صاحب دلوں کا دامن تھامے رہ۔ آہستہ چل تاکہ تھک نہ جائے۔ اپنے آپ کو کسی قسم کی کوئی قدر و منزلت نہ دے تاکہ تیری قدر و منزلت ہو۔ دنیا داروں سے پرہیز کر تاکہ تیرا دل تاریک (کالا) نہ ہو جائے تیرے دل پر سیاہی داغ دھبہ نہ آ جائے۔ تھوڑے پر قناعت کر تاکہ دولتمند ہو جائے۔ ہمت بلند رکھ تاکہ تیری قدر و قیمت بڑھ جائے۔ کسی کے کہے ہوئے کو نہ پکڑ تاکہ تو پکڑا نہ جائے۔ حق کو رفیق بنالے تاکہ تو بھول نہ جائے، گھمنڈ میں نہ آ جائے۔ حریص نہ رہ تاکہ خوار نہ ہو جائے۔ اپنے کردار کی قیمت مقرر نہ کر تاکہ تو قیمتی ہو جائے۔ اگر معرفت نصیب ہونی ہے تو کسی کو بُرا نہ دیکھ، کسی میں بُرائی نہ دیکھ سب سے زیادہ مفلس ہو جا تاکہ درجۂ محبت ملے، دروازہ پر پڑا رہ تاکہ تیرے لئے دروازہ کھولا جائے۔ کسی چیز کے خیال میں نہ رہ تاکہ تو آزاد ہو جائے۔ سچائی طلب کر تاکہ راحت پائے۔ حرمت کی نگہبانی کرتا رہ تاکہ محروم نہ ہو جائے۔ ایسا معاملہ کر جس میں تیرا فائدہ ہو غصہ کو پی جا تاکہ راحت پائے۔ مسکین رہ تاکہ مقبول ہو جائے کام خلوص اور اخلاص کے ساتھ کرتا رہ

تاکہ عاقبت میں پشیمانی نہ ہو۔ اگر کام میں ہے تو دوسروں کا کام۔ اگر بیکار ہے تو فارغ بیٹھ جا۔ تاکہ باعزت ہو جائے۔ اپنے ماتحتوں پر، کمزوروں پر شفقت کر۔ تاکہ تجھ کو رہائی نصیب ہو جائے جلدی چھوڑ آہستگی اختیار کر تاکہ شیطان تجھ پر فتح وظفر نہ پائے۔ دل کو قابو میں کر لے تاکہ حق کی خوشنودی پائے تھوڑے ہی میں معاملہ کر تاکہ تیرا عیش تلخ نہ ہو جائے۔ سب کے ساتھ آسانی برت تاکہ تو بھی آسانی کے ساتھ چھوٹ جائے۔ دوسروں کو اپنے سے بہتر جان تاکہ اپنے آپ سے چھٹکارہ ملے۔ سختی چھوڑ ایسا نہ ہو کہ سب تیرے دشمن ہو جائیں۔ سب سے نرمی کر سب کا دوست رہ اگر مرد ہے تو اپنے آپ سے انصاف طلب کر۔ جوان مرد ہے۔ تو حق کو یاد کرتا رہ تاکہ تیرا دل ویران نہ ہو جائے۔ گرے ہوؤں عاجزوں کو پا تاکہ تو گر نہ جائے، عاجز نہ ہو جائے۔ گرے پڑے ہوؤں کو نہ چھیڑ تاکہ تو گرا پڑا ہوا نہ ہو جائے۔ دنیا کی طرف نہ دیکھ کہیں ایسا نہ ہو کہ تو دنیا کی طلب میں اندھا ہو جائے۔ اگر طالب ہے تو حق کے سوائے کچھ نہ سوچ کسی فکر ذکر میں نہ رہ اس کی مرضی کے خلاف جو کچھ ہے اس کو ترک کر دے تاکہ سلامت رہ جائے، سلامتی پا جائے۔ خدا تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہ کر تاکہ گنہگار نہ ہو جائے۔ عاجزوں کمزوروں کی مدد کر تاکہ تیری بھی مدد دستگیری ہو جائے۔ ترک کی لذت لے تاکہ لذت پائے۔ اپنا انصاف آپ کر تاکہ ظالم نہ ہو جائے۔ وہ کام کیا کر جو حق کو پسند ہوں جو کچھ حق کو پسند ہے اس میں کسی سے لڑائی تُو تُو میں میں نہ کر تاکہ کینہ سے نکل آئے جو تجھ سے بدی کرے اس کے ساتھ نیکی کر۔ جو تجھ سے بُرائی کرے اس کے ساتھ بھلائی کر تاکہ تیری قدر بڑھ جائے۔ ہوشیار رہا کر تاکہ گھر میں چور نہ آئیں اتنا اٹھائے ہوئے چل جس کو تو منزل تک لے جا سکے۔ قافلہ کے ساتھ چل کر چور

مل جائے۔ اپنا کام چھپا ہوا رکھ اس کی قیمت مقرر ہو جائے۔ خدا کے دوستوں کے ساتھ دوستی کرتا کہ عاقبت کا سودا ٹھیک ہو جائے کسی چیز پر قرار نہ لے۔ اگر محبت رکھتا ہے تو اسی کی رٹ لگائے رہ تو اپنا نفع و نقصان نہیں جانتا اسی لئے پریشان ہے، دل کو قابو میں کرے۔ اگر تجھ سے ہو سکے تو خود کو کہیں نہ لے جا تاکہ تو ایسی جگہ پہنچ جائے کہ جہاں کہ پہنچنا ہے۔ اگر تو دریا ہے تو اپنے آپ کو بالکل چھوٹا سا قطرہ سمجھ لے۔ فقیروں کے ساتھ بیٹھا کر۔ اگرچہ تو بادشاہ ہو۔ وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہٖ محمد و آلہٖ اجمعین۔ (اڑسٹھواں مکتوب)

مکتوب (۳۷)

وِرد اَوراد

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

حکم بن عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "جب تم کسی بندے کو دیکھو کہ وہ ورد و اوراد میں ہمیشہ رہا کرتا اور بہت دیر تک رہتا ہے تو اس کو حقارت سے نہ دیکھو کہ وہ اللہ کے کام میں لگا ہوا ہے۔ عارفین کی خصوصیات محبت والوں کی خوبیاں اگر اس کی پیشانی سے ظاہر نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں خدا کے کام میں لگے ہوئے رہنا ہی خود بڑا کام بہترین بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ ورد اوراد میں لگایا ہوا اور اسی میں منہمک (ڈوبا ہوا) ہے۔ اللہ شانہٗ جلّ جلالہ کے خاص بندے۔ دو قسم کے ہوتے ہیں مقربین اور ابرار۔

مقربین وہ ہیں جو اپنی مرضی، خوشی اور اپنے ارادہ سے نکل کر مولیٰ تعالیٰ کی مرضی خوشی اس کے اختیار و ارادہ پر ٹھہر جاتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی مرضی

خوشی اختیار ارادہ باقی نہیں رہتا۔

ابرار وہ ہیں جن میں ان کی مرضی، خوشی ان کا ارادہ کچھ باقی رہ جائے یہ بالکلیہ اس میں فانی نہیں ہوتے مولیٰ تعالیٰ وتقدس انھیں مقامِ طاعت و عبادت میں ٹھہرائے اسی پر قائم اسی میں لگائے رکھتا ہے دنیا اور آخرت میں انھیں اعلیٰ مراتب، بلند درجات پانے کے لئے مخصوص کر دیتا ہے نورانیت یقین و ایمان کی امداد ان کے شامل حال ہونے اور اس کے اقتضاء سے اس مقام میں انھیں قیام عطا فرما دیا جاتا ہے۔

جب تم کسی بندہ کو دیکھو کہ جس کو اللہ سبحانہ' تعالیٰ نے ورد اور اورادِ نیک اعمال میں لگا دیکر ہمیشہ کرتے رہنے کی توفیق عطا فرمائی اور اس کو اس مقام پر قائم و برقرار رہنے کی طاقت بخشی ہے اور وہ اس میں استقامت پاکر ہمیشہ کرتے رہنے کی توفیق سے سرفراز ہے تو اس کو ہرگز حقیر اور کم مرتبہ کا نہ سمجھو عارفوں کی خاص خصوصیت محبت والوں کی خوبی و تازگی کے علامات و نشانات اس کے حال سے کھلے طور سے ظاہر نہ ہونے کے باوجود یہ یقین سے ثابت ہے اور جاننا پڑتا ہے کہ کھنچ جانے 'جذب ہو جانے کی آرزو اس کے باطن میں ضرور ہے کیونکہ حرکت کا سبب ٹھہرے رہنے کی اقتضا' ہمیشہ کرتے رہنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو چکی ہے۔ اگر یہ اس کی رٹ نہ ہوتی یہ بات اس کے دل میں نہ اترتی توفیق کا نور اس میں نہ چمکتا تو اس کو ورد و اوراد میں ہمیشہ رہنا، اسی میں ڈوبے رہنا ہاتھ نہ آتا یہ مسلّمہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو ہدایت نہ دیتا ہم ہرگز ہدایت نہ پاتے نہ روزہ رکھتے نہ نماز پڑھتے۔ جب کوئی عام طریقہ سے بارگاہ حق تعالیٰ میں نسبت لگاتا، اس سے لگاؤ قائم کر لیتا ہے تو نسبت کے تعلق ربط کے قائم ہونے سے وہ ایک خصوصیت سے ضرور مخصوص ہو جاتا ہے۔

محبت کا اثبات اللہ تعالیٰ کی تعظیم اگر یہ اس کے دل میں پیدا نہ ہوتی تو وہ تعلق ونسبت کیونکر جوڑتا کیسے پیدا کرتا؟ جو کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہے اس کو کیسے چھوڑتا۔ جو اس کو پسند ہے وہ کس طرح اختیار کرتا۔ ان باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کی نیت اس کے ارادے کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے ساتھ رعایت ملحوظ رکھنا اس کی تعظیم کرنی ضروری ہے۔

جتنے بھی کلمہ گو ہیں وہ سب کے سب اللہ سے نسبت رکھتے ہیں حق تعالیٰ کے ساتھ انھیں انتساب (نسبت کرنا۔ لگاؤ کرنا) حاصل ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ کو ایمانی قوت کی تحقیر پسند نہیں۔ اگرچہ وہ بدکار ہی کیوں نہ ہوں اس کو برا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ جو فعل یا برائی ان سے صادر ہو بلحاظ شرع برا سمجھنا لازمی بات ہے لیکن لعن طعن کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو لوگ محبت کرتے اور رکھتے ہیں اگر ان سے برے اعمال سرزد ہو جائیں تو وہ سزائیں جو شرع شریف میں مقرر ہیں، اللہ ورسول کی نیابت میں انھیں دی جانی اس لئے ضروری ہیں کہ انھوں نے نسبت کی بے عزتی کرکے اپنی سزا آپ پیدا کرلی۔ اپنے آپ کو ذلیل اور سزا کا مستحق بنا لیا۔ ان پر حد کا جاری کرنا (مقررہ شرعی سزا کا دینا) اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخصوص پابندیوں کی حد سے نکل گئے۔ یہ بھی حکم ہے کہ کسی کو سزا دینے میں نفس کا دخل نہ ہو۔ زبان لعن طعن گالی گلوچ سے محفوظ رہے۔ تاکہ ضرر کے لوٹ آنے کا سبب نہ ہو جائے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جس میں ضرر لوٹ آتا ہے۔ بعض لوگوں کا تکلیف میں مبتلا اور بیمار ہو جانا، صدمہ اٹھانا اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ ایسے حضرات کو جو حدود شریعت پر قائم ہیں چھیڑتے ان سے بری طرح پیش آتے ہیں یہ چھیڑنا بری طرح سے پیش آنا اس لئے نہیں ہوتا کہ

وہ حق پر نہیں ہیں بلکہ ان کے حق پر ہونے کے باوجود ان کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس کا بدلہ پاتے ہیں ایسی حرکت ہم سے سرزد نہ ہونے کے لئے ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی چاہتے ہیں۔ میرے سردار شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ مؤمنین نیک ہوں یا بد ان کی عزت کیا کرو۔ ان کی تحقیر اور ان سے بدسلوکی نہ کرو۔ ان کے حال پر انھیں چھوڑ دو۔ ان پر رحم اور ان کی بہتری کی دعا کرتے رہو۔

عارفوں کی خصوصیت اور محبت والوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی ہمت کو اپنے مولیٰ تعالیٰ کے سوائے سب سے الگ اور سمٹی ہوئی کرلیتے، اسی کی طلب میں رہتے، اسی سے اس کو طلب کیا کرتے ہیں کسی حال میں بھی اس کے سوا کسی کی طرف ان کی توجہ نہیں ہوتی ان کی نظر غیر پر نہیں پڑتی ان کے باطن میں غیر کا گذر نہیں ہوتا، عام اس سے کہ وہ رد ہو یا قبول۔ یہ حضرات اپنے مولیٰ تعالیٰ کے حضور میں بے چین و مضطرب رہا کرتے ہیں چاہے وہ بہت ہو یا کم۔ سچ ہے عارف اپنے علم کی بنا پر ہمیشہ جو مضطرب بے چین رہا کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر اپنے غیر پر کسی چیز پر قدرت کے ہونے سے بے چین ہوجاتا، پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے لیکن باوجود اس کے کوئی علت یا سبب۔ اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا کسی بات کے ہونے یا نہ ہونے سے وہ فکرمند بے چین نہیں ہوتا، ہمیشہ قدرت کے مشاہدہ میں رہا کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عارف ایسے سکون میں رہتے ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں اور ایسی راحت میں ہوتے ہیں جو کبھی بدلتی نہیں یہ انھیں اس لئے میسّر ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو بالکلیہ اسی کے سپرد کردیا اللہ نے بھی ان کو ان کی ذات سے اور ان کے غیر سے بے پروا (بے نیاز) کردیا اور خود ان کا متولی (کام بنانے والا) ہوگیا

ہے۔ اُن کی ولایت اور ان کی تمام باتوں کو اسی پر سے سمجھ سکتے اور یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ مفہوم ولایت کیا ہے۔ قولہ تعالیٰ اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِىْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ البتہ وہی ولی ونگران کار اللہ کی ذات ہے کہ جس نے کتاب اتاری اور وہی نیکیوں صلاحیت پائے ہوؤں کا ستولی ہے یعنی کارساز۔ وکیل مددگار محافظ نگرانِ حال ہے)

محبّت کرنے والوں کی تین علامات ہیں : (۱) ذکرِ دوام سے ایثار و خوبی پیدا کرنا۔ (۲) بے انتہا شوق وطلب کے ہوتے ہوئے آئینِ شریعت کی پابندی میں رہنا۔ (۳) ہمت کی رسائی و چالاکی سے محبوب کی قربت (نزدیکی) کے لئے اپنے کھانے پینے، اپنی پسندیدہ مرغوب باتوں اور چیزوں کا محبوب کی مرضی کا لحاظ کرتے ہوئے کم اور ترک کرنا۔ باطن کے احوال ایسے ہوتے ہیں کہ جس کے آثار و انوار ظاہر میں بھی دکھلائی دیتے ہیں جس کسی میں محبت کے جذبات ہوتے ہیں وہ چھپ نہیں سکتے۔ مشک کا ڈبہ کھل جائے تو مشک کی خوشبو پھیلے بغیر نہیں رہتی۔

ابرار و مقربین کی جماعت کا امتیاز، اللہ تعالیٰ کی امداد، اس کے نیک بنانے نیک کرنے سے مخصوص ہے۔ استعداد کے لحاظ سے تائید ملتی ہے کام بنتا، بنایا جاتا ہے، فتوحاتِ علمیہ، حقائقِ عرفانیہ، تجلیاتِ ربانیہ دین اور دنیا کے فائدوں سے بھرے ہوئے خوان سے بندہ کو جو کچھ پہنچتا ہے اور ملتا ہے وہ اس کی ہمت کی مناسبت سے پہنچتا ہے اور اس کے استعداد کے لحاظ سے ملتا ہے۔ جو کچھ اس مقام کی گفتگو جس سے یہ غرض متعلق ہو سکتی ہے وہ ہاتھ آجاتی ہے تو اس کے متعلق اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ تین چیزوں پر مبنی ہے (۱) دل کا اُن مشغولیتوں سے جو حق کے سوا ہوں، خالی ہو جانا۔

اس کے حصول کے ذرائع ہیں یعنی عبادت وطاعت میں دل سے لگ جانا ظاہر ہے کہ اگر تم نفس کو حق کے کام میں نہ لگاؤ گے تو وہ تمہیں اپنے کام میں ضرور لگا دیگا جس کسی میں وصول حق کے (ذرائع) طریقوں میں مشغول رہنے کی استعداد زیادہ ہو جاتی ہے اس کی امداد بھی بہت زیادہ اور بہت کافی ہوتی ہے۔ حال بھی زیادہ میسر ہو جاتا ہے۔ (۲) دل کو حق کی معرفت اور اس کی محبت کے لئے ٹھیک و استوار بنانا دل کی تعمیر ٹھیک کرتے رہنا اور ذکر و فکر دوام اور صبر تام (پورا) میں اپنے آپ کو لگائے رکھنا (۳) اس پر مداومت کے ساتھ ثابت و قائم رہ کر کرتے رہنا۔ ثبوت و استقامت کا اس طرح ہاتھ آجانا کہ وہ ضبط حال سے کبھی جدا نہ ہو امر تبہ قرب میں ہمیشہ کا حضور نصیب ہونے اور اس میں رہنے سے یہ بات ہاتھ آتی ہے۔

شیخ ابو محمد عبدالسلام بن شیش رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کو وصیت فرمائی کہ اپنے آپ پر یہ لازم کر لو (۱) خواہشات کا ترک (۲) اللہ تعالیٰ کی محبت کا اثبات اس لئے کہ محبت ہی محبت کرنے والے کو محبوب میں برابر مشغول رکھتی ہے۔ اور محبت کرنے والا اپنے محبوب کے سوائے کسی اور کے ساتھ وہ مشغول ہی نہیں ہوتا، محب (محبت کرنے والے عاشق) کے کام کی بنیاد اس کے حال کا زبدہ (خلاصہ۔ نچوڑ) یہی ہے کہ ظاہری اعمال جو اس کے اعضاء و جوارح سے ہوتے تھے۔ ان کے بجائے حقیقی اعمال جو اس کے دل سے صادر ہونے لگ جائیں جب یہ ہونے لگتے ہیں تو کبھی منقطع نہیں ہوتے۔ اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے۔

حکیم بن عطار رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ورد اور وارد کی جزا ان کے مرتب ہونے اور نتیجہ لانے کی جگہ آخرت ہے عمل و کوشش کی جگہ دنیا ہے تمہیں

یہاں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ نیک عمل کیا کریں. حق کی خدمت بجا لائیں ۔ مجاہدے ریاضت میں لگے رہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ہ (نہیں پیدا کیا ہم نے جن وانس کو مگر اس لئے وہ ہماری عبادت کریں) عمل (کئے ہوئے) کے جزا (بدلے) کی جگہ مشاہدہ کا مقام بھی وہیں، جو کچھ یہاں دکھلائی دیتا ہے وہ اس کا نمونہ ہے عقلمندوں کی توجہ ان کا اہتمام اپنے عمل کی تکمیل میں ہونا چاہیئے ۔ اللہ تعالیٰ کا کہا ہوا سچ ہے جس میں کسی قسم کی وعدہ خلافی کا ڈھڑکہ نہیں۔ اس کے کئے ہوئے وعدے کے پانے کے عمل صالح (نیک کام) ورد اوراد میں رہنا چاہیئے۔ یاد رہے کہ فنا ہوجانے والے گھر کے پیٹے جانے، اس کے فنا ہوجانے سے بات ختم نہیں ہوجاتی. قیامت میں انتہائی حسرت یہ ہوگی کہ ہائے میں نے کیوں عمل نہ کیا۔ جس کسی نے کچھ کرلیا اس کو یہ حسرت ہوگی کہ ہائے میں اور زیادہ کیا ہوتا حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک بندہ ایسا ہوگا کہ اس کا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ جس میں وہ اللہ کی یاد، اس کے ذکر میں نہ ہو. اس کے باوجود بھی وہ قیامت میں حسرت کرے گا کہ کاش کہ میں اور کرتا۔

خواجہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک گروہ کو ایسا پایا کہ وہ اپنے اوقات ومعمولات پر انتہائی صورت میں نہایت احتیاط و پرہیزگاری کے ساتھ قائم اور ان کے وقت پر ان کو عمدگی سے ادا کرتا تھا. اس کی حفاظت ونگہبانی اس سے زیادہ کرتا تھا جتنی کہ تم لوگ اپنے مال و دولت، روپیہ پیسہ کی کیا کرتے ہو جیسے کہ تم اپنا روپیہ نفع وفائدہ ملنے کے محل ومقام کے سوا نہیں لگایا کرتے اسی طرح یہ وہ اپنے اوقات ومعمولات کو صرف ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جس کا بدلہ بہترین ہو جس کی طلب میں

ہر سچے انسان کو رہنا چاہئیے۔ وہ موجودہ عمل سے زیادہ عمل کی توفیق کے خواہاں
اور خواہشمند ہو جاتے ہیں ان کی طلب ہر لحظہ زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

مشائخ قدس اللہ اسرارہم نے فرمایا ہے کہ استقامت کے طلب میں رہو۔
کرامت کے طالب نہ رہو کیونکہ تمہارا مالک و مولیٰ تم سے استقامت کا طالب
ہے۔ تمہارے نفس کی خوشی کرامت کی طلب میں ہے۔ اپنے مالک و مولیٰ کی
خوشنودی میں آجانا نفس کی خوشنودی میں آجانے سے لاکھوں درجہ بہتر ہے۔

ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ سے روایت کی جاتی ہے کہ آپ نے
فرمایا کہ اگر مجھے یہ اختیار دیں کہ میں دو رکعت نماز میں رہنا چاہتا ہوں یا جنّت
میں تو میں دو رکعت نماز کو جنّت پر ترجیح دوں گا۔ کیونکہ جنّت میرے نفس کے
مزے لینے کا مقام اور دو رکعت نماز اللہ کے لئے ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ
طالب ایسا ہونا چاہیئے کہ جس کی نظر نماز ادا کرنے، خدمت میں رہنے، ذوق
کے ساتھ حکم کے ادا کرنے کے سوائے کسی اور بات پر نہ ہو۔ بدلہ و ثواب کی طرف
اس کا رخ تک نہ ہو جو کچھ کرے اللہ ہی کے لئے کرے اور اللہ ہی کا کام سمجھ کر کیا
کرے۔ اپنے آپ کو درمیان میں نہ لائے۔ نظر میں اللہ ہی اللہ رہے۔ کبھی
نفس کے مزے اور اس کی لذّت کی طرف مائل نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے
کہ کل قیامت میں ایک گروہ کو جنّت میں بلایا جائے گا تو وہ نہ جائیں گے۔ خدمت
کے سوائے کچھ اور نہ چاہیں گے تو خدا تعالیٰ کے حکم سے ان کی گردنوں میں نور
کی زنجیریں ڈال کر ان کو زبردستی کھینچتے ہوئے جنّت میں لے جائیں گے۔

حکم ابن عطا رحمتہ اللہ علیہ نے کتاب لطائف المنن میں شیخ ابی العباس
و شیخ ابو الحسن رحمتہ اللہ علیہما کے مناقب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے
کہ "حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ہر قسم کے طاعات و عبادات میں ملکوت کے انوار رکھے

ہیں جس کسی کے ہاتھ سے ایک قسم کی طاعت و عبادت نکل گئی سمجھ لو کہ ان انوار میں کا ایک نور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جو کچھ کہ ہو سکے کیا کریں کرنے کی جتنی سکت ہو ادا کرتے رہنا چاہیئے یونہی چھوڑ نہ دینا چاہیئے۔ ورد و اوراد۔ اعمال جو کرنے کے لائق ہوں کئے جاتے ہوں ان سے لاپرواہ نہ ہونا چاہیئے اور اپنے آپ سے اپنے لئے اپنے آپ کو اس پر راضی نہ کر لینا چاہیئے جس کے لئے بے عمل مدعی راضی ہیں یا کیا کرتے ہیں جن کی زبانوں پر حقائق و معارف جاری اور وہ عمل سے عاری ہوتے ہیں، ان کے دل عبادات کے انوار سے بے نور بے فیض رہتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ جب بندہ سے عبادت کی ادائی کما حقہ' (جیسی کہ ہونی چاہیئے) ہو جاتی ہے تو غیب کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں جب کسی سے کوئی عبادت و معاملت اس کے آداب، ارکان، شرائط و لوازم اور مشغولیت کے ساتھ اچھی طرح ادا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر غیب کے اسرار کھول دیتا اور سب کچھ اس پر کھل جاتا ہے۔

بندہ مسکین محمد عبدالحق نور اللہ قلبہ' بنور الیقین (نورانی کرے اللہ اس کے دل کو ایمان کے نور و یقین کی روشنی سے) یہ کہتا ہے کہ حضرت شیخ رضی اللہ عنہ کی غیب سے ممکن ہے کہ وہ غیب مراد ہو جس پر ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اس کا کشف کلی۔ الوہیت کا کھل جانا دکھ جانا) مبارک اور سعادت کا باعث ہے۔ صادقین سلوک کا مطلوب یہی ہے۔ بخلاف اس کے کشف کونی (دنیا مخلوق یعنی کائنات کا کھلنا) وہ بات نہیں رکھتا وہ لذت نہیں دیتا کیونکہ یہ ان کا مقصود مطلوب نہیں۔ اس کا کھلنا سالک کے حال کے لئے آخر میں ایک وبال ہو جاتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگتے ہیں کیونکہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہر وہ فضیلت جو عمل سے نظر میں آ جائے صحت پا جائے

وہ کم از کم ایکبار تو ہو جائے اور ہم اس پر عمل کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔
طالب کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ (ساتواں مکتوب)

مکتوب (۳۸)

سال بھر کے دوگانے وغیرہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

پہلی فصل

(۱) محدّثین کا طریقہ عمل عبادات میں یہ ہے کہ وہ طریقہ قرآن شریف یا کسی صریح آیت سے یا کسی حدیث صحیح سے ثابت ہوں اور کسی تاویل کے محتاج نہ ہوں تو اس کو کیا کرتے ہیں۔ اس بارہ میں ضعیف حدیث ہو تو ان کے نزدیک اس پر عمل کرنا ایسی صورت میں جائز ہے جب کہ وہ عمل بزرگ اعمال میں سے ہونے کے علاوہ صاف طور سے پہچانا جاسکے۔ ان کے نزدیک یہی ایک خصوصیت ہے، کوئی خاص طریقہ یا صورت اس کے سوا نہیں۔

(۲) فقہا کا طریقہ۔ عمل عبادات میں معنی کا اعتبار، حکم کی وجہ مناسب قاعدہ کے لحاظ سے ہے۔ قرآنی آیات، حدیث کے احکام ان کے سامنے ہوتے ہیں جو قیاس کی یہی صحیح بنیادیں ہیں۔ اکثر نفل نمازیں اور وظیفے جو دن اور رات میں ہفتہ بھر میں، خاص تاریخوں اور مہینوں میں، راتوں اور دنوں میں ہر موسم میں، سال بھر میں ادا کی جاتی ہیں محدثین کے نزدیک فن حدیث کے اعتبار سے وہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچیں، وہ ان کو موضوع اور باطل (گھڑی ہوئی بے اصل جھوٹی

کہتے ہیں مثلاً صلوٰۃ الرغائب جو رجب کے مہینہ کی پہلے جمعہ کی رات میں مخصوص کیفیت خاص ترتیب کے ساتھ ادا کی جاتی اور مشائخ میں متداول ومشہور رہی ہے ان کے نزدیک یہ بھی اسی قسم میں سے ہے۔ اس کے پڑھنے سے منع کرتے ہیں بُرا ٹھہراتے ہیں اور عجیب طرح سے انکار کرتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ جو حدیث اس بارے میں بیان کی گئی ہے اس کو وہ مطعون (معیوب ناقص) کہتے ہیں اسی طرح وہ نمازیں جو شعبان کا آدھا مہینہ گزر جانے کے بعد کی رات میں جس کو شب برات کہتے ہیں اور دسویں محرم کی شب اور دس محرم کو جو دوگانے ورد، اوراد ادا کئے جاتے ہیں یہ بھی ان کے نزدیک یہی حکم رکھتے ہیں رات کا قیام اور سجدہ میں زیادہ رہنا مقررہ دعائیں قبروں کی زیارت اہل قبور کے لئے دعا استغفار کرنا جو شب برات اور دسویں محرم کو کیا کرتے ہیں یہ بھی ان کے نزدیک ثابت نہیں صرف روزہ رکھنا۔ کھانا اچھی طرح سے کھلانا ثابت ہے۔ کھانا کھلانے اور اس میں وسعت دینے کی جو حدیثیں ہیں ان کو بھی ضعیف کہتے ہیں۔ البتہ دسویں محرم کے روزہ کی تاکید روزہ رکھنے کو مانتے ہیں۔ دوسری باتوں اور کاموں کے متعلق جیسے کہ ہمسایہ کے ساتھ سلوک کرنے کی روایتوں کو بھی ضعیف بتلاتے ہیں۔ کتاب جامع الاصول (کتاب فقہ) میں صحیح احادیث کی بنا پر لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دسویں محرم کا روزہ نماز فجر کی سنت، ہر مہینہ کے تین روزے چاہے آپ سفر میں ہوں یا وطن میں کبھی ترک نہ فرماتے۔ یہ تینوں امور سنت موکدہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دسویں محرم کو غسل کرنا، سرمہ لگانا وغیرہ کہ بلحاظ روایت کئے جاتے ہیں یہ بھی صحت کے ساتھ ان تک نہیں پہنچا۔ البتہ دسویں محرم کا روزہ شوال کے مہینہ کے چھ روزے ان کے یہاں صحیح ثابت ہیں۔ اس بارے

میں جو احادیث۔ صحاح، حسان، ضعاف میں آئی ہیں ان کو ہم نے ایک کتاب میں جس کا نام " بما ثبت من السنتہ فی ایام السنتہ" میں لکھدیا ہے۔ عرب ممالک کے اکثر مشائخین اور خصوصاً مغربی عرب ملکوں کے رہنے والوں کا عمل۔ محدثین کے طریقہ کے موافق پایا جاتا ہے ان کا کہنا ہے کہ صحیح حدیثوں ہی پر طالب کو اکتفا کرنا چاہیئے اور اللہ اور اللہ کے کام کے سوائے جو کچھ بھی ہے اس سے لاپرواہی، بے توجہی برتنی، ان سے مستغنی ہو جانا مناسب ہے۔ طالب کے لئے اسی قدر عمل ضروری۔ اور یہی کافی ہے۔

دوسری فصل

وہ عبادتیں اور اعمال جو مشائخ کا روزانہ عمل ہو گئے ہیں اور جن کو وہ کیا کرتے ہیں وہ ان کے اوراد ورد، وظائف میں درج ہیں۔ چنانچہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے " احیاء العلوم" میں۔ شیخ ابو طالب مکی رحمتہ اللہ علیہ نے " قوت القلوب" میں جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق اجمالی اشارہ اور اسکی توجیہ پہلی فصل میں ہم نے کردی ہے۔ محدثین کا طریقہ ان کے نزدیک کیوں مناسب نہیں اس کو بھی ہم نے لکھدیا ہے کہ یہ طریقہ کا اختلاف ہے اور یہ علم حدیث پر مبنی ہے۔ بالفرض اگر کوئی چیز کسی کے نزدیک اس کے طریق سے ثابت نہ ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرے کے نزدیک بھی ہو اس کے طریقہ کے موافق وہ درست نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک کے نزدیک ثابت نہ ہو اور دوسرے کے نزدیک ثابت ہو۔ اس بات کی تحقیق اور اس کلام کی تفصیل یہ ہے کہ وہ اعمال و عبادات جس کو مشائخ کی جماعت عمل میں لاتی اور کرنے کے لئے کہتی ہے اس کو انھوں نے اپنے مشائخوں سے پایا۔ انھیں اسی طرح کرتے ہوئے

دیکھا ان سے اس کو سُنا کہ یہ اعمال و حسنات مشائخین رحمۃ اللہ کو پاک حضرات
سے مسلسل پہنچے ہیں حسنِ ظن (نیک گمان) سے اچھا عمل جان کر وہ ان عبادتوں
کے اہتمام میں لگ گئے۔ اور ایک خاص خوبی ان میں پائی۔ نیک گمان کے
غالب ہوجانے سے انھوں نے راویوں کی روایت کو قبول کرلیا، اور اس طرح
انتہائی دلی خواہش و آرزو کے ساتھ اس خاص طریقے سے عبادت کرنے اور
اچھی طرح ادا ہونے کے خاطر جو بھی عبادت ہو۔ اس کو اچھی چیز سمجھ کر اچھی طرح
سے کرنے لگے۔ ان عبادات کے کرنے کا سبب' اچھی عبادت کرنے کا اعتقاد
تھا۔ یہ حضرات اس طرف نہیں گئے کہ عام و خاص عبادت خصوصیت وقت
کے لحاظ سے انتہائی اہتمام کے ساتھ احادیث صحیحہ کے تحت اور ان کے
اعتبار کے لحاظ کیا ہوسکتی ہے۔ اس طرف توجہ نہیں کی۔ بلکہ نیک کام کو نیک
سمجھکر عبادت میں استقامت و استحکام پیدا ہونے کے لئے انھوں نے ان
عبادات کو کرنا شروع کردیا۔ انھوں نے ایک بہتر کیفیت ایک اچھا حال اس
میں پایا۔ بخلاف اس کے علمائے حدیث (محدثین) کا طریقہ تحقیق و تفتیش یہ
ہے کہ وہ روایت راوی۔ اس کی مناسبت کو سوچتے اس کی دیکھ بھال کرتے
ہیں نہایت احتیاط کے ساتھ ظاہری و باطنی طور پر اسناد کی صحت کرتے ہیں
احادیث کو اصول علم حدیث کے تحت جانچتے ہیں کہ یہ عمل کس طرح کیسا کب
اور کیونکر ہوا اور اس کے بارے میں کیا کہا گیا۔ جب پوری طرح سے مطمئن
ہوجاتے ہیں تو روایت کو مانتے خود اس پر عمل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس پر
عمل کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ یہ ان کی تحقیق بالکل ایسی ہے جیسا کہ صوفیا
نفس کے احوال، اس کے دھوکے' حیلے' چالبازیوں۔ بے شرمیوں کے
وسائل اور اس کی باریکیوں کو جانچتے ہیں اسی طرح فقہا بھی حرام و حلال صحت

فساد، بُرے بھلے کو جانچ کر بیان کرتے ہیں، یہ اہل علم ایک دوسرے کے محتاج ہیں ایک دوسرے کو مدد، اعانت کرتے ہیں اور جو چیز کہ ان تین طریقوں کی جامع ہو۔ وہ اپنی وجوہات کی بنا پر اس کی حیثیتوں کے لحاظ سے سب سے بہتر ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث اقوال، اعمال، مشاہدہ و معائنہ کے بعد انتہائی اخلاص سے خلوص کے ساتھ ادا ہو جائے تو اس کو عمدگی سے کیا جانا کہا جا سکتا ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں یہ فرماتے ہیں کہ موضوع احادیث (گڑھی ہوئی حدیثیں) کا وجود۔ ان کا شائع ہونا، پھیلنا اکثر اہل ورع و صلاح کے ذریعہ ہوا۔ ان حضرات سے جو بھی حدیث بیان کی جاتی اگر وہ حکم اور قاعدہ شرع کی۔ روکنے والی اس کی مخالف اس سے ٹکرانے والی نہ ہوتی، اور بظاہر صدق و صلاح کے لباس سے آراستہ پائی جاتی اس کو یہ حضرات بلا کسی تحقیق کے اپنے نیک گمان کی خوبی سے صحیح ہونے کے احتمال سے قبول کرکے اس پر عمل کرنے لگ گئے دوستوں کو سنا نے ان سے عمل کروانے لگے۔ ان کے گمان میں یہ نہ آیا وہ یہ شبہ بھی نہ کر سکے کہ کوئی مسلمان ایسا بھی ہو سکتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ اللہ کے رسول ہیں، کوئی بات اپنی طرف سے گڑھے جھوٹ بات بنائے اس کی روایت کرے۔ جھوٹ بولنے آپ کے بتلائے ہوئے وعید (اس عذاب کے وعدے، بُری ڈرانے والی اطلاع) سے نہ ڈرے نڈر ہو کر بے دھڑک یہ کام کرے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی عمداً (جان بوجھکر) میرے متعلق جھوٹ گڑھے۔ جھوٹ کہے اس کو آگ کی کرسی پر بٹھلایا جائے گا یعنی اس کے بیٹھنے کی جگہ آگ ہو گی۔ یہ موضوع (وہ شئی اور مقصد جس کا ذکر علم میں ہو) احادیث کی روایت کرنے والے کے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نفسانی اغراض، اس کے اسباب و وجوہات،

خواہشات کا ابھار۔ بڑائی کے ذرائع اپنے آپ کو ایک درجہ و مرتبہ کا بتلانے رعب جمانے کی صورتیں آدمیوں میں کس قدر اور کس کس طرح سے ہوتی ہیں وہ ان نیک حضرات کے گمان تک میں نہیں آسکتی تھیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض ایسے حضرات بھی ہوں کہ رغبت دلانے۔ ڈرانے کے لئے احادیث وضع کی ہوں اسی لئے ایسی موضوع احادیث کو صوفی بنے ہوئے لوگوں سے منسوب کیا جاتا ہے، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ یہ نہ تو جھوٹ ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا (جھوٹ بات بنانا۔ بہتان) ہے۔ بلکہ یہ صرف ترغیب و تحریص کے لئے وضع کی گئیں ہیں یہ مصلحت، یہ جھوٹ بنانا۔ دین کے نفع اور شریعت کے فائدہ کے لئے ہے۔ دین میں نقصان گھاٹا لانے کے لئے نہیں وعید جو آئی ہے وہ ایسی جھوٹ سے متعلق ہے جو نقصان و ضرر کے لئے بنائی جائے۔ ان حضرات کے اس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو بات دین کے ضرر و نقصان کے لئے جھوٹ گھڑی جائے اس کا گھڑنے والا سزا کا مستحق ہے دین کے نفع فائدہ میں جو بات منسوب کر کے کہی جائے وہ اس کے تحت نہیں آتی۔ احادیث جس قدر بھی بنائی گئی ہیں۔ وہ صرف اہل عبادت و ریاضت۔ نیکیاں کرنے والوں ہی کی بنائی ہوئی (گھڑی ہوئی) نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ ایسے لوگوں کی بھی ہیں جو اہل بدعت اور اپنی خواہش کے پابند تھے۔ مختلف مذاہب کے بنانیوالوں بنا ڈالنے والوں میں سے تھے اپنے طریقہ اور اعمال کے رائج کرنے ان کے پھیلانے۔ اس پر لوگوں کو لانے کے لئے انھوں نے یہ سب کچھ کیا۔ ہم اچھی طرح سے یہ جانتے ہیں کہ اکثر اعمال عبادات جو رائج ہیں وہ حدیث کی صحیح کتابوں میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ کسی کتاب میں بھی نہیں۔ ان کی صحت کسی طرح

سے بھی نہ ہو سکی ان کا صحیح ہونا کسی طرح سے بھی ثابت نہ ہوا۔ محدثین ایسے اعمال کے کرنے والوں پر لعن طعن کرتے آئے ہیں اس کا رد کرتے آئے ہیں لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ مشائخوں کے پاس روایتیں ہیں اسناد ہیں ظنی قطعی مسائل بھی ہیں اور نہیں بھی ہیں۔ سچ ہے حق سے بھی زیادہ ایک حق ضرور ہوتا ہے جس کی پیروی کی جاسکتی ہے اور کرنی ضروری ہے۔

تیسری فصل

(۱) یہ معلوم ہو گیا کہ ان اعمال کے قبول لینے اختیار کرنے کی بنیادیں اور ان روایات پر بھروسہ کرنے کی وجہ اور اس کی نسبت تسامح و تساہل۔ (جوانمردی آسانی) نیک گمان کی خوبی۔۔ اصل عبادت کرنے کی انتہائی خواہش اور حرص تھی۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارے پاس سے بزرگی پانے کی جو صورت بھی آئے اس کو کرنے لگ جاؤ۔ اچھی باتوں پر عمل کیا کرو چاہے وہ نیک باتیں صحت کی حد تک بھی نہ پہنچیں اور مسلسل نہوں۔ وہ نیک کام جن کے کرنے کے لئے کہا جائے وہ کرتے چلے جاؤ۔ محدثین یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث خود ضعیف ہے بلکہ موضوع یعنی گڑھی ہوئی ہے اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس کی روایت کرنا حرام ہے کہ بلحاظ قواعد حدیث شک کے قریب ہو یا نہ ہو۔ یہ حکم لگانا کہ یہ گڑھی ہوئی ہے گمان کے لحاظ سے ہے بلحاظ اصول اس کے کٹ جانے کی امید ہے کیونکہ یہ گمان کی باتیں نہیں۔ اس فن کے ائمہ پر بھروسہ کرنے اور ان کو با انصاف ماننے پر اس کا دارومدار ہے کہ یہ حضرات فن حدیث میں ماہر ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے مہارت رکھتے ہیں اچھی طرح سے جانتے پہچانتے۔ طرز ادا ترکیب

لفظی سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام کا ذوق اور وجدان پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ احادیث ہی سے انھیں کام ہوتا ہے اور اسی میں وہ منہمک رہتے ہیں اس لئے صحیح کو موضوع سے، موضوع کی ضعیف سے ان کے مقررہ طریقہ پر جانچ لیتے و تنقیح کر لیتے ہیں اس علم و عمل کی اکثریت سے اس کی نسبت سے کہ وہ کس قسم کی ہیں پانے کا ملکہ انھیں ہاتھ آگیا ہے۔ علم حدیث کی کسوٹی انھیں مل گئی ہے۔ اس لحاظ سے بعض قرائن اور نشانیوں اور ریتوں سے جو انھیں موضوعہ احادیث کے متعلق حاصل ہوتی ہیں وہ اس طرح کا حکم لگا دیتے ہیں۔ مثلاً شیعہ غالی کی روایت کہ اس نے فضائل اہل بیت سلام اللہ علیہم اجمعین کے متعلق کی ہیں اس کو سب جانتے ہیں کہ وہ نئی بات کا نکالنے والا گمان پر مذہب کا قائم کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مذہب گمان پر قائم ہوا ہو۔ اس کے رواج دینے کے لئے کبھی جھوٹ کبھی سچ جو دل میں آیا وہ کہہ گیا۔ جھوٹ کہنے کا جو موقعہ ہوتا جھوٹ کہتا سچ کہنے کا جب موقعہ ہوتا سچ کہا کرتا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی احتمالات ہیں جن کی بنا پر علم حدیث میں تنقیحات جرح و تعدیل کے اصول وضع کئے گئے اسی کے لحاظ سے احادیث کی نسبت کہ وہ کیا ہیں تصفیہ و قرار داد ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ بعض نقاد جیسے کہ ابن جوزی اور انھیں کے جیسے حضرات موضوع حدیثوں کے بارے میں زیادتی اور تعصب رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر آپس میں بحثا بحثی ہونے لگ گئی۔ تو بعضوں نے اس میں ذرا سی وسعت پیدا کی ہٹ دھرمی کو چھوڑ دیا اور کہا کہ اس سے وہ جدا نہیں۔ بعض اختلاف رکھتے تھے وہ گفتگو کرنے لگ گئے۔ اصول حدیث اسی لئے بنائے گئے کہ اس سے ایک درمیانی راہ ہاتھ آسکے اس کے لئے انھوں نے یہ تصریح کی کہ "بات ضعیف ہو مبہم نہ ہو مخالف سنت نہ ہو۔ اگر اس کے خلاف کوئی روایت پائی جائے۔

تو وہ جہل پر مبنی اور حقیقت حال کی اطلاع نہ ملنے اس سے واقفیت نہ ہونے کا ثبوت ہے۔

(۲) ان باتوں کا علم۔ اور ایسی باتوں پر مطلع ہونا۔ ولایت یا کشف کے طریقے سے پانا کوئی مسلسلہ وسند نہیں رکھتا۔ ایسا ہونا لازم نہیں ہے۔ بلکہ روایت کا مسلسل ہونا ایک سے دوسرے کو پہنچنا لازمی ہے۔ روایت کے اسناد ظاہری کا وجود ضروری ہے۔ جیسا کہ بیان کردیا گیا۔ اس سے اچھا عذر قابل قبول کوئی اور نہیں۔ احکام ظاہری کی بجا آوری کے لئے روایت واسناد ظاہری کا ہونا لازم ہے یہ ضروری بھی ہیں۔ کیونکہ قرآن و احادیث کا یہی طریقہ یہی اصول چلا آرہا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضوان اللہ عنہم کو سنایا ان سے اب تک تسلسل چلا آرہا ہے۔ درمیانی باتوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی زبان اسی انداز انھیں الفاظ اسی ترکیب میں سن کر سنانا لازمی ہے۔ اپنی طرف سے کچھ شامل کرکے اس کو اصل کہنا گناہ ہے۔ ایسی ہی احادیث کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ موضوع ہیں۔ اس بارہ میں وہ معذور ہیں یہ ان کے پاس منکر (ایک قسم حدیث کی) ہیں۔ اس سے بڑھکر کوئی اور عذر ایسا نہیں پایا جاتا کہ قبول ہوسکے۔

(۳) صادقین حال کی حقیقت اس کی توجیہ کا طریقہ اس کے سمجھنے کا محل وموقع ایسا ہی ہے یہی ہے یہی رہا ہے سچی بات اور حقیقت ہے کہ اپنے مشائخ کے قول پر انھیں اس قدر یقین ایسی وابستگی ہے جس کی وہ دل سے پیروی کرتے ہیں علماء کے اقوال۔ علم حدیث کے اماموں کی باتوں پر انھیں بھروسہ نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے جو کچھ ان کو نہ پہنچا اس سے انکار کرتے اور ایسا نہیں ہے کہہ رہے ہیں۔ اچھی باتوں کو برا ٹھہرا رہے ہیں

عبادت وحسنات سے روک رہے ہیں علم حدیث کی گفتگو میں نا جائز بتانے کا سوال ہی نہیں حدیث کی نوعیت سے بحث ہے۔ ہماری نزدیک بات اصلی یہ ہے کہ دونوں گروہ کے متعصب افراد۔ افراط وتفریط میں گرفتار ہیں۔ بلاوجہ اپنی ہٹ دھرمی پر ہیں۔ درمیانی راستہ سہولت کا طریقہ سلامتی کا ذریعہ اختیار نہیں کرتے۔ زبردستی اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ ہماری نصیحت اس قدر ہے کہ کٹر متعصب عالم اور جاہل صوفی سے کنارہ اختیار کرکے درمیانی راستہ اختیار کرلو۔ اس کے سوائے جو راستے ہیں وہ سب خوف خطرے کے ہیں۔ تم جانو تمہارا کام۔ (دسواں مکتوب)

مکتوب (۳۹)

ذکر کی فضیلت فکر پر

اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ذکر وفکر دونوں ہی بہترین احوال ہیں۔ ان میں کا ہر ایک آداب احوال ومقامات میں سے ہے اس کی شرح بہت طویل ہے۔ جو کچھ میرے دل میں آتا ہے وہ یہ کہ ذکر کا درجہ سب سے بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ یہ کہ بندہ کا ذکر خدا کو کھینچ لیتا اپنے آپ میں ایک لزوم پیدا کردیتا۔ لازم کرلیتا ہے۔ خدا کا ذکر بندہ کے لئے فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ (مجھ کو یاد کرو۔ میں تم کو یاد کروں) کے حکم کی پابندی ہے۔ اس کے سوائے کوئی اور حال ایسا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ جو بندہ کو حق کی طرف سے عطا ہوا ہو جس کو خدائے تعالیٰ نے بزرگ برتر ٹہیرایا ہے وہ صرف دو حال ہیں یعنے

ذکر و محبت (۱) فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲) يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ —
مشائخ قدس سرہم فرماتے ہیں کہ ان کا خدا تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ خدا تعالیٰ کا ان کا ذکر کرنا ان کا خدا تعالیٰ کو دوست رکھنا اور خدا تعالیٰ کا ان کو دوست رکھنا یاد رہے کہ بزرگی و محبت کے ساتھ یاد کرنا ہی۔ یاد رکھنا اور محبت کرنا ہے۔ یعنی حق کی محبت حق کا ذکر بندہ کا پہلا دور سبقت (پیش قدمی) لے جانے والا معاملہ ہے۔ ذکر کو محبت پر اولیت ہے بندہ کا ذکر کرنا یعنی خدا کو یاد کرنا۔ خدا کا بندہ کو یاد کرنا ہو جاتا ہے۔ یہ بندہ مسکین ان حروف کا لکھنے والا (صاحب تصنیف فارسی) کہتا ہے کہ حقیقت حال ایسی ہی ہے جیسا کہ مشائخین قدس سرہم نے فرمایا۔ حق تعالیٰ قدیم بندہ حادث (نیا پیدا کیا ہوا ہو۔ مٹنے والا فنا ہونے والا) ہے حادث وہ جو قدیم سے ظہور پایا ظاہر ہوتا وجود میں آتا ہے۔ بندہ کی محبت سے حق تعالیٰ کی محبت بالا تر ہونے کا مذکور ہے۔ محبت میں خدا کی پیش قدمی (سبقت) اور ذکر میں بندہ کی پیش قدمی کا ذکر آیا ہے۔ دل میں یہ بات آرہی ہے کہ محبت صفت ہے ذکر فعل ہے۔ پہلے پہل حق کی کشش محبت (جذب حُب) بندہ کو جذب کر لیتی اپنے آپ میں کھینچ لیتی ہے تو وہ خدا کی محبت سے مشرف ہو جانے سے ذکر کرنے لگ جاتا ہے محبت ہو جانے کے بعد۔ اس کا ذکر (یاد) کرنے لگتا ہے تو محبت بڑھ جاتی ہے۔ اس کی یاد بار بار آنے لگتی ہے۔ جب یہ ذکر کرتا یعنی یاد میں ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کو قبول کر لے کر اس کے ذکر کے بدلے میں اس کا مذکور کرنے لگتا۔ اس کو یاد کرتا ہے اس سے محبت کرتا ہے — محبت کو بڑھاتا ہے سچ ہے محبت ہی میں محبت پیدا ہوتی جاتی ہے محبت ہی محبت کے بڑھ جانے کا سبب بن جاتی ہے اسی طرح سلسلہ چلتا بڑھتا رہنے سے محبت دن بدن بڑھتی اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمیٰ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابوعلی دقاق رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا کہ ذکر زیادہ بہتر ہے یا فکر؟ تو ابوعلی دقاق رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ شیخ کے دل میں کیا بات آرہی ہے۔ میں نے کہا کہ میرے نزدیک ذکر فکر سے بڑھا ہوا ہے۔ وہ اس لئے کہ حق سبحانہٗ کی تعریف ذکر سے کی جاتی ہے۔ فکر سے نہیں کی جاتی جس سے ساری کائنات کے خالق کا وصف کیا جائے وہی سب سے برتر و بزرگ تر ہے ابوعلی دقاق رحمتہ اللہ علیہ نے میری بات پسند فرمائی اور تعریف کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا نام ذکر فرمایا انزلنٰہ الذکر یہ بھی فرمایا کہ ھٰذا ذکر مبارک انزلناہ۔ شیخ ابوعبدالرحمٰن سلمی بڑے احوال کے بزرگ ہیں۔

ذِکرِ لسانی سنو۔ ایک ذِکر وہ ہے جس کو ذکرِ لسانی کہتے ہیں یعنی وہ ذکر جو زبان سے کیا جائے یہی سب سے بہتر ہے کیونکہ مذکورٌ (یاد کئے گئے) کا زبان سے ذکر (یاد) کرتے ہیں۔ اس کا نام زبان پر چلتا رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تو جان دینے کی قوت رکھتا ہے تو اس طرح جان دیدے کہ تیری زبان خدا کے ذکر سے تر ہو اور تو اس ذکر کو کرتا جائے اور جان دیدے۔ جب ہر وقت زبان ذکرِ حق میں چلتی رہے تو وہ دوسرے ذکروں سے روک دیتی ہے۔

ذکرِ قلبی ایک ذکر وہ ہے جس کو ذکرِ قلبی (دل کا ذکر) کہتے ہیں یہ ذکر دل کو صاف کرتا ہے جس کو تصفیہ کہتے ہیں یعنی سارے رَدّی خیالات خطروں وسوسوں سے جو دل میں آتے رہتے ہیں ان سب کا دل سے نکال دینا۔ باہر پھینک دینا' ان کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں رہنا تاکہ وہ وہاں تحقق واثبات پائے۔ ذکر۔ خدا کی نعمت ہے۔ جس سے دل ہمیشہ پاک صاف

رہتا ہے۔ دوسرا راز یہ ہے کہ جب دل مصفا ہو جاتا، تصفیہ پا جاتا ہے تو سِر یعنی باطن بھی صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔ دل سے ساری سیاہیاں دور ہو جاتی ہیں۔ کوئی بات اس میں ایسی نہیں آتی جو صفا کے خلاف ہو۔ البتہ خطرے آتے رہتے ہیں بات اس قدر ہے کہ ان کو ذکر ہی سے مغلوب اور دل کو ذکر سے معمور کرلینا چاہئے۔ جب دل ذکر سے بھرپور ہو جاتا ہے تو یہ سب پلٹ جانے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ کاتب حروف (مصنفِ فارسی) کہتا ہے کہ ذکرِ سِر، اثر و نتیجہ ہے ذکر قلب کا۔ یعنی جیسے ہی دل صاف ہو گیا، تصفیہ پا گیا سِر کی صفائی حاصل ہو جاتی ہے۔ سِر ایک لطیفہ ہے جو قلب سے بلند تر ہے درویش ہمیشہ ذکر ہی سے حضور اور فیض کا اثبات کرتے ہیں۔ حقیقتاً "سِر" خدا کی یاد میں دل کا اتصال پاتا ہے۔ وہ ذکر جو دل کا حکم رکھتا ہے وہ ایک حال پر نہیں ہوتا چنانچہ کہتے ہیں ؎

حافظ دوام وصل میسر نمی شود شاہان کم التفات بحالِ گدا کنند

(حافظ ہمیشہ کا وصل ہاتھ نہیں آتا۔ بادشاہ بہت کم فقیروں کے حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں)

ذکرِ روح ایک ذکر وہ ہے جس کو ذکرِ روح کہتے ہیں یہ وہ ذکر ہے کہ ذکر کرنے والا اپنی صفت سے خدا کی رویت کی وجہ سے فانی ہو جاتا ہے۔ نہ وہ رہتا ہے نہ ذکر نہ حال نہ صفت۔ ذاکر ذکر کے مشاہدہ میں ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو نگاہ میں رکھتا اور اس کی نگہداشت کرتا ہے ذکر کی رویت سے بھی جو اس کے علم کی وجہ اس کو ہوتا تھا فانی کر دیتا ہے چونکہ حق تعالیٰ کا ذکر اس کے ذکر سے بڑا ہوا اور بزرگ تر ہے اس لئے وہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ وہی کہتا ہے وہی پاتا ہے جو حادث ہو۔ علت وسبب

ہیں ہو، وہ ایسے کے مقابلہ میں جو قدیم لا یزال ہو کیسے اور کیونکر ٹھہر سکتا ہے۔

فکر — فکر کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر فرد کے لحاظ سے مختلف و متفاوت ہوتی ہے۔ ایک ایسا فکر کرنے والا ہوتا ہے کہ وہ اس میں تفکر کرتا ہے جو گزر گیا۔ یعنی جو کچھ مخالف باتیں گناہ، کوتاہیاں اس سے ہوئیں اور جو کچھ کمی ادائے حقوق اور وقتیہ کاموں میں ہوئی اس کی تلافی کیسے ہو۔ ایک ایسا بھی ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کی نعمتوں۔ اس کی مہربانیوں، احسانوں کو پے در پے سوچتا اور اس میں اپنی فکر کو لگائے رکھتا ہے اس کے شکر نعمت میں اپنی کوتاہی اپنا قصور پاتا ہے۔ حادث کا شکر ناقص ہی ہوتا ہے اس کے فضل و احسان کا شکر اس سے کیا ادا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قدیم ہے اس کا فضل قدیم ہے۔ ادائی شکر حادث سے ممکن ہی نہیں۔ ایک وہ ہوتا ہے جو ازل میں جو کچھ گزرا اس میں فکر کرتا ہے۔ ایک وہ ہے جو کام کا نتیجہ سوچتا ہے اس کی فکر میں رہتا ہے کہ عاقبت میں کیا ہوگا۔ ایک اللہ کی صنعتوں میں فکر کرکے حیران رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ ایک وہ ہوتا ہے جو خدا کی رضامندی و ناراضی کو سوچتا ہے۔ اسی سے معرفت کی قسمیں، نعمتوں کے شکر، وعدہ سے رغبت، وعید سے بھاگنا اور ایسے ہی اور اسی طرح کے اور فکر بے انتہا ہیں۔ اور اکثر ایسے ہیں جو نفس کے احوال کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ نیند ہوشیاری کی غفلت آگاہی ہوتی ہے۔ فکر کرنے والا اپنے حال اور وقت سے نکل نہیں سکتا۔ اکثر اپنے نفس کا ہم جلیس ہم نشین اس کے احوال اور اوقات کی فکر کرتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف ذکر کرنے والا ہم نشین و جلیس حق اور مطالعہ و مشاہدہ میں ڈوبا ہوا رہتا ہے نفس اور اس کے احوال پر اس کی نظر

ہی نہیں پڑتی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انا جلیس من ذکرنی (میں ہم نشین ہوں اس کا جو میرا ذکر کرے) ذکر اپنے آپ کو اپنے نفس کو بھلا دینا ہے کیونکہ اس کو یاد کرنے والا جو کچھ مشاہدہ کرتا ذکر حق سے جو کچھ اس کو میسر ہوتا ہے وہ یہ کہ ذاکر اپنے تمام اوصاف سے فانی اور اپنے آپ کو ذکر حق میں مستغرق کر دینے سے عین فنا میں آکر خدا ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے حقیقی ذکر اور ذکر کی حقیقت یہی ہے ۔ لیکن فکر میں بندہ کا رجوع اپنے اوصاف اپنے وقت کے مشاہدہ میں سے ہوتا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا کی نعمتوں اسکی صفتوں میں فکر کرو ۔ خدا کی ذات میں فکر نہ کرو ۔ اس لئے آپ نے ذات میں تفکر کا راستہ بند کر دیا ۔ اور ذکر کے لئے اسکی ذات کا راستہ کھول کر اذکر اللہ ذکرا کثیرا (ذکر کرو اللہ کا بے انتہا) فرمایا گیا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ درحقیقت ذکر ذات حق کیطرف راجع (اسکی طرف لوٹنے کی وجہ) ہے یہ معرفت و محبت کا نتیجہ ہے ۔ اس کے ذکر کا راستہ وہی چلتا ہے جو اسکی محبت و معرفت میں ڈوبا ہوا ہو ۔ ظاہر ہے کہ ذکر و فکر میں اور ان کے احوال میں بے انتہا فرق ہے جب فکر کمال کو پہنچ جاتا پورا ہو جاتا ہے تو حق سے رجوع کرا دیتا اسکی طرف لوٹا دیتا ہے ۔ برخلاف اسکے فکر وارد ہو جاتی ہے تو نفس کیطرف رجوع کرا دیتی اور اسکی طرف لوٹا دیتی ہے

ذکر خفی

ذکر خفی ہاتھ آجائے تو یہ انتہائی بلند مکمل مرتبہ ہے کہ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا (جب ندا کی اس کے رب نے خفی سے) فرمایا گیا جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا افضل الذکر خفی (فضیلت والا ذکر چپکے چپکے ذکر کرنا ہے) جہاں دل کا بھی گزر نہیں یہ بہت بڑا مرتبہ ہے ۔ جب تک مذکور کی معرفت نہ ہاتھ آئے ۔ حقیقی ذکر نہیں ہو سکتا اس سے یہ ثابت ہوا کہ معرفت ہو تو ذکر جیسا کہ ہونا چاہیئے ہو سکتا ہے جو جتنا عارف ہو گا اس کا ذکر اسی قدر حقیقی ۔ جان پہچان کے ساتھ ۔ حقیقت کو لئے

ہوئے۔ ساری آلائشوں سے پاک وصاف ہوگا۔ یہ وہ مرتبہ ہے کہ جہاں ذاکر
(یعنی ذکر کرنے والا) رہتا ہے نہ مذکور (ذکر کیا گیا) صرف ذکر ہی ذکر رہ جاتا ہے
ذاکر مذکور کو عین کر دیا جاتا ہے۔ ذاکر ذکر مذکور کا غیر نہیں عین ہی عین ہے۔
معرفت کے بغیر جو ذکر کیا جاتا ہے وہ پوست کے جیسا ہے، غفلت کے
ساتھ جو ذکر کیا جائے وہ موجب لعنت ہو جاتا ہے۔ ذکر کرنے والا ہمیشہ اپنے
نفس اور وقت کے مطالبہ میں رہا کرتا ہے اپنے حال کی کمی وزیادتی کو سوچا
کرتا ہے۔ اپنے نفس سے حساب لینے میں رہتا ہے مقام توبہ اپنی تقصیرات
اس کی نعمت کی شکر گزاری میں ہونے سے اس پر نعمتیں ٹوٹ پڑتی ہیں اس
لئے وہ انعام اور رحمت ہی میں رہ جاتا ہے۔ ذکر کرنے والے پر حق کی معرفت
ومحبت غلبہ کرکے اس کو فانی کر دیتی ہے اس کے لئے اپنے نفس یا اپنے احوال
کی طرف رجوع ہونے کا موقعہ نہیں رہتا۔ رفتہ رفتہ حق تعالیٰ معرفت مذکور
میں اس کو فانی کر دیتا ہے تو اس پر ہیبت وجلال طاری ہو جانے سے وہ
ایسے حال میں پہنچ جاتا ہے کہ اگر وہ زبان ہلانا چاہے تو ہلا نہیں سکتا۔ یہ کہتے
ہیں کہ ہمیں تعجب ہوتا ہے۔ ذکرِ خدا کرتا ہے اور منہ ہاتھ نہیں دھوتا یعنی ہزاروں
بار توبہ کرکے منہ کو صاف نہیں کرتا کہ وہ اس کو قبولیت میں لے آئے۔ ذکر ایک
ایسا نور ہے جو دل سے ظلمت وغفلت کو دور کرکے یقین کو لے
آتا ہے روح کا ذکر نور ہے۔ وقت کی صفائی کا سبب ہے۔ جب وقت
صفا پا جاتا ہے تو وہ روح سے غیب کا مشاہدہ کرکے سر کی صفا پا کر حضرت
میں آجاتا ہے تو خیر یا طلب خیر کا محل باقی نہیں رہتا۔ لِذِكْرُ اللهِ أَكْبَر
(اللہ بزرگ برتر کے ذکر کے لئے) وہ بزرگ تر اس سے ہے کہ چھوڑے
کوئی چیز" اس کی اس میں" یعنے" بندہ کی کوئی چیز بندہ میں نہیں رہتی۔ بذہب

ذکر میں متحقق ہو جاتا (اثبات پا جاتا) ہے تو اس سے سوال و حاجت
کی صفت اٹھ جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے
"من شغله ذکری عن مسئلتی اعطیته افضل ما
اعطی السائلین - اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یہ اور ہی مرتبہ ہے
جس میں ذکر سے بھی مستغنی (لاپروا) ہو جاتا ہے حق کا مشاہدہ اس کے لئے
ذکر ہو جاتا ہے۔ ذکر و فکر دونوں بھی نہایت بہتر شریف و جلیل حال ہیں
ذکر اعلیٰ و اصفیٰ ہے۔ کاتب الحروف (صاحب مکتوب) کہتا ہے کہ شیخ
ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا خلاصہ و نچوڑ جو کچھ سمجھ میں آتا ہے
وہ یہ کہ فکر، سلوک کا پیش خیمہ توبہ و انابت کے حاصل کرنے کا ذریعہ۔
نفس و قلب کے اصلاح کا سبب ہے۔ فکر ہی ہے جو باہمت، قابل آمادہ
بنا دیتی ہے۔ سالک کی حقیقت اس کے باطن کو ذکر الٰہی کے نور سے روشن
اور تحقیق سے متحقق کرا دیتی ہے۔ قول حق جل علیٰ سبحانہٗ۔ اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا
اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا کا اشارہ اسی طرف ہے۔ حال کا حاصل ہے۔ حق جل علیٰ
سبحانہٗ وتعالیٰ کے قول اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ میں اور
ہی حال کی طرف اشارہ ہے۔ نتیجہ یہ کہ سالک سلوک حق میں فکر و ذکر کے
بغیر نہیں رہتا، ذکر صفاء نورانیت کا سبب اور فکر معرفت کی وجہ ہے۔
معرفت ہو تو محبت پیدا ہوتی ہے محبت ذکر (یاد) کا سبب بن جاتی ہے
اس طرح سلوک طے ہوتا رہتا ہے جس میں ذکر و فکر کے سوا چارہ نہیں یہ لازم
و ملزوم ہیں جس کا اس بیت میں اشارہ ہے ؎

ایں قدر گفتیم باقی ۔ فہم کن فکر گر جامد بود رو ذکر کن
(اتنا ہم کہہ گئے باقی سمجھ جا۔ فکر اگر گھٹنے ٹیک دے تو ذکر کر لیا کر)

ذکر بے فکر اور فکر بے ذکر نہیں۔ ذکر میں فکر اور فکر میں ذکر ہوتا ہے یہ ہم مانتے ہیں کہ شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی گفتگو ذکر میں ہے جو سلوک کا انتہائی مقام اور اس کا آخری مرتبہ ہے جس میں فنا فی اللہ نصیب اور ماسوا اللہ سے فراموشی حاصل ہو جاتی ہے۔ ذکر کے ہر مرتبہ میں اللہ ہی کا ذکر اسی کی فکر ہے۔ فکر میں ذکر موجود ہے اور ذکر میں فکر موجود ہے۔ توبہ، انابت، محاسبہ، رغبت، ہمت، نعمتوں کی شکر گذاری اپنی کوتاہیوں کے دیکھنے نتائج، ثمرات، محال اور واردات میں سب میں ذکر موجود ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے سب سے بزرگ سب سے بہترین ذکر حق تعالیٰ کا ذکر ہے۔ امر و نہی ابتدا، انتہا جو بھی خدا اور خدا کی نزدیکی کی نیت سے کریں وہ ذکر ہے کیونکہ ذکر کے معنی خدا کو یاد کرنے کے ہیں۔ اس کی یاد جس میں ہو یا جس میں وہ یاد آجائے وہ ذکر ہی ہے۔

ذکر کی تعریف

شیخ علی متقی رحمتہ اللہ علیہ کتاب "حکم کبیر" سے جو شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری کی تصنیف ہے۔ اپنی مصنفہ کتاب مفتاح الفلاح میں لکھتے ہیں کہ حضور دوام کے ساتھ غفلت و نسیان سے چھٹکارا پاکر دل کو حق کے ساتھ اس کے کسی نام کی رٹ لگا کر زبان اور دل کو یکساں کر کے اس کی یاد میں رہنے کو ذکر کہتے ہیں اس طرح سے اللہ کے ذکر میں کہ اس کو اس کی صفت میں سے کسی صفت کے ساتھ یا اس کے کسی حکم کو اس کے احکام میں سے، یا کوئی کام اس کے کاموں میں سے یا کسی فعل کو اس کے افعال میں سے اسی کی طلب دلیل اسی سے دعائیں کرتے ہیں، انبیا علیہم السلام کا یا خاص حضرات کا، اولیاء اللہ کا ذکر یا ان کا جنھوں نے ان سے نسبت قائم کی اس کی نزدیکی ڈھونڈھا، کوئی وجہ وجودکی، کوئی سبب اسباب سے کوئی فعل افعال میں سے، قرأت، ذکر، شعر، راگ، ذکر شغل، حالات، کیفیتیں، حلقہ،

ان سب صورتوں میں ذکر ہی ہوتا ہے یہ سب ذکر ہی تو ہیں۔ اس کی یاد ہی تو ہے البتہ وقتیہ یاد ہے۔ قرآن و حدیث کا درس دینا، فتویٰ دینا، ذکر ہے۔ فکر کرنے والا عظمت و جلال عزوجل میں اس کے جبروت میں اس کے آیات میں اس کی آسمان و زمین میں فکر کرتا ہے یہ سب اسی کا ذکر ہے اسی میں وہ رہتا ہے یہ بھی ذکر ہے۔ اس کا امر اس کی نہی کا بجا لانے والا، نفس کو خواہشات سے روکنے والا، احکام خدا و رسول پر چلانے والا، سیدھی راہ پر چلنے والا ذکر کرنے والا اس کے ہی ذکر میں ہے۔ ذکر کبھی زبان سے کبھی دل سے، کبھی اعضا سے کبھی کھلا، کبھی چھپا کیا جاتا ہے۔ کامل ذکر ان سب مراتب کا جامع ہوتا ہے۔

عارفوں نے کہا ہے کہ ذکر ذات سات قسم کا ہے۔ ہاتھ، پاؤں، آنکھ کان، دل، روح، زبان کا۔ ہاتھ کا ذکر کسی ضعیف کی مدد کرنا۔ پاؤں کا ذکر علما و اقربا کے دیکھنے کے لیے جانا۔ آنکھوں کا ذکر ہمیشہ روتے رہنا۔ کان کا ذکر کلامِ حق و علماءِ حق کی باتیں سننا۔ دل کا ذکر فنا ہونے والی دنیا سے بےتعلق ہونا اور ہمیشہ رہنے والی آخرت کی طرف متوجہ ہو جانا۔ حق کے سوائے سب کو دل سے دور کر دینا روح کا ذکر حق تعالیٰ سے ملنے اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہونا۔ زبان کا ذکر قرآن شریف پڑھنا، اللہ کے ان ناموں کا ورد کرنا وہ دعائیں پڑھنا ہے جو حدیث میں آئی ہیں۔ (اکانواں مکتوب)

مکتوب (۴۰)

سلامتی کی دعا

اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ

عاقبت بخیر ہو۔ ہرچند میں چاہتا ہوں کہ کچھ اس فرزند دلبند کو لکھوں۔ حیران ہوجاتا ہوں کہ کیا لکھوں۔ دونوں جہاں کی بہتری کے سوائے اور کیا دعا ہوسکتی ہے۔ دونوں جہاں میں تمہیں بہتری نصیب ہو جائے۔ فقیر کے احوال وہی ہیں جو تمہیں معلوم ہیں اور مختصر یہ کہ الحمد للہ علیٰ کل حال۔ نعوذ باللہ من حال اهل النار (اللہ کا شکر ہرحال میں۔ پناہ مانگتا ہوں اللہ سے، دوزخیوں کے حال سے) لوگوں کے احوال میں جو تغیرات تبدلات ہوئے ہیں وہ آپ کو معلوم ہیں۔ یہ آرزو تھی کہ کتنے دن تھانیسر میں رہے اگر چند روز ہی دہلی میں رہ جاتے تو کیا اچھا ہوتا۔ تمہاری خیریت مطلوب ہے جہاں بھی رہیں اچھے رہیں میاں نورالحق کے پاس سے بھی خطوط آتے ہیں جو شکر و شکایت سے ملے ہوئے ہوتے ہیں

زاں یار دل نوازم شکریست با شکایت

(اس یار دلنواز کا شکر بھی کرتے ہیں اور شکایت بھی)

حق کا شکر اپنے نفس کی شکایت اے ہمارے پروردگار سب تعریف تیرے ہی لئے۔ ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں شکایت بھی تجھ سے، فریاد بھی تجھی سے تیرے پاس کرتے ہیں کہ تو فریاد رس (فریاد کو پہنچنے والا ہے)۔ اے فرزند جو کچھ ہمیں تم سے توقع ہے وہ یہ کہ ایمان کی بقا اس کی سلامتی حسن عاقبت سے بالنصیب رہیں۔

کتابت حصہ اول: احمد ولی الدین کاتب